188822

UNIVERSAL LIBRARY
OU_188822
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩١٤ Accession No. ١٠١٣٠ / 10130

Author مرزا حسن احمد بیگ

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

ڈیڈیکیشن

میں اس کتاب کو اپنی
والدہ محترمہ کے نام سے
معنون کرتا ہوں۔

مرزا حسین احمد بیگ

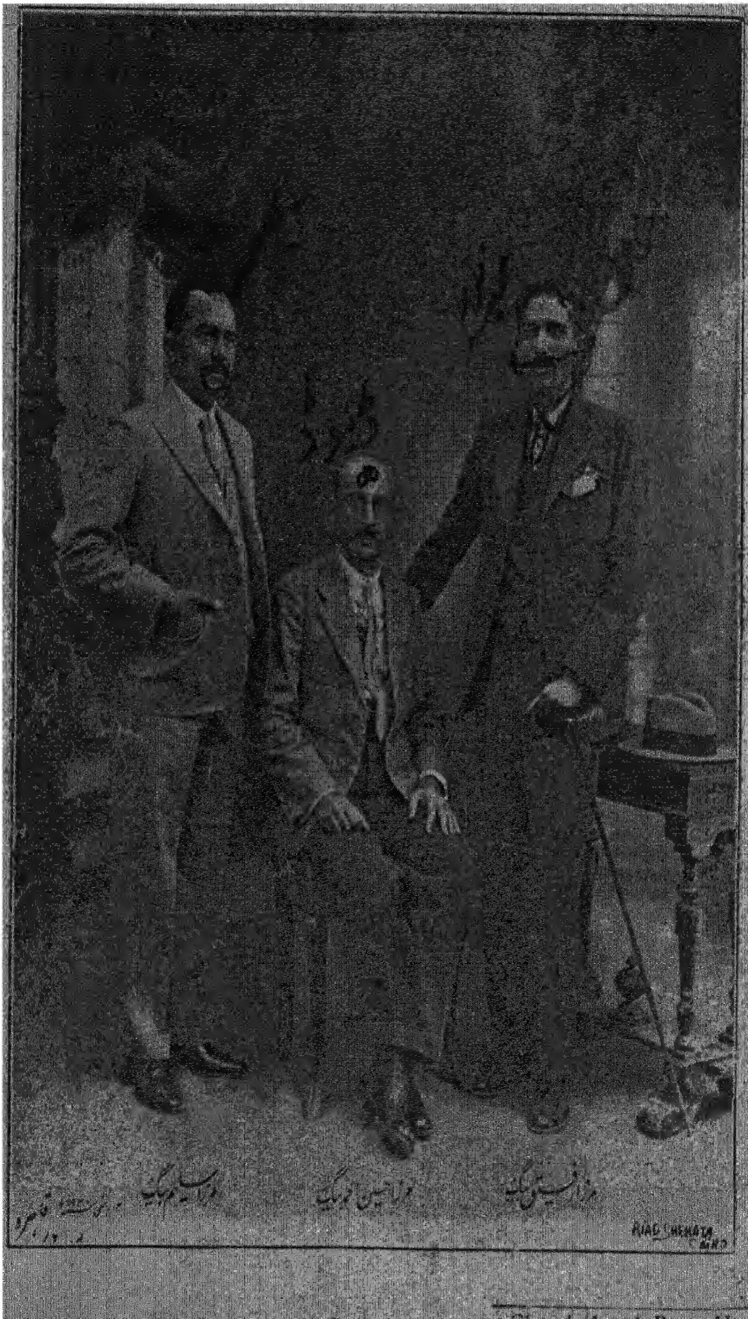

Chandrakanth Press Hyd.

۴۰۳۶

معذرت

معزز ناظرین کی خدمت میں نہایت ادب اور افسوس کے ساتھ یہ گزارش کی جاتی ہے کہ باوجود کوشش کے بعض غلطیاں کتابت کی رہ گئی ہیں۔ دو ایک مقامات پر کچھ عبارت بے ربط ہوگئی ہے۔ مثلاً صفحہ (۱۰) پر آخری دو سطروں کا مضمون پورا طبع نہیں ہوا۔ ناظرین با تمکین براہِ کرم اس قسم کی فروگذاشت کو نظر انداز فرمائیں۔ ہمارے ملک میں جب تک لیتھو کا رواج باقی ہے یہ مصیبت بھی کم و بیش باقی رہیگی

میں اپنے برادر عزیز و رفیق سفر مولوی مرزا رفیق بیگ صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے کاپیوں کے دیکھنے کی دردسری اپنے ذمہ لی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ باوجود عدیم الفرصتی کے اس کتاب کی طباعت کا پورا کام باحسن وجوہ انجام دیا۔ لیکن اس قسم کی مجبوری کا کیا علاج ہے کہ جن کاتب صاحب نے پہلے کام شروع کیا تھا انھوں نے تقریباً نصف کتاب لکھنے کے بعد کتابت یک قلم چھوڑ دی۔ بالآخر کاتب کو بدلنا پڑا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دو طرح کے خط ہوگئے۔ مالک مطبع مولوی ریاست علی صاحب کا بھی میں مشکور ہوں کہ صاحب موصوف نے حتی الامکان اس کو جلد طبع کرانے میں کوشش کی فقط

مرزا حسین احمد بیگ

ورنگل - حیدرآباد دکن
مورخہ ۲۰ - نومبر ۱۹۳۱ء

پردیس کی باتیں

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱	عرض حال	.	دلچسپی کا سامان ۔
۳	دیباچہ	۲۶	تندرستی
۷	تمہید	.	لطیفہ
۸	حیدرآباد تا مدراس	۲۷	جہاز اور انسان کی حقیقت
۹	مدراس تا دھنسکوڑی	۲۹	سوئیز
۱۰	دھنسکوڑی تا تالائینار	۳۱	غیر متعلق اشخاص کی مداخلت
۱۱	تالائینار تا کولمبو	۳۲	سوئیز تا قاہرہ
۱۲	کولمبو	.	قاہرہ
۱۵	ایک دلچسپ واقعہ	۳۳	اہرام مصری
۱۶	لطیفہ	۳۵	تھیٹر میں ہنگامہ
۱۹	جہاز کا سفر ۔	۳۶	ایک پریشانی
۲۰	جہاز پر کھانا ۔	.	قاہرہ کی تاریخ
۲۳	جہاز کے مسافر	۳۷	قاہرہ کے بازار
۲۵	مرد عورت کا ایک حوض میں نہانا ۔	۳۸	لباس وغیرہ ۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۹	بے روزگار لوگ	۵۶	جبل الزیتون
۴۰	آثار قدیمہ	.	عیسائیوں کا مشہور گرجا
۴۱	مصری عجائب خانہ	۵۷	دیوار گریہ
۴۲	کتب خانہ	۵۸	الخلیل
.	ہم وطن لوگ	۵۹	بیت اللحم
۴۳	مصری پاشا	۶۰	قدس کی آبادی
.	قاہرہ کا ایک مسلمان فوٹوگرافر	۶۱	بحر لوط۔
۴۴	شراب خانے۔	.	قومی عناد
۴۴	فاحشہ عورتوں کا بازار	۶۲	زاویۃ الہنود
۴۶	قاہرہ سے بیت المقدس کو روانگی	۶۲	بیت المقدس سے دمشق کو روانگی
۴۶	لد	۶۳	موٹر کی تیز رفتاری
۴۷	بیت المقدس کے ترجمان	۶۴	الناصرہ
۴۸	قدس کا ہوٹل۔	〃	ایک ناگوار واقعہ
۴۹	قدس کے تاریخی حالات	۶۵	بحر الطبریہ
۵۰	حرم شریف	〃	دمشق
۵۱	قبۃ الصخرا	〃	تاریخی حالات
۵۳	مسجد اقصیٰ	۶۷	عام حالات
۵۵	حمام الشفاء	〃	جامع الاموی

صفحہ	مضمون
۶۹	سلطان صلاح الدین کا گنبد
۶۹	مدرسہ ملک الظاہر بے بارس
۷۰	مزارات -
۷۱	بازارات
//	کوہ لبنان
۷۲	بیروت
۷۳	بیروت کا ترجمان
۷۴	بیروت تا استنبول
۷۶	ایک دلچسپ قصہ
۷۸	طرابلس الشرق -
۷۹	درہ دانیال
//	استنبول کا موقع
۸۰	شاخ زرین
//	پاسپورٹ کا جھگڑا
۸۲	ہوٹل -
//	پاسپورٹ کا واپس ملنا
۸۳	استنبول
۸۴	استنبول کی مساجد -
۸۵	باسفورس
۸۶	بیوک درہ
//	عزالدین پاشا
۸۷	پرنکی پو
۸۸	ایک ناگوار واقعہ
//	عام حالات
۸۹	بے نقاب عورتیں
۹۰	استنبول سے روانگی -
۹۲	بلگیریا
//	کروڑگیری والوں کی سختی
۹۳	ایک نقصان
//	صوفیا اور اس کے باشندے
۹۴	لباس
۹۵	ایک ترک مسافر
۹۶	بلگریڈ کا اسٹیشن
۹۶	ایک پریشانی
۹۹	ریل کا خادم
۱۰۰	بلگریڈ

صفحہ	مضمون
۱۰۱	لباس
	بداپسٹ کا ہوٹل
۱۰۲	بداپسٹ
۱۰۳	آثار قدیمہ
۱۰۴	گندھک کے چشمے
۱۰۵	جپسی قوم کے لوگ
۱۰۶	عام اخلاق اور لباس
۱۰۷	**ویانا میں ہوٹل کا جھگڑا**
۱۰۸	ایک میلہ
۱۰۹	ہوٹل -
۱۱۰	عام حالات
۱۱۲	ویانا تا برلن -
۱۱۳	یورپ میں عورت ہمیشہ جوان رہتی ہے
۱۱۴	بیر کا رواج
"	برلن میں ورود
"	ایک تکلیف دہ رواج
۱۱۶	ہوٹل
"	برلن میں ہندوستانی
۱۱۷	برلن
"	افلاس
۱۱۹	برلن کے بازار
"	ایک خاص انتظام
۱۲۰	اٹو بیغے
"	رسٹوراں
۱۲۱	ہوٹل کی کیفیت
۱۲۲	عجائب خانے
۱۲۳	تھیٹر
۱۲۴	سینما
"	ناچ گھر
۱۲۸	لونا پارک
"	مس برلن کا انتخاب
۱۳۰	ٹیر گارٹن
"	کھیل کود اور تفریح کے مقامات
"	ننگوں کا کلب
۱۳۴	پوسدام
۱۳۵	ضروری ادویات

صفحہ	مضمون
۱۳۶	راستہ بھولنا
۱۳۷	ایک عورت کی امداد
۱۳۹	برلن کے بازار میں گاندھی کی جے۔
،،	ہوائی جہاز
۱۴۰	آب و ہوا
۱۴۱	زمین دوز ریل
،،	دوکانیں
۱۴۲	پبلک ٹیلیفون
،،	جرمنی کے لوگ
،،	برلن سے لندن کو روانگی۔
۱۴۴	یورپ کی ریل
۱۴۶	اسٹیمر کا سفر
۱۴۷	کانٹینینٹل ایکسپریس
۱۴۸	فارسٹ ہل کا مکان
۱۵۰	<u>لندن</u>
۱۵۱	لندن کے پل
،،	ٹاور برج۔
۱۵۲	لندن برج۔
۱۵۲	بلیک فرائرس برج۔
۱۵۳	ویسٹ منسٹر برج
،،	سٹی آف لندن
۱۵۴	شہر کا انتظام
۱۵۵	ہجوم کی سیر
،،	انگلستان کا بینک
۱۵۶	رائل ایکسچینج
،،	گلڈ ہال
،،	لندن کا بڑا گرجا
۱۵۷	عدالت فوجداری
،،	لندن بزرگ
۱۵۸	گوشہ مغربی
،،	وکٹوریہ امبینکمنٹ
۱۵۹	ایوان پارلیمنٹ
،،	بگ بن
،،	وکٹوریہ ٹاور
۱۶۰	ویسٹ منسٹر ابی
۱۶۱	بکنگھم پیلس

صفحہ	مضمون
۱۶۱	وکٹوریہ میموریل
دو	سینوٹاف
۱۶۲	ٹریفلگر اسکوئر
دو	نیشنل گیلری
دو	شاہ چارلس اول کا مجسمہ
۱۶۴	پکاڈلی سرکس
۱۶۵	کک کمپنی کا صدر دفتر
۱۶۶	ماربل آرچ
دو	ریجنٹ اسٹریٹ
۱۶۷	چیرنگ کراس
۱۶۹	گوشہ مشرقی
۱۶۹	برٹش میوزیم
۱۷۰	ہمپٹن کورٹ
دو	کرسٹل پلیس
۱۷۱	ونڈسر کیسل
دو	مادام توساڈ کی نمائش
۱۷۲	ٹیٹ گیلری
دو	ولیس کلکشن ۔

صفحہ	مضمون
دو	لندن میوزیم
دو	ٹاور آف لندن
۱۷۴ تا ۱۷۹	لندن کے باغات اور تفریح گاہ
۱۷۹	تھیٹر اور سینما
۱۸۱	کھانے پینے کی دوکانیں
۱۸۲	شرابی دوستوں سے ملاقات
۱۸۳	ہندوستانی رسٹوراں
۱۸۵	انگریزی کھانا
۱۸۷	پبلک کی سہولت کا خیال
دو	سگریٹ کی مشین
۱۸۸	ٹیلیفون
۱۹۰	پبلک بیت الخلاء
دو	گم شدہ مال کی بازیافت
۱۹۱	ذرائع آمد و رفت
دو	زمین دوز ریل
۱۹۲	معمولی ریل ۔
دو	موٹر بس
۱۹۴	ٹیکسی ۔

صفحہ	مضمون
۱۹۵	ٹریفک کا انتظام
۱۹۶	اسٹیشنوں پر ہجوم
"	ریلوں کی سہولت
۱۹۶	لندن کی دوکانیں
۱۹۹	خاص قسم کے بازار
"	شارابینگ
۲۰۰	موٹر چلانے کا لائسنس
"	خود چلانے کے واسطے کرایہ کی موٹر
۲۰۱	ایک بے لطف سیر
۲۰۳	ایک ناخواندہ مہمان
۲۰۴	موٹر والے کا ناجایز مطالبہ
"	**ساحلی مقامات**
۲۰۵	برائٹن
۲۰۶	ایسٹ بو ن وغیرہ
"	آئل آف وائٹ
۲۰۷	رائڈ
۲۰۸	شینکلن
"	ایک انگریز خاتون سے تبادلہ خیالات

صفحہ	مضمون
۲۰۹	غلط اسٹیمر پر سوار ہونا ۔
"	موسمی کیفیت
۲۱۲	صفائی اور حفظان صحت
"	تفریح کا شوق
۲۱۴	آب و ہوا کا اثر
"	انگریزوں کی خصوصیات
"	فرائض منصبی کا احساس
۲۱۶	مقررہ قیمت
"	وعدہ کی پابندی
۲۱۷	مسلمانوں کے لئے مقام عبرت
"	یوربین اقوام کے دو بڑے عیب
۲۱۹	ہماری موجودہ حالت
۲۲۰	مسٹر نارمن ڈگلس کے خیالات
۲۲۲	بے روزگاری
"	سرد مہری
۲۲۳	بھیک مانگنے والوں کا طریقہ
۲۲۴	بھکاری
۲۲۵	وسعت اخلاق

صفحہ	مضمون
۲۲۸	لندن کی پولیس
۲۲۹	ہندوستان کے حالات سے بےخبری
"	ایک لطیفہ
۲۳۱	بین الاقوامی شادیاں
۲۳۳	کالے گورے کا تعصب
۲۳۴	شادی کے متعلق خیالات
۲۳۷	ایک دلچسپ مقدمہ
"	مزدوری
۲۳۸	مکانات
۲۳۹	آزادی کا دعوے
۲۴۱	لندن سے روانگی
۲۴۳	ایک نقصان اور سرگردانی
۲۴۵	پیرس کا ہوٹل
۲۴۷	لندن کو واپسی
"	پیرس
۲۴۹	پیرس میں غلاظت
"	پیرس کے بازار
۲۵۰	فرانسیسیوں کے خصائل وعادات
۲۵۱	فرانسیسیوں کی غذا
۲۵۲	ایک لطیفہ
۲۵۴	ایک دلچسپ اشتہار
۲۵۵	پیرس کی سیر رات کے وقت
۲۶۰	خانگی رہبر کے ذریعہ
۲۶۱	لیڈو
۲۶۲	تھیٹر
۲۶۵	زبان کی مشکلات
۲۶۹	پیرس کی سواریاں
۲۷۱	پیرس سے دوویل کا سفر
۲۷۹	پیرس کی عمارتیں
۲۸۳	پیرس تا برن
۲۸۵	سوئیٹزرلینڈ
۲۸۷	برن
۲۸۸	لوزان
۲۸۹	میلان
۲۹۱	بلونیا
۲۹۲	وینس
۲۹۸	وطن کی واپسی
۲۹۹	گورے اور کالے کا فرق
۳۰۴	جہاز پر دلبستگی کا سامان
"	دنیوی اور روحانی سفر کا فرق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

یورپ کے سفر سے واپس آنیکے بعد اکثر کرم فرما احباب کا یہ تقاضا شدت کیساتھ ہوا کہ حالات سفر قلمبند کرو مجھکو اس کام کیلئے نہ تو فرصت اور نہ ہمت۔ کچھ دنوں تک عذر وحیلہ کر کے جان بچاتا رہا۔ بعض احباب نے یہ اصرار کیا کہ کتاب نہیں لکھتے تو کم از کم کسی مجمع میں حالات سفر بیان کرو۔ چنانچہ نارمل اسکول وانٹرمیڈیٹ کالج ورنگل میں کچھ لکچر ہوئے جنکے سلسلہ میں روزنامچہ کے پریشان اوراق کو ترتیب دینے کی ضرورت ہوئی۔ سفرنامہ کیلئے احباب کا تقاضا برابر جاری رہا۔ بالخصوص میرے واجب التعظیم عنایت فرما نواب ناظر یار جنگ بہادر (رکن عدالت العالیہ حیدرآباد دکن) نے کئی دفعہ تاکید فرمائی کہ ضرور لکھو اور جلدی لکھو۔ میں نے پاس ادب سے وعدہ کرلیا۔ اگرچہ اس سفر میں ڈائری روزانہ لکھا کرتا تھا لیکن اسوقت سفرنامہ کا خیال بھی میرے ذہن میں نہ تھا البتہ اعزہ واقربا کی دلچسپی کیلئے ڈائری کی نقل ہفتہ وار مکان بھجوا دیا کرتا تھا خانگی اغراض کی خاطر ڈائری لکھنا اور پبلک میں اسکو کتاب کی شکل میں پیش کرنا یہ دونوں کام ایکدوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ وعدہ کی تکمیل چونکہ لازمی تھی اس لئے اس کام کو شروع کیا۔ فرائض منصبی کو انجام دینے کے بعد جو کچھ وقت بچتا اس کام کے نذر ہوجاتا چنانچہ اچھی یا بُری جیسی کچھ بھی ہے یہ کتاب ناظرین باتمکین کی خدمت میں پیش کیجاتی ہے ع

گر قبول افتد زہے عزوشرف

خدا کے فضل سے اس ملک میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے

یورپ کی سیر کر چکے ہیں بلکہ برسوں قیام بھی رہا ہوگا۔ ان حضرات کی خدمت میں التجا یہ ہے کہ اگر کوئی واقعہ غلط یا مبالغہ کے ساتھ اس کتاب میں بیان ہوا ہے یا کوئی اہم فروگذاشت ہو گئی ہے تو براہ کرم ایسی غلطیوں کو نظرانداز فرمائیں کیونکہ میرا علم اور مشاہدہ بہت محدود ہے۔ حتی الامکان وہی لکھا ہے جو دیکھا تھا۔ البتہ تاریخی واقعات کی تو بات ہی الگ ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب ان اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی جنھوں نے کبھی ہندوستان کے باہر سفر نہیں کیا یا جو اُن ممالک کی سیر کیلئے جانا چاہتے ہوں جنکا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اگر میری یہ امید پوری ہوگئی تو میں اپنے کو خوش قسمت خیال کرونگا اور یہ سمجھونگا کہ اس کتاب کے لکھنے کا منشاء و مقصد بھی پورا ہوگیا۔

مرزا حسین احمد بیگ

باسمہٖ سبحانہٗ

دیباچہ

سفرنامہ کسی کا ہو کبھی بیکار مت سمجھو
اس آئینہ میں فرحت عکس عالم خوب آتا ہے

ہر ایک نقش قدم سیاح کا رہبر ہی منزل کا
ہزاروں گمرہوں کو راہ پر یہی لگاتا ہے

خدا معلوم میرے چھوٹے بھائی میاں حسین احمد بیگ کے دل میں کیا سمائی کہ ایک دفعہ ہی دنیا دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ بہت اچھا کیا۔ روپیہ خرچ ہوا۔ تجربہ حاصل ہوا۔ اپنی اور اپنے ملک والوں کی اصلی شکل آئینہ میں نظر آئی۔ باہر والوں سے نفرت اور اپنوں سے محبت پیدا ہوئی اور دنیا میں کچھ کام کرنے کا شوق تو پیدا ہو گیا واپس آکر اپنا سفرنامہ لکھا یہ بہت ہی اچھا کیا اپنے خیالات کا دوسروں پر اظہار کیا۔ یہاں والوں کو بتایا کہ تم کیا ہو اور باہر والے تم کو کیا سمجھتے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو اور وہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم سو رہے ہو اور دنیا جاگ رہی ہے۔ ہاں ایک بات بہت بری کی کہ سفرنامہ لکھ کر مجھ سے اس کا مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ٹالنے میں استاد ہوں۔ مگر آخر ہیں وہ میرے ہی چھوٹے بھائی۔ وہ اصرار کرنے میں مجھ سے بھی زیادہ نکلے میں کہا اس کتاب کیلئے کسی دیباچہ کی ضرورت نہیں۔ کہنے لگے ہے اور ضرور ہے۔ میں نے کہا جب میں نے یہ ملک نہیں دیکھے تو انکے متعلق لکھونگا کیا خاک۔ جواب ملا۔ اسکی کچھ ضرورت نہیں۔ آخر بھائی اور وہ بھی چھوٹا بھائی۔ کہانتک بیمروتی اور روکھائی کرتا ناچار راضی ہو گیا۔ لکھنے بیٹھا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ پہلے تو یہی نہیں جانتا کہ دیباچہ ہے کیا بلا اور اس کے لکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے دوسرے یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ اس میں لکھا کیا جائے خدا رکھے

اسوقت ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی ہنیں ہے۔ جو کوڑی بھر عقل خرچ کئے بغیر قلمبرداشتہ زنازن دس دس بارہ بارہ صفحے گھسیٹ جاتے ہیں اور وہ کتاب کے شروع میں چھپکر خواہ مخواہ اس کا حجم و قیمت بڑھاتے ہیں۔ اور عرف عام میں دیباچہ یا مقدمہ کہلاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دیباچہ نویس یا "مقدمہ باز" کو نہ اس فن سے مس ہوتا ہے اور نہ اس علم سے بہرہ۔ ایسی صورت میں یہ دیباچہ اسطرح لکھ جاتے ہیں کہ خواہ کسی کتاب میں لگا دیا جائے۔ بلا خوف نکتہ چینی و لومتہ لائم اس سے متعلق ہو جاتا ہے۔ چونکہ نہ میں نے کبھی کوئی مقدمہ لکھا ہے نہ کبھی خدانخواستہ یہ "پیشہ" اختیار کیا ہے اور نہ بدقسمتی سے ان ملکوں کی سیر کی ہے جنکا اس کتاب میں ذکر ہے اسلئے اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا لکھوں سوائے اس کے کہ اِدہر اُدہر کی چند باتیں بنا کر اپنے سر سے اس بار کو اتار پھینکوں اور بھائی سے کہدوں کہ بس اسی کو دیباچہ کہتے ہیں۔ اور مقدمہ یونہی لکھا جاتا ہے۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہر کتاب میں دو چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ ایک مضمون دوسرا طریقہ تحریر مضمون۔ مضمون انہوں نے ایسا لیا ہے کہ اسکے صحیح یا غلط ہونیکو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہاں۔ گلستاں میں شیخ سعدی نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ "جہاندیدہ بسیار گوید دروغ"۔ لیکن اب یہ اصول ذرا مشکل ہی سے کام دیتا ہے۔ پہلے تو سفر ہی کون کرتا تھا اور کرتا بھی تھا تو اِدہر اُدہر تھوڑی دور گیا۔ اور گھر چلا آیا۔ اس لئے دور دراز ملکوں کے حالات بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اگر کوئی بندۂ خدا ذرا دور کا چکر لگا آیا تو وہ جو کچھ کہے اسکی تردید کوئی کہاں سے کرے۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی نے اپنا سفرنامہ لکھ بھی دیا تو زیادہ سے زیادہ اسکی دس بارہ نقلیں ہوکر رہ گئیں اور بس۔ اب کوئی اس کو دیکھے تو کہاں سے دیکھے اس لئے پرانے زمانہ میں جہاندیدہ لوگوں کو جھوٹ بولنے کے بہت موقعے تھے۔ اب رنگ بدل گیا ہے۔ ہر شہر میں ہزاروں نہیں تو بیسیوں آدمی ایسے ہیں جو یورپ تو کیا ساری دنیا کا چکر کاٹ آئے ہیں۔ ذرا کسی نے جھوٹ بولا۔ اور پکڑا گیا۔ ایسی صورت میں

یہ تو کسی طرح توقع نہیں ہو سکتی کہ میاں احمد نے اس سفرنامہ میں مجذوب کی بڑ ہانکی ہوگی اور اس لئے میں اس پہلو پر کچھ اور زیادہ لکھنا بے ضرورت سمجھتا ہوں۔ وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ اگر انہوں نے واقعات میں خیالات سے رنگ بھرا ہے تو وہ آپ ہی کھل جائیگا اور یہ خود اس کے متعلق جوابدہ ہونگے۔ اور اگر واقعات صحیح ہیں اور انہوں نے وہاں کے حالات اور خیالات کا صحیح نقشہ کھینچا ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ اس سے پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچیگا اور ضرور پہنچیگا۔

اب رہا اسلوب بیان اور لطف زبان۔ تو اسکے متعلق میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ دونوں اچھے ہیں اور بہت اچھے ہیں۔ زبان کیوں اچھی نہ ہوگی۔ آخر انہوں نے کیسے لوگوں سے یہ زبان سیکھی ہے۔ انکی ماں دہلی کی۔ انکے باپ دہلی کے اور انکا سارا خاندان دہلی کا۔ ماں اگر خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مرحوم دہلوی مترجم بوستان خیال کی پوتی ہیں تو باپ رشتہ میں اسداللہ خاں غالب مغفور کے پوتے ہیں۔ جو زبان انہوں نے اپنے گھر میں سنی اور سیکھی ہے وہی اس سفرنامہ کی زبان ہے۔ اور یہ وہ زبان ہے جو پہلے دہلی کے شرفاء کی زبان تھی اور اب مٹ رہی ہے۔ اب رہا اسلوب بیان تو وہ آخر کیوں درست نہ ہوگا۔ انکو دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے کام ہے۔ خود مجسٹریٹ ضلع ہیں۔ روزانہ بیسیوں گواہ لیتے ہیں فیصلے لکھتے ہیں۔ وکلاء کی بحث سنتے ہیں۔ جسکو خدا نے ایسے موقع دیئے ہوں اگر وہ بھی طرز تحریر اور طریقہ بیان پر حاوی نہ ہوجائے تو بس سمجھ لو کہ حد ہوگئی انہوں نے شروع شروع میں مجھے اپنے سفرنامے کے دو چار صفحے دکھانے کی کوشش کی اور اصلاح بھی چاہی مگر میں نے صاف انکار کردیا۔ اور انکار کرنے کی وجہ بھی تھی۔ اگر "خدا پنج انگشت یکساں نکرد" ایک امر واقعہ ہے تو میری اس رائے کو بھی ماننا پڑے گا کہ کبھی اور کہیں دو آدمیوں کی تحریر یکساں نہیں ہوتی اور اسلئے ایک شخص دوسرے شخص کی عبارت میں اصلاح بھی نہیں دے سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی مشیخت جتانے کو

ایک آدھ حرف ادھر کا اُدھر کردے یا زبردستی کوئی لفظ کاٹ کر اسکی جگہ دوسرا لفظ بنادے یقین مانئے مجھے بڑا مزہ آیا جب کچھ دنوں بعد میں نے ان سے یہ کہا کہ اس فقرہ کو یوں بدل دو تو اچھا ہے اور انہوں نے کہا کہ یہ میری زبان ہے اسمیں آپ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ ہر لکھنے والے میں یہی اسپرٹ پیدا ہو۔ اور ہر شخص اپنے لکھے کو ناقابل اصلاح سمجھے۔ اس سے لکھنے والوں کی ہمت بڑھے گی۔ اس سے زبان میں روانی آئے گی۔ اور اس سے نکتہ چینوں کی زبان بند ہو گی۔ ورنہ یہ استادی و شاگردی کی مصیبت وہ ہمت شکن ہے کہ ہزاروں اہل قلم کو ڈبو چکی ہے اور لاکھوں ہی کو آئندہ لے مریگی۔

بہر حال یہ سفرنامہ اس نامربوط اور بمعنی دیباچہ یا مقدمہ کے ساتھ آپکے سامنے آتا ہے پڑھئے اور حالات پر غور کیجئے۔ اپنے خیالات کو وسعت دیجئے۔ اپنا مقابلہ باہر والوں سے کرکے خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدر پر عمل کیجئے۔ اور اگر آپ کا روپیہ کھتّوں میں پڑا سڑ نہیں گیا ہے یا سود کے چکروں میں آکر آپ کی املاک قرق نہیں ہو رہی ہے تو آپ بھی گھر سے نکلئے کچھ دنیا دیکھئے اور اگر ممکن ہو تو اپنی اور اپنی قوم کی اصلاح کیجئے۔ نہیں تو جو روپیہ اس سفرنامے کے خریدنے میں صرف کیا ہے اس کا ماتم کیجئے۔ اور کہئے کہ خدا اس سفرنامے کے لکھنے والے اور اس دیباچہ کے تحریر کرنے والے کا بھلا کرے کہ مفت میں ہمارے روپے ستیاناس کر دیئے۔ والسلام

مرزا فرحت اللہ بیگ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پردیس کی باتیں

تمہید

سفر کا اصلی مقصد تبدیل آب و ہوا تھا۔ عرصہ سے صحت ذرا خراب ہو گئی تھی۔ اس فکر میں تھا کہ کوئی ہمسفر ملجائے کیونکہ تنہا اتنے لمبے سفر پر جانا بے لطفی سے خالی نہ ہوتا۔ حسن اتفاق دیکھو کہ میرے قریبی عزیز اور ہم زلف مرزا رفیق بیگ اپنے کام سے یورپ جانیوالے تھے۔ انکے اس ارادے سے مجھکو تقویت ہوئی۔ رفیق بیگ کے دیکھا دیکھی بھائی سلیم بیگ بھی تیار ہو گئے۔ اس سے بہتر صحبت اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہم عمر۔ ہم خیال۔ اور ایکدوسرے کے ہمدرد۔ یہی چیز سفر کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ یکم مئی سنہ ۱۹۳۱ء کو لائڈ ٹرسٹینوں کا ایک جہاز (S.S. GANGE) ایس۔ ایس) گینجے بمبئی سے روانہ ہونے والا تھا۔ ہم نے کک کمپنی کو لکھدیا کہ درجہ دوم میں تین برتھ (BERTH) ہمارے لئے محفوظ کر دیئے جائیں۔ جواب ملا کہ اس جہاز میں جگہ مطلق نہیں ہے لیکن ہم کوشش کرینگے۔ ایسے موقع پر کمپنی والے ایک فہرست امیدواروں کی رکھتے ہیں۔ اس میں ہمارا نام درج کر لیا گیا۔ یہ خط کتابت دسمبر کے مہینے سے شروع ہوئی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد صرف ایک شخص کیلئے جگہ کا انتظام ہو سکا۔ مگر ہم نے انکار کیا۔ کیونکہ تینوں بھائی ایک ہی جہاز میں جانا چاہتے تھے وسط اپریل میں ہم کو قطعی طور پر جواب ملا کہ جہاز میں جگہ نہیں ہے اگر تینوں آدمی ایک جہاز میں جانا چاہتے ہوں تو کولمبو سے جو جہاز جاتے ہیں انمیں جگہ

ملسکتی ہے۔ تیس اپریل کو اورینٹ لائن کا ایک جہاز ایس۔ایس اورینٹس (S. S. ORONTES) روانہ ہونیوالا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تیسرے درجہ میں چھ مسافروں کا جو کمرہ ہوتا ہے اس میں جگہ خالی ہے۔ تیسرے درجہ کا نام سنکر انواع واقسام کی تکالیف کا تصور پیدا ہوا۔ مگر صورت مجبوری کی تھی۔ آخر کار تار کے ذریعہ اس جہاز میں جگہ محفوظ کرائی گئی۔ کیونکہ وقت بہت تنگ تھا اور کچھ دنوں بعد ہی سمندر میں طغیانی کا زمانہ شروع ہوجاتا تھا۔ ہم کو جہاز کے ذریعہ صرف پورٹ سعید تک جانا تھا اس لئے تین ٹکٹ پورٹ سعید کے لئے گئے۔ فی شخص بائیس (۲۲ع) پونڈ کے قریب کرایہ ہوا۔ ایک پونڈ تقریباً پندرہ روپیہ سکہ عثمانیہ کے برابر ہوتا ہے۔ کک کمپنی نے ہم کو اطلاع دی تھی کہ جہاز پر سوار ہونے سے قبل چیچک کا ٹیکہ لگانا ضروری ہے یا اس امر کا صداقتنامہ چاہیئے کہ زمانہ حال ہی میں ٹیکہ لگوایا تھا۔ روانگی سے کچھ دنوں قبل ہم لوگوں نے ٹیکہ لگوالیا۔

حیدرآباد تا مدراس

۲۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو ہم تینوں حیدرآباد کے اسٹیشن ناہپلی پر رات کو نو بجے کے قریب کولمبو روانہ ہوئے۔ ریل کے ٹکٹ بھی کک کمپنی کی معرفت پہلے سے خرید لئے تھے اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس کمپنی نے حیدرآباد اور مدراس کے اسٹیشن ماسٹروں کو تین برتھ محفوظ رکھنے کے واسطے لکھدیا تھا۔ ہم کو کچھ فکر کرنی نہ پڑی اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کیلئے اعزا و احباب کا ایک کثیر مجمع تھا۔ پھولوں اور امام ضامنوں سے ہم لوگ لدگئے تھے۔ جب ریل چلی تو سلیم بیگ نے کسی قدر جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

خوش قسمتی سے درجہ میں کوئی اور مسافر نہ تھا اسلئے آرام رہا۔ سنا تھا کہ یورپ کے

سفر میں بستر ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اسلئے حیدرآباد ہی میں ہوا بھر نیکے تین تکئے خرید لئے اور ایک چادر ساتھ رکھی۔ ان ہوائی تکیوں نے بہت آرام دیا۔ نصف شب کے قریب ریل قاضی پیٹھ اور ورنگل پہونچی کچھ احباب یہاں بھی خدا حافظ کہنے کے واسطے آئے۔ بجواڑہ پر مدراس کیلئے ٹرین تبدیل کرنی ہوتی ہے مگر ہم کو اپنے درجہ سے اُترنے کی ضرورت نہ ہوئی کیونکہ وہ راست جاتا تھا۔ جب ہماری ریل علی الصبح بجواڑہ پہونچی تو معلوم ہوا کہ مدراس جانے والی ریل دو گھنٹے لیٹ ہے۔ اس خبر سے یہ فکر پیدا ہوئی کہ مدراس پر ہم کو کولمبو میل ملتا ہے یا نہیں۔ راستہ میں ایک اسٹیشن پر دوپہر کا کھانا کھایا۔ فی شخص ڈیڑھ روپیہ دیا گیا مگر کھانا اچھا نہیں ملا۔ سمندر کی قربت کی وجہ سے لو نہیں تھی بلکہ ہوا میں کسی قدر خنکی معلوم ہوئی۔ اس جانب اسٹیشنوں پر رونق مطلق نہیں ہے۔ لوگ عام طور پر سُرخ تہبند باندھتے اور سر پر بال رکھتے ہیں۔ داڑھی اور مونچھ منڈوا دیتے ہیں اسلئے دور سے مرد اور عورت کی تمیز مشکل سے ہوتی ہے۔ سب ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ کسی اسٹیشن پر ایک بزرگ اپنی سفید داڑھی میں سُرخ کنگھا کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کو ہنسی آئی۔ انہوں نے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ رات کو آٹھ بجے مدراس کے سنٹرل اسٹیشن پر پہونچے کچھ احباب ہمارے انتظار میں پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ایک صاحب نے اپنے مکان پر کھانیکا بھی بندوبست کیا تھا لیکن ریل کے لیٹ ہونیکی وجہ سے اتنا وقت نہ تھا کہ انکے مکان پر جاتے اسلئے معذرت کیگئی سنٹرل اسٹیشن سے موٹروں میں سوار ہو کر اگمور اسٹیشن گئے۔ وہاں کولمبو میل تیار کھڑا تھا اور ہمارے لئے جگہ محفوظ تھی۔ اسٹیشن پر کچھ میوہ خریدا۔ کھانیکی کچھ چیزیں ہمارے ساتھ بھی تھیں اس پر قناعت کیگئی۔

مدراس تا دھنسکوڈی

اس ریل کے کمپارٹمنٹ چھوٹے ہوتے ہیں ہر ڈبہ میں دو برتھ تھے سامان کیلئے جگہ بہت کم تھی۔ منہ ہات

دھونے کا بیسن ڈبہ میں لگا ہوا تھا۔ رات آرام سے گذری۔ البتہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا نصف شب کے قریب بیت الخلا جانے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ سب کمرے ایک قطار میں تھے روشنی بند ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گیا جس میں دو انگریز میاں بیوی سو رہے تھے۔ آہٹ سنکر دونوں بیدار ہو گئے۔ اگرچہ اُن سے معذرت کر لیگئی لیکن شرمندگی کی وجہ سے بڑی دیر تک کوفت ہوتی رہی۔ یہ حصہ ملک کا سرسبز اور شاداب معلوم ہوا۔ دوپہر کا کھانا ایک اسٹیشن پر کھایا۔ معمولی تھا۔ رفیق بیگ کو ناف ٹلنے کا مرض ہے کسی وجہ سے انکی ناف ٹل گئی۔ کچھ دیر تک تکلیف رہی پھر ٹھیک ہو گئی۔ سر شام سمندر کا کنارہ قریب ہوتا گیا۔ جب دھنسکوڑی نزدیک آیا تو ریل سمندر کے ایک حصہ میں سے گذری۔ پل پر سے منظر اچھا تھا۔ کسی اسٹیشن پر ریل کے اندر کچھ بندر آ گئے۔ مسافروں نے میوے اور بسکٹوں وغیرہ سے انکی ضیافت کی۔ شام کو ساڑھے چار بجے دھنسکوڑی پہونچے۔ یہ مقام سمندر کے کنارے واقع ہے ہندوستانکی سرحد یہاں ختم ہوتی ہے۔

دھنسکوڑی تا تالامینار

ریل اسٹیمر کے قریب تک جاتی ہے۔ اسٹیمر پر ایک سو کے قریب مسافر تھے۔ اکثر ہمارے جہاز میں لندن جانیوالے تھے۔ ریل میں تو ملاقات کا موقع نہیں ہوا مگر یہاں دو ایک آدمیوں سے تعارف ہو گیا۔ ایک بنگالی ہیں مکرجی نامی۔ باتیں کرتے کرتے مجھکو بار روم میں لے گئے وہسکی اور سوڈا خود پیا اور مجھکو بھی پلانا چاہتے تھے۔ بڑی دیر تک انکار اور اصرار ہوتا رہا بالآخر لیمونیڈ پر یہ قصہ ختم ہوا۔ آدمی خلیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان صاحب نے شراب کی تعریف میں فرمایا کہ اگر شراب استعمال کیجائے تو یہ انسان کو چست۔ چالاک صحت مند حاضر دماغ رکھتی ہے میں نے کہا یہ صحیح ہے مگر جب تک حد اعتدال سے نہ بڑھ جائے یہ چیز مشکل ہے اسلئے شراب کے مقابلہ میں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنسے یہی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں

ایک صاحب بہادر ہیں جن کے ساتھ انکی دو نوجوان لڑکیاں بھی ہیں۔ یہ بھی لندن جا رہے ہیں۔ اسٹیمر پر سوار ہونیکے بعد پاسپورٹ اور ٹیکہ کے صداقت نامے دیکھے گئے ہم نے اپنے پاسپورٹ کک کمپنی کو بھجوا دیئے تھے۔ کیونکہ ان پر مختلف ممالک کا ویسا ہونا تھا۔ کمپنی نے ہم کو لکھا تھا کہ پاسپورٹ کولمبو کے دفتر پر راست بھجوا دیئے جائیں گے وہاں سے لے لینا ہم نے وہی خط جہاز کے افسر کو بتلا دیا۔ کسی قدر پس وپیش کے بعد اس نے منظور کر لیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ پاسپورٹ میں جن ممالک کا ذکر ہے وہاں کے سفیروں سے پاسپورٹ پر ویسا کروانا لازمی ہے۔ یہ ایک قسم کی اجازت ہے اس ملک میں داخل ہونیکے واسطے۔ کک کمپنی یا امریکن اکسپریس کے توسط سے یہ کام آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے بعض چھوٹے ممالک ویسا کی فیس بھی لیتے ہیں۔

تالامینار تا کولمبو

رات کو آٹھ بجے تالامینار اسٹیشن پہونچے۔ یہاں سے سیلون کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کولمبو کی ٹرین تیار کھڑی تھی مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ کم تھی۔ ایک کمپارٹمنٹ میں بمشکل بیٹھ گئے اس میں دو برتھ تھے۔ دو مسلمان مسافر سیلون کے رہنے والے پہلے ہی سے اسمیں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ نہ تو انگریزی جانتے تھے نہ اردو اشاروں کے ذریعہ جو کچھ بات چیت ہوئی اس سے پتہ یہ چلا کہ دونوں آدمی رات کا بڑا حصہ ریل ہی میں بسر کرینگے یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی کیونکہ کمپارٹمنٹ چھوٹا تھا۔ پانچ مسافر آرام کے ساتھ رات نہیں گزار سکتے تھے اس فکر میں کھانے کیلئے کھانے کی گاڑی میں چلے گئے۔ ہمارے قریب کی میز پر وہی صاحب بہادر مع اپنی لڑکیوں کے موجود تھے جن سے اسٹیمر پہ ملاقات ہوئی تھی۔ انکے ساتھ معمولی بات چیت ہوتی رہی۔ یہ صاحب آل انڈیا سروے میں ملازم تھے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر وطن جا رہے ہیں۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمپارٹمنٹ میں واپس ہوئے ہم کو چونکہ ساری رات ریل میں گزارنی تھی اس لئے جگہ

تلاش کرنے لگے۔ درجہ اول کا ایک کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ گارڈ کو اطلاع دیکر ہم اسمیں منتقل ہوگئے۔ کمپارٹمنٹ میں صرف دو برتھ تھے اسلئے سلیم بیگ درجۂ دوم ہی میں رہے انہوں نے ترکیب یہ کی کہ خود پوری برتھ پر قبضہ کرلیا اور بقیہ دو مسافروں کو ایک شیلف پر رکھا۔ رات آرام سے گذری۔ پچھلی شب کسی قدر خنکی محسوس ہوئی۔ صبح کو مناظر قدرت دکھائی دیئے۔ جس طرف دیکھو سرسبزی اور شادابی۔ ریل کے دونوں طرف ناریل چھالیا۔ موزا اور کٹھل وغیرہ کے درخت کثرت سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ میں سے ریل جارہی ہے۔

کولمبو آٹھ بجے کے قریب کولمبو پہونچے۔ اسٹیشن کے پاس وکٹوریہ ہوٹل میں قیام ہوا۔ خاصا آرام کا ہوٹل ہے۔ البتہ بجلی کے پنکھوں کی کمی ہے۔ کولمبو میں لو تو چلتی نہیں لیکن گرمی ایسی ہوتی ہے جیسے برسات کے موسم میں ہمارے ہاں۔ اس ہوٹل کا کرایہ پانچ روپیہ فی کس ہے جس میں کھانا شامل ہے۔ کھانیکا کمرہ کشادہ اور ہوادار ہے کھانا بھی اچھا ہوتا ہے۔ سوپ۔ مچھلی۔ انڈا۔ بیف۔ خشکہ سالن وغیرہ سب کچھ دیتے ہیں۔ کرایہ کے لحاظ سے بہت غنیمت ہے۔ ابر کی وجہ سے شدید حبس تھا پسینے چھوٹنے لگے۔ مجبور ہوکر ایک برقی پنکھا کرایہ پر منگوایا۔ ہمارے کمرہ کا رخ بھی اچھا نہیں تھا۔ اسلئے ایک دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ ہوٹل میں بلیرڈ روم بھی ہے۔ ہوٹل کا مالک سیلون کا باشندہ ہے۔ ہمارے جہاز کے کئی مسافر اسی ہوٹل ٹھیرے ہوئے تھے۔

کولمبو سیلون کا دارالسلطنت اور جدید شہر ہے اسکی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔ یورپ۔ آسٹریلیا۔ امریکہ اور چین و جاپان سے جہاز اس مقام پر آتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے شہر کی تجارت کو فروغ اور رونق ہے اس کا بندرگاہ جس کا شمار اچھے بندرگاہوں میں کیا جاتا ہے زر کثیر کے صرفہ سے تیار ہوا ہے اس کے قریب جو آبادی ہے اسکو فورٹ یعنے قلعہ کہتے ہیں۔ یہ کاروباری حصہ ہے جس میں

بڑی دکانیں ہیں ہر قسم کا مال دکانوں میں بھرا ہوا ہے۔ بازاروں میں رونق رہتی ہے۔ سڑکیں اچھی اور جدید وضع کی ہیں۔ شہر کے اس حصہ میں گورنر کا محل اور سرکاری دفاتر ہیں۔ ڈاکخانہ کی عمارت خوبصورت ہے۔ اسکے متصل جوبلی باغ ہے۔ دیسی آبادی کا حصہ الگ ہے جس میں مختلف اقوام کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ آب وہوا صحت بخش ہے البتہ کسی قدر گرمی رہتی ہے۔ مقیاس الحرارت کا اوسط (۸۲) ڈگری معلوم ہوا۔ کولمبو کے قریب ایک پہاڑ پیڈرو نامی ہے۔ اس پہاڑ کی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مقام نیورلیلیا ہے۔ یوروپین لوگ موسم گرما میں وہاں جاکر رہتے ہیں اس ملک میں زیادہ تر آبادی سنہالیو کی ہے جن کا مذہب بودھ ہے ٹامل قوم کے لوگ بھی بہت زیادہ ہیں یہ لوگ پستہ قد اور جفاکش ہوتے ہیں انکی عورتیں چاء کے باغوں میں کام کرتی ہیں اور مرد رکشا کھینچتے ہیں۔ رکشا کا رواج یہاں عام ہے۔ کچھ آبادی مسلمانوں کی بھی ہے جنکے آباواجداد عرب تھے۔ اکثر مسلمان ٹامل لوگ سمندر میں غوطہ مار کر سیپ نکالنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ غوطہ مارنے میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہاں کے باشندے عام طور پر تہبند باندھتے ہیں۔ بقیہ جسم یا تو برہنہ رہتا ہے یا کوٹ پہنتے ہیں۔ مردوں کے سر کے بال لمبے ہوتے ہیں جنکو وہ عورتوں کی طرح سر کے پیچھے لپیٹ لیتے ہیں۔ سکہ یہاں کا ہندوستان سے مختلف ہے۔

پہلے دن حوائج سے فارغ ہوکر ہم کک کمپنی کے دفتر گئے آل انڈیا سروے کے صاحب بہادر مع اپنی دو لڑکیوں کے یہاں پھر ملے سلام اور مزاج پرسی ہوئی دفتر سے ہم نے اپنے پاسپورٹ اور جہاز کے ٹکٹ لئے۔ کچھ روپیہ کے پونڈ منوائے یہاں سے فارغ ہوکر امریکن اکسپرس کے دفتر گئے ہندوستان واپس آنے کا بندوبست ابھی سے کرلیا گیا۔ لائڈ ٹرسٹو کمپنی کا جہاز لیس۔ گینجے جو بیس ستمبر کو وینس سے روانہ ہونیوالا تھا۔ اس میں دو برتھ محفوظ کرولئے۔ رفیق بیگ کو اپنی واپسی کے زمانہ کا

اطمینان نہیں تھا اسلئے انہوں نے اپنی سیٹ محفوظ نہیں کرائی اس کمپنی کی معرفت اپنے
سامان کا بیمہ بھی کرالیا۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بیمہ کرالینا قرین احتیاط ہے۔ آئندہ کسی
موقع پر اسکے فوائد کا ذکر کیا جائیگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ نقد روپیہ ساتھ نہ رکھنا چاہئیے
کُک کمپنی اور امریکن اکسپرس کے چیک بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں مختلف مالیت کے
چیک کی کتابیں ہوتی ہیں۔ اگر پانچ پانچ پونڈ والی کتاب لیجائے تو بہتر ہوگا۔ طریقہ
یہ ہے کہ ہر چیک پر کمپنی کے دفتر میں اپنی دستخط کرنی پڑتی ہے۔ اسکے بعد جب کبھی چیک
بھنوانا ہو اس وقت اپنی دستخط کرکے دیدو۔ لینے والا دونوں دستخطوں کی مطابقت
کرے گا۔ ان دونوں کمپنیوں کے چیک ہر شہر میں بڑی بڑی دکانوں اور ہوٹلوں میں
لے لئے جاتے ہیں۔ اسکے ماسوا خود ان کمپنیوں کے دفاتر ہر اہم مقامات پر موجود ہیں
وہاں سے بلا زحمت رقم لے سکتے ہو۔ نقد روپیہ ساتھ رکھنے میں سرقہ کا اندیشہ رہتا ہے
انہی کمپنیوں کی معرفت آپ اپنی ڈاک کا بھی بندوبست کراسکتے ہیں اس کیلئے کوئی
فیس نہیں لیجاتی البتہ مسافر کو چاہئیے کہ خود ہی کمپنی کے دفتر پر جاکر اپنی ڈاک وصول
کرلے۔ اگر پہلے سے ہدایت کردو تو ڈاک محفوظ بھی رکھی جاتی ہے۔ یا اس پتہ پر کہو بھجوادیجائیگی
ہم اپنی ڈاک امریکن اکسپرس کے ذریعہ منگوایا کرتے تھے۔

شام کے وقت ایک موٹر میں سوار ہوکر سیر کے واسطے نکلے اس میں شک نہیں کہ
کولمبو تفریح کا مقام ہے۔ اچھے اچھے باغ اور زمین ہیں۔ جدہر دیکھو سبزہ ہی سبزہ ہے
سمندر سے ٹھنڈی ہوا آتی رہتی ہے مگر دوپہر میں حبس کیوجہ سے پسینے آتے رہے۔
رات کو آٹھ بجے کے قریب ہوٹل واپس ہوئے۔ بارہ روپیہ موٹر کا کرایہ ہوا یہاں
دکانوں میں اجنبی آدمی سے قیمت بھی زیادہ لے لیا کرتے ہیں۔ موٹر کا کرایہ بڑی مشکل سے
طے ہوا۔ اصل یہ ہے کہ جن مقامات پر سیاح زیادہ آتے رہتے ہیں وہاں کے لوگ
بہت کچھ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتے ہیں سمجھتے ہیں کہ غیر ملک کی سیاحت کو

یہ شخص نکلا ہے تو اسکے پاس روپیہ بھی وافر ہوگا۔

ایک دلچسپ واقعہ

کھانے سے فارغ ہوکر جب ہم اپنے کمرہ میں سونیکی غرض سے لیٹے تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ہمارے پہلو میں تین کمرے اور تھے ایک کمرہ میں ایک صاحب بہادر اور ایک میم صاحبہ تھیں دونو میں جھگڑا شروع ہوا۔ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ میم صاحبہ کہتی تھیں کہ دروازہ کھولدو میں دوسرے کمرے میں جاؤنگی۔ بڑی دیر تک حجت ہوتی رہی۔ آخر کو کسی طرح دروازہ کھُلا اور میم صاحبہ نے پہلو کے کمرے میں داخل ہوکر اندر سے دروازہ بند کرلیا کچھ دیر بعد صاحب بہادر کو بیچینی ہوئی۔ اپنے کمرے سے نکل آئے اور میم صاحبہ کے کمرہ پر جاکر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ غل بھی مچاتے تھے اور عاجزی بھی کرتے تھے اندر سے میم صاحبہ جواب دیتی تھیں کہ میں دروازہ نہیں کھولتی۔ تم اپنے کمرہ میں جاؤ غل مچاکر دوسرے مسافروں کی نیند خراب مت کرو۔ صاحب بہادر نے جب اصرار کیا تو میم نے دروازہ کھولدیا۔ دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ ہوٹل کے دونوں ملازم کھڑے تماشہ دیکھتے تھے مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ انکو منع کرے۔ رات زیادہ ہوگئی اور ہم لوگوں کی نیند خراب ہونے لگی۔ سلیم بیگ نے صاحب بہادر کو منع کیا کہ غل نہ مچاؤ اور میم صاحبہ کو نہ ستاؤ مگر وہ شخص اپنے ہوش میں نہ تھا۔ دونوں خوب نشہ میں تھے صاحب بہادر کہنے لگے تم کو اس معاملہ سے کیا تعلق ہے تم خاموش رہو جب جھگڑا حد سے متجاوز ہونے لگا تو میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی میں نے صاحب بہادر سے کہا کہ میں مقامی پولس افسر ہوں اور ڈیوٹی پر ہوں۔ اگر تم خاموش نہ ہوگے اور اس جھگڑے کو ختم نہ کروگے تو میں تم کو تھانہ پر بھجوادونگا۔ یہ سنکر صاحب کسی قدر مرعوب ہوئے اور کہنے لگے کیا واقعی تم پولس افسر ہو۔ میں نے کہا ہاں یہ واقعہ ہے۔ سلیم بیگ کیطرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کون ہیں۔ میں نے کہا میرے مددگار ہیں۔ میم کہنے لگی دیکھو

یہ شخص مجھکو ستارہا ہے۔ اسکے پاس میرا روپیہ اور پاسپورٹ ہے۔ یہ دونوں چیزیں دلوا دو۔ میں الگ کمرے میں سونا چاہتی ہوں مگر یہ مجھے سونے نہیں دیتا۔ میں نے میم کو الگ لیجا کر پوچھا اگر تم اسکی بیوی ہو تو پاسپورٹ دونوں کے الگ الگ کیوں ہیں اس نے کہا اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں لکھنؤ سے آتے ہیں۔ لندن جائیں گے اس شخص کی بیوی مرچکی ہے اور اسکے دماغ میں کچھ خلل بھی ہے۔ کک کمپنی نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ تم بطور نرس اسکے ساتھ رہو اور نگرانی رکھو اسلئے میں اسکے ساتھ ہوں مگر یہ بدسلوکی کرتا ہے۔ اس قصہ کو سننے کے بعد میں نے صاحب بہادر سے کہا اس عورت کا پاسپورٹ اور روپیہ دیدو۔ جب یہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تمہارے کمرے میں رہے۔ بڑی حجت اور پس وپیش کے بعد اس نے جہاز کا ٹکٹ اور پاسپورٹ نکالا اور مجھسے رسید لیکر میرے حوالہ کیا البتہ رقم نہیں دی۔ ہم نے بھی اس وقت زیادہ اصرار نامناسب خیال کیا۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ تو میں نے اپنے پاس رکھے اور میم سے کہا کہ تم دوسرے کمرے میں سو جاؤ۔ صاحب بہادر کو ایک کمرے میں بند کرکے کنجی میم کے حوالہ کردیگئی۔ وہ پہلو کے کمرے میں سوگئی لیکن صاحب خاموش نہ ہوئے اندر ہی سے غل مچاتے رہے۔ میم کا نام لیکر روتے بھی تھے۔ میں نے کمرے کے پاس کھڑے ہوکر اونچی آواز میں فرضی احکام دیئے کہ دو کانسٹبل اس کمرے کے سامنے سو جائیں اگر صاحب غل مچائیں تو انکو ہوٹل کے باہر کردیا جائے۔ یہ احکام سنکر بالکل خاموشی ہوگئی۔ اس ہنگامہ میں رات کے دو بج گئے۔ بمشکل نیند آئی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ دونوں ایک کمرے میں تھے شاید رات کو کسی وقت ملاپ ہوگیا۔ ہم لوگ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر باہر جانیوالے تھے کہ میم صاحبہ ہمارے کمرہ میں تشریف لائیں ان کے پیچھے صاحب بہادر بھی تھے مگر میم نے صاحب کو اندر آنے سے روکدیا۔ اور دروازہ بند کرلیا۔ اسکے بعد مجھسے کہنے لگی کہ میرا روپیہ بھی اس کے پاس ہے

وہ مجھے دلوادو۔ میں نے کہا تم ہوٹل کے مینجر سے کہو وہ کوئی بندوبست کرے گا مجھکو قمی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے البتہ تمہارا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ میرے پاس ہے روانگی کے وقت دیدونگا۔ یہ سنکر وہ چلی گئی۔ ہم لوگ سیر کرنیکو نکلے لیکن ہوٹل کے مینجر کو تمام واقعات پچھلی رات کے بیان کرکے یہ کہدیا کہ رات کو پھر ہنگامہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ مقامی پولس کو اطلاع دیدو۔ بازار میں کچھ خرید و فروخت کرکے دو بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس ہوئے۔ کھانیکے کمرے میں صاحب اور میم دونوں ایک میز پر تھے۔ بظاہر ملاپ معلوم ہوتا تھا۔ ہوٹل کے مینجر سے معلوم ہوا کہ ایک مقامی یوروپین پولس افسر کو بلوایا تھا۔ اس نے میم کا پاسپورٹ طلب کیا۔ صاحب نے کہا اس ہوٹل میں ایک پولس کمشنر ٹھیرے ہوئے ہیں۔ پاسپورٹ انکے پاس ہے۔ افسر مذکور کو تعجب ہوا۔ مینجر نے الگ لیجا کر اصلی حقیقت سنائی وہ بہت محظوظ ہوا۔ اس نے یہ انتظام کیا کہ پچاس روپیہ صاحب سے لیکر میم کے واسطے مینجر کے پاس جمع کروا دیئے اور یہ وعدہ لے لیا کہ جہاز پر سوار ہونیکے بعد اور پچاس روپیہ دیدیئے جائیں گے۔ کھانے سے فارغ ہو کر صاحب بہادر میرے پاس آئے۔ رات کو جو بدتمیزی ہوئی تھی اسکے متعلق معذرت کی اور آئندہ کیلئے مشورہ کے طالب ہوئے۔ کیونکہ یہ شخص نشہ میں تھا میں نے اسوقت تو ٹالدیا اور بلیرڈ روم میں چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے وہاں بھی آیا اور لگا عاجزی کرنے کہ تم پولس افسر ہو اور جہاز پر بھی ڈیوٹی پر رہو گے۔ میں تم سے امداد چاہتا ہوں میرے ساتھ ہمدردی کرو۔ بڑی مشکل سے میں نے پیچھا چھوڑایا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک رفیق بیگ کے ساتھ میں بلیرڈ کھیلتا رہا۔

لطیفہ میرے ایک اسٹروک پر پیچھے سے آواز آئی (WELL PLAYED SIR) خوب کھیلے جناب پلٹ کر دیکھا تو ہوٹل کے دھوبی صاحب کھڑے تعریف کر رہے ہیں۔ یہ دھوبی کسی قدر انگریزی جانتا ہے۔ بلیرڈ سے فارغ ہو کر

میں اپنے کمرے میں لیٹنے کے واسطے گیا۔ صاحب بہادر نے مجھکو کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ فوراً میرے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئے اور اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک ملازم کے ذریعے اسکو اپنے کمرے سے نکلوایا۔ وہ چلّاتا جاتا تھا مجھکو پولس کمشنر سے ضروری بات کرنی ہے لیکن اسکو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس مصیبت سے نجات ملی تو میم صاحبہ نے حملہ کیا وہ بے تکلف کمرے میں داخل ہو گئیں اور پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انکو بھی کوشش کر کے نکالا گیا۔ شام کو سیر کے واسطے نکلے کولمبو میں ایک مندر دیکھنے کے لائق ہے جس میں اچھی مورتیں اور تصاویر ہیں۔ رات کو صاحب بہادر نے پھر وہی ہنگامہ کیا۔ منیجر نے ان کو سب سے اوپر کی منزل کے ایک کمرہ میں تنہا بند کر دیا رات بھر وہاں غل مچاتے رہے۔ ہم ۲۸ اپریل کو صبح کے وقت کولمبو پہونچے تھے اور جہاز کی روانگی ۳۰ اپریل کو شام کے وقت ہوئی۔ اس طرح تین روز کولمبو میں رہنے کا موقع ملا۔ ہر رات بارش ہوئی جسکی کیفیت بالکل طوفانی تھی۔ موسم کی یہ حالت دیکھکر مجھکو تشویش ہوئی کہ سمندر میں اگر طغیانی رہی تو ضرور متلی اور دوران سر کی شکایت ہو گی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ نوبت نہ آئی لیکن بعد کو جرمنی میں غلام یزدانی صاحب کے ایک خط سے ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ہماری روانگی کے بعد ہی کولمبو کے قریب ایک سخت طوفان آیا تھا جس نے کسی جہاز کو نقصان بھی پہونچایا۔ ۳۰ اپریل کو صبح کے وقت میم صاحبہ کمرے میں آئیں اور اپنا پاسپورٹ وغیرہ لے گئیں۔ کہتی تھیں کہ ہم دونوں میں صلح ہو گئی ہے۔ میں نے کہا یاد رکھو کہ میں جہاز پر بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ کوئی بد عنوانی نہ ہونی چاہئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب جھگڑا نہ ہو گا۔

آج جہاز کی روانگی کا دن ہے اسلئے سب مسافر اسباب باندھنے میں مصروف ہیں۔ کھانیکے وقت تک ہم نے اسباب باندھ لیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شہر میں گئے کولمبو میں ہم اکثر رکشا میں سوار ہوتے تھے اور کرایہ کے متعلق ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔

بازار میں ہم کو خیال ہوا کہ تین کرسیاں خرید لیں تاکہ جہاز پر آرام رہے لیکن کسی نے کہا کہ جہاز پر کرسیاں ملتی ہیں خریدنے کی ضرورت نہیں۔ ماسوا اسکے بازار میں کرسیونکی قیمت زیادہ طلب کیجارہی تھی اسلئے ہم خاموش ہو گئے۔ البتہ کک کمپنی کے دفتر سے میں نے ایک کتاب بول چال کے متعلق خریدی جو اس سفر میں مفید ثابت ہوئی۔ اس کتاب میں انگریزی الفاظ اور جملوں کا ترجمہ فرانسیسی۔ جرمنی اور اطالوی زبانوں میں کردیا گیا ہے۔ مسافر کی ضروریات کو ملحوظ رکھکر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اکثر اوقات اس سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی۔ شہر میں معلوم ہوا کہ جہاز آسٹریلیا سے آچکا ہے۔ چنانچہ جہاز کے بہت سے مسافر شہر میں پیدل اور موٹر پر سیر کرتے پھرتے تھے۔ جو لوگ پیدل تھے انکی جان دکانداروں سے مصیبت میں تھی۔ ہر دکاندار اصرار کے ساتھ اپنی دکان پر بلاتا تھا بعض مسافر ایسے بھی تھے جنھوں نے کبھی ممالک مشرقی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا وہ اس طریقہ پر تعجب کرتے تھے چنانچہ بعد میں جہاز پر دو تین آدمیوں نے مجھسے پوچھا کہ کیا ہندوستان کے تمام شہروں میں یہی دستور ہے۔ کولمبو میں اردو رائج نہیں ہے۔ ٹامل اور انگریزی عام طور پر بولتے ہیں۔ کچھ دیر شہر میں سیر کرنیکے بعد ہم ہوٹل کو واپس آئے اور چائے پیکر سہ پہر میں بندرگاہ روانہ ہو گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اسباب کسی قدر بھیگ گیا۔ اگر ہوٹل کا ملازم جسکے سپرد اسباب کیا گیا تھا غفلت نہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس کا توسط اختیار کرنے میں سہولت یہ ہوئی کہ ہم کو جہاز پر اسباب مل گیا ورنہ اجنبی آدمی پریشان رہتا ہے۔ بندرگاہ سے اسٹیمر کے ذریعہ جہاز پر گئے۔

جہاز کا سفر

یہ جہاز بیس ہزار ٹن کا ہے اور بالکل نیا بنا ہوا ہے۔ یورپ سے ہندوستان کی طرف آنے جانے والے بڑے جہازوں میں اسکا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے جو بڑے جہاز ہیں وہ ہندوستان نہیں آتے۔ سنتے ہیں کہ سب سے بڑا جہاز آجکل میجسٹک ہے جو چھپن ہزار چھ سو بیس (۵۶۶۲۰) ٹن کا ہے۔

مگر حقیقت تو یہ ہے کہ کتنا ہی بڑا جہاز کیوں نہ ہو سمندر میں ایک تنکا معلوم ہوتا ہے۔ آسٹریلیا سے یورپ کو ڈاک اسی کمپنی کی معرفت جاتی ہے۔ جہاز پر چیچک کا صداقتنامہ اور پاسپورٹ دیکھا گیا۔ روانگی سے قبل کک کمپنی نے ہم کو اطلاع دی تھی کہ مصر کے مسافروں سے جہاز والے بیس پونڈ بطور ضمانت لیتے ہیں۔ اور یہ رقم بعد کو جہاز سے اترتے وقت واپس کر دیجاتی ہے۔ تعجب ہے کہ ہم سے اس رقم کا مطالبہ نہیں ہوا۔ ہمارا کیبن یعنے کمرہ چھ مسافروں کا ہے۔ تین برتھ اوپر اور تین نیچے۔ ایک جانب منہ دھونے کا بیسن لگا ہوا تھا۔ کانچ کی صراحی اور گلاس۔ صابن اور فی مسافر دو دو توال غرض آسایش کا پورا سامان تھا۔ البتہ پنکھے نہیں تھے۔ جنکی موسم گرما میں بہت ضرورت ہے۔ گرمی کے مارے کیبن میں ٹھیرنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ ہماری خدمت کے واسطے ایک ملازم مقرر ہے جو انگلستان کا باشندہ ہے۔ ایک تجربہ کار مسافر نے مشورہ دیا کہ اپنے خدمت گار کو شروع ہی میں کچھ انعام دیدو تاکہ دلدہی سے تمہارا کام کرتا رہے فی الحقیقت یہ ترکیب مفید ثابت ہوئی۔ ع

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

ہمارے ساتھی دو مسافر لکھنؤ سے لندن جارہے تھے۔ یہ دونوں فارغ التحصیل ڈاکٹر ہیں اور سرکاری ملازم ہیں۔ مزید تعلیم کیلئے رخصت لیکر دو سال کے واسطے جارہے ہیں یہ دونوں ہندو ہیں۔ صرف گائے کا گوشت نہیں کھاتے باقی سب چیزیں کھاتے ہیں تیسرا مسافر رنگون کا باشندہ ہے اس کا رنگ سیاہ ہے قومیت معلوم نہیں ہوئی لکھنو والوں کے ساتھ پان اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی ہیں جس میں ہم بھی شریک ہوگئے۔ جہاز میں کمرے زیادہ وسیع نہیں ہوتے اسلئے اپنے ساتھ سامان کم رکھنا چاہئے وزنی اور غیر ضروری سامان کیلئے گودام الگ ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کے ساتھ سامان زیادہ تھا۔ مجبوراً کچھ سامان گودام بھجوا دینا پڑا۔ اس جہاز پر تقریباً پندرہ سو مسافر ہیں

جنمیں سے پانچ سو کے قریب درجہ اول میں ہیں اور بقیہ تیسرے درجہ میں۔ درجہ دوم اس کمپنی کے جہازوں میں نہیں ہوتا۔ تیسرا درجہ خاصا آرام دہ ہے۔ گھر سے چلتے وقت تیسرے درجہ کا نام سنکر جو تشویش ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ متوسط درجہ کے ہندوستانیوں کیلئے بہت موزوں ہے۔ صرف ایک بات اعتراض کے لائق ہے وہ یہ کہ ہندوستانیوں کیلئے کھانے کی میز علیحدہ ہے اور اسی لحاظ سے کیبن میں بھی جگہ دیجاتی ہے۔ ہندوستانیوں کو اس برتاؤ کی کچھ عادت سی ہوگئی ہے۔ اسلئے بیچارے اس فرق کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں دوسری دنیا میں بھی یوروپین لوگوں کیلئے بہشت اور دوزخ الگ نہ ہو۔ ہمکو تو اللہ میاں کے انصاف پر ہر طرح بھروسہ ہے۔ مگر ایک صاحب کا اعتقاد یہ تھا کہ گوری قوم کیلئے جو دوزخ ہوگا وہ کالونکی بہشت کے مساوی ہوگا۔ کہتے تھے کہ دنیا میں اسکی مثال موجود ہے۔ یوروپین قیدیوں کے جیل خانوں کو دیکھو اور اس کا مقابلہ کالے قیدیوں کے جیل خانوں سے کرو۔ ایک بہشت ہی اور دوسرا دوزخ

جہاز پر کھانا تقریباً بیس ہندوستانی مسافر تیسرے درجہ میں ہیں۔ سب ایک ہی میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ صبح کی چائے کمرے ہی پر ملجاتی ہے۔ اسکے علاوہ چار دفعہ کھانا ملتا ہے۔ ایک بڑا ڈائننگ ہال یعنے کھانیکا کمرہ ہے۔ مسافروں کی کثرت کی وجہ سے تین دور ہوتے ہیں۔ میز پر مکھن۔ روٹی۔ مربّا چائے۔ کافی۔ اور بسکٹ یہ چیزیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی کھانا برا نہیں ہوتا۔ مذہبی لحاظ سے جو چیز قابل اعتراض ہو اُسکو چھوڑدینے کے بعد بھی انسان بھوکا نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی کھانیکے ساتھ آئس کریم بھی ملی اور اکثر میٹھا بھی کھانے میں آیا۔ رفری جیریٹر میں ٹھنڈا کیا ہوا پانی ہر وقت ملتا ہے کھانیکے کمرے کے قریب ایک نل بھی لگا ہوا ہے۔ جس وقت جی چاہے ٹھنڈا پانی پی سکتے ہو۔ تیسرے درجہ کے مسافروں کیلئے ایک بڑا کمرہ نشست کا علیحدہ ہے جو دیوان خانیکے طور پر

استعمال ہوتا ہے اس میں اعلیٰ درجہ کا فرنیچر اور برقی پنکھے موجود ہیں۔ ماسوا اس کے ایک پیانو اور ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے۔ اگر جہاز کے دفتر میں ایک قلیل رقم جمع کرا دو تو کتابیں ملجاتی ہیں۔ بعد میں رقم واپس کر دیجاتی ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لئے قلم دوات اور میز لگی ہوئی ہے۔ جہاز کے مونوگرام کے کاغذ اور لفافے مفت ملتی ہیں ایک اور بڑا کمرہ ہے جسکو بار روم کہتے ہیں۔ یہاں ایک طرف شراب۔ لیمونیڈ اور سگریٹ وغیرہ کی دکان ہے۔ میز کرسیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ برقی پنکھے چلتے رہتے ہیں۔ اکثر مسافر یہاں تاش کھیلنے کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ ایک دکان عام اشیاء کی ہے جسکو ڈیوٹی شاپ کہتے ہیں۔ اس میں ضرورت کی اکثر چیزیں ملتی ہیں۔ تیسرے درجہ کے واسطے چار ڈک ہیں۔ جہاز کی جس منزل میں رہنے کے کمرے ہوتے ہیں اسکی چھت کو ڈک کہتے ہیں۔ ڈک پر سے سمندر دکھائی دیتا رہتا ہے اور خوب ہوا آتی ہے۔ اسلئے لوگ زیادہ تر ڈک پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کرسیاں ڈال لیجاتی ہیں اور دن سارا ڈک پر گذر جاتا ہے۔ اس جہاز کے تیسرے اور چوتھے ڈک پر لوگ زیادہ بیٹھتے ہیں۔ وہیں کھیل کود بھی ہوتا ہے۔ مختلف اقسام کے کھیل مہیا کئے جاتے ہیں۔ میں زیادہ تر ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ ہم کو باوجود کوشش کے کرسی نہیں ملی۔ جواب یہ ملا کہ سب کرسیاں ہوگئیں ہیں۔ پہلے تو ہم کو افسوس ہوا مگر بعد میں ہم نے آرام کی ایک جگہ نکال لی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر کرسیاں خالی پڑی رہتی ہیں کیونکہ لوگ ادھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کرسی پر تھوڑی دیر کیلئے بیٹھ جاؤ تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ یہاں کچھ ایسا ہی قاعدہ پڑ گیا ہے۔ بعض لوگوں کی کرسیاں اسی جھگڑے میں کھو بھی گئیں۔ نام کا لیبل یا تو گر جاتا ہے یا کوئی صاحب نکال بھی لیتے ہیں۔ جس طرح بعض لوگ کتاب کے سرقہ کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ وہی کیفیت ڈک چیر کی بھی ہے۔ ڈک پر کرسیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ نہ کوئی قاعدہ ہے

اور نہ کوئی ترتیب۔ جس کو سہولت ہوئی وہیں اس نے کرسی ڈال لی۔ مسافر زیادہ اور جگہ کم۔ راستہ چلنا مشکل ہوگیا۔ اگرچہ چہل پہل رہتی ہے مگر بعض لوگ اس ہجوم سے پریشان بھی ہوتے ہیں۔

جہاز کے مسافر زیادہ تر مسافر آسٹریلیا کے رہنے والے ہیں۔ بعض انگریز ہیں جو اپنے وطن کو واپس جا رہے ہیں۔ لندن میں آسٹریلیا کیساتھ جو کرکٹ میچ ہونے والا ہے اسکو دیکھنے کی غرض سے بہت سے لوگ جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کو سیر و سیاحت کا کس قدر شوق ہے۔ سب سے زیادہ تعجب ان عورتوں پر ہوتا ہے جنکے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مگر کچھ پرواہ نہیں۔ بچے بھی کیسے تربیت یافتہ ہیں۔ نہ شور و غل ہے نہ مار پیٹ۔ ہندوستان کے لوگ سفر کے نام سے جس قدر پریشان ہوتے ہیں اتنا ہی ان لوگوں کو اسمیں لطف آتا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگ انگریزوں کی طرح متین اور کم سخن نہیں ہوتے بلکہ بہت جلدی بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ عورت۔ مرد۔ جس سے جی چاہے باتیں کرو۔ تعارف کی ضرورت نہیں۔ دو ایک آدمیوں نے تو ہم سے شکایت بھی کی کہ تم لوگ ضرورت سے زاید الگ الگ رہتے ہو۔ بعض نے ہم کو زبردستی اپنے ساتھ کھیل میں شریک کیا۔ چند انگریز ایسے تھے جو آسٹریلیا والوں کی عادات اور بے تکلفی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے کو اُن لوگوں سے الگ الگ ہی رکھتے تھے۔ چنانچہ آل انڈیا سروے والے صاحب بہادر کو دیکھا کہ سب سے الگ اپنی دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ نہ کسی سے بات نہ چیت۔ دو ایک دفعہ مجھ سے گفتگو کا موقع ہوا۔ کہتے تھے کہ آسٹریلیا کے لوگ مجھ کو پسند نہیں۔ میں ناحق اس جہاز سے آیا مگر ہم کو آسٹریلیا والوں کی سادگی بہت پسند آئی۔ گرمی کی وجہ سے سب نے کوٹ اتار دیئے تھے۔ کھانیکے وقت بھی لباس کی پابندی نہ تھی۔ صرف قمیص اور پتلون پہنے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ

گرمی میں ٹائی اور کالر بہت تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ اکثر لوگ ہندوستان کے سیاسی حالات پر ہم سے گفتگو کرتے تھے۔ ہندوستان کے متعلق ان کے معلومات بہت محدود ہیں۔ بعض تو یہ بھی پوچھتے تھے کہ ہندوستانیوں میں کیا کیا فرق ہے اور گاندھی مسلمان ہے یا ہندو۔ ایک انگریز سے ملاقات ہوئی جسکی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ آسٹریلیا میں اپنے بچوں کو دیکھنے کیلئے گیا تھا۔ لندن سے چار پانچ گھنٹے کی مسافت پر اس کا مکان ہے۔ لیکن اس نے کبھی لندن نہیں دیکھا۔ یہ سنکر مجھکو حیرت ہوئی۔

رات کو ڈک پر سونے کی اجازت تھی۔ ایک جانب مرد سوتے تھے اور دوسری جانب عورتیں۔ سب لوگ کیبن سے اپنے اپنے بستر اٹھا لائے تھے لیکن علی الصبح اٹھنا پڑتا تھا کیونکہ اسوقت جہاز کا فرش دھویا جاتا ہے۔ منہ ہات دھونے کیلئے ایک بہت وسیع کمرہ ہے جس میں متعدد سلاپچیاں لگی ہوئی ہیں۔ سلاپچی میں گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں اس کمرہ میں متعدد بیت الخلا اور حمام ہیں۔ پہلے سمندر کے پانی سے نہانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد تازہ پانی سے جسم دھونیکی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سمندر کا پانی کھارا ہوتا ہے۔ ایک بالٹی تازہ پانی کی جہاز کا ملازم دیدیتا ہے ہندوستانی حضرات کو معلوم رہنا چاہئے کہ یہاں بیت الخلا میں پانی کا بندوبست نہیں ہوتا۔ البتہ کاغذی گھوڑے جتنے چاہو دوڑاتے رہو بہتر ہوگا کہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی بوتل رکھ لی جائے۔ ایک تماشہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جب حمام خالی نہیں ہوتا تو بعض بے شرم برہنہ ہوکر حمام کے باہر سب کے سامنے نہانے لگتے ہیں۔ عجب تمدن اور معاشرت ہے۔ ہم لوگ آپس میں اس طریقہ پر اظہار نفرت کرتے تھے۔ لکھنو کے ڈاکٹر نے کیا خوب کہا ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

مرد عورت کا ایک حوض میں نہانا

ایک بڑا حوض ہے جسمیں عورت مرد ساتھ نہاتے اور تیرتے ہیں بعض لوگ اطراف کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے رہتے ہیں نہانیوالی عورتوں کو مطلق حجاب نہیں ہوتا حالانکہ انکے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ ہوتا ہے۔ مشرقی تہذیب کے لحاظ سے یہ انتہا درجہ کی بے حیائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک میں اخلاق کا معیار جداگانہ ہوتا ہے البتہ کچھ زمانہ پہلے یورپ میں بھی یہ طریقہ معدوم تھا۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ نئی نئی باتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ آل انڈیا سروے کے صاحب بہادر سے ایک دفعہ بہ سبیل تذکرہ میں نے پوچھا کیا تم اس طریقہ کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہو انہوں نے ہنایت جوش کے ساتھ مخالفت کا اظہار کیا۔ کہتے تھے ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ذرا صبر کرو۔ یورپ میں قدم رکھنے کے بعد اس سے زیادہ دیکھو گے۔ ہندوستان میں ایک مدت تک بود و باش رکھنے کی وجہ سے ان صاحب کے خیالات میں مشرق کی جھلک پائی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے دستور کے خلاف اپنی لڑکیوں پر سخت نگرانی رکھتے تھے۔ باپ کی اجازت بغیر یہ لڑکیاں نہ تو کہیں جاتی تھیں اور نہ کسی سے بات کرتی تھیں۔

دلچسپی کا سامان

جہاز پر سینما کا بھی بندوبست ہے۔ رات کو کھانیکے بعد تماشہ ہوا کرتا ہے۔ کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ اسکے علاوہ مسافر خود بھی ناچتے اور گاتے رہتے ہیں۔ مختلف کھیلوں کے ٹورنمنٹ ہوئے۔ میں برج کے ٹورنمنٹ میں شریک ہوا۔ ایک لڑکی مس ہوپر نامی میری پارٹنر تھی۔ دو بازیاں ہم جیتے۔ تیسری بازی میں اچھے پتے نہ آئے اور ہم ہار گئے۔ کھیل کے پہلے دور میں ہمارے مخالف ایک پادری صاحب تھے۔ پادری کا نام سنکر ہندوستانی مولوی صاحبین کے غالباً کان کھڑے ہو جائیں گے کہ آخر جنت کے اس ٹھیکہ دار کو لہو و لعب میں

شریک ہونیکی کیا ضرورت تھی۔ اعتراض تو واجبی ہے لیکن یہ معلوم رہنا چاہئے کہ یورپین مولوی ہمارے ہاں کے مولوی صاحب سے مختلف ہوتا ہے۔ باطن کی خبر تو عالم الغیب کو ہے لیکن صورت ظاہری دیکھو تو زمین آسمان کا فرق پاؤگے یوروپین مولوی اکثر ڈاڑھی مونچھ کا جھگڑا نہیں رکھتا۔ اور کوٹ پتلون تو یہ کمبخت ہفت دن پہنے رہتا ہے۔ اب رہی مست کی تو اس میں بھی اسکو دریغ نہیں۔ اسکے نزدیک عورتوں کے ساتھ ناچنا بھی داخل عیب نہیں ہے۔ غرض یہ کہ جنت کے راستہ میں یوروپین مولوی زیادہ رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا۔ دلچسپی کی ایک اور چیز یہ تھی کہ روزانہ جہاز کی رفتار پر شرط لگائی جاتی تھی۔ ایک بورڈ پر جہاز والے کچھ نمبر لکھدیا کرتے تھے۔ ان پر ٹکٹ خرید اجاتا تھا۔ جو نمبر صحیح ہوتا اس پر جیت ہوتی۔ آخر میں ہم نے حساب ڈالا تو دس بارہ آنہ کی جیت رہی۔

تندرستی

سمندر میں سکون رہا۔ کسی روز تھوڑی دیر کیلئے تموج بھی رہا جسکی وجہ سے جہاز کسی قدر ہلتا تھا۔ چند مسافروں کو دوران سر بھی ہوا ہم کو کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ سلیم بیگ کو بدہضمی کی شکایت ہوگئی۔ جہاز کے ڈاکٹر نے مسہل دے دیا۔ طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ مجھکو خلاف عادت جہاز پر نیند بہت معلوم ہوتی تھی۔ دن کے وقت میں کبھی نہیں سوتا مگر یہاں ہر وقت نیند موجود رہتی تھی۔ سمندر کی ہوا نے میری صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ خلاف معمول بھوک معلوم ہوتی تھی اور خوب کھاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جہاز پر دس روز ہنسی خوشی کیساتھ گذر گئے ایکروز پھر

لطیفہ

رفیق بیگ کی ناف ٹل گئی۔ میں نے ہدایت کردی ہے کہ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے کیونکہ یورپ کے سفر میں ناف کا ٹلنا فیشن کے خلاف ہے۔ سلیم بھائی نے کہا شاید تم کو خبر نہیں کہ تمہارے پاسپورٹ میں بھی لکھا ہے کہ اس سفر میں ناف ٹلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسکے خلاف اگر ہوا تو پاسپورٹ منسوخ ہوجائیگا۔

غرض اسطرح کی دلگی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس کا نام لطف صحبت ہے۔ یہ بات نہ ہو تو سفر دو کوڑی کا ہے۔ سلیم بیگ کو کسی قدر ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔ اُنہوں نے اتفاق سے کسی مسافر کا ہاتھ دیکھکر اسکو کچھ بتا دیا۔ پھر کیا تھا۔ پچاسوں آدمیوں نے ان کو گھیر لیا خصوصاً عورتوں نے بہت پریشان کیا۔ آخر کو ہاتھ دیکھتے دیکھتے گھبرا گئے۔ اور ایک ذرکیبن ہی میں بند رہے مگر جان نہ بچی۔ عورتوں نے تقاضا کر کے باہر بلوا ہی لیا۔ غنیمت کہ سوئز قریب آگیا تھا ورنہ جان مصیبت میں رہتی۔ عورتیں زیادہ تر شادی اور اولاد کے متعلق سوالات کرتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ اعتقاد ہندوستان تک محدود ہے لیکن معلوم ہوا کہ یورپ کی عورتیں اس معاملہ میں ہندوستان کی عورتوں سے کچھ کم نہیں۔

جہاز اور انسان کی حقیقت

کبھی کبھی کوئی جہاز بھی آتا جاتا نظر آتا تھا۔ مسافر گھنٹوں اسکو دیکھتے رہتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ دوسرے جہاز کو دیکھنے کے بعد ہی اس بات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ سمندر میں اسکی کیا حقیقت ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ بڑے سے بڑا جہاز ایک حقیر ترین مچھلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان ضعیف البنیان کو دیکھو اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت کس کس طرح دیتا ہے۔ سمندر میں جہاز کا چلانا تو ایک پرانی اور بھولی ہوئی بات ہوگئی ہے مگر اب تو وہ ہوائی دنیا میں بھی قدم جمانے لگا لیکن قدرت کا کارخانہ کچھ اور ہے اسکی ماہیت کو ابتک کوئی سمجھ نہ سکا۔ انسان اپنی حد تک تو سب کچھ کر لیتا ہے مگر پھر بھی غیر مکمل ہے۔ یاد ہوگا کہ دنیا کے سب سے بڑے جہاز ٹیٹانک کا کیا حشر ہوا۔ جہاز بنانیوالوں کو اپنی کاریگری پر بڑا ناز تھا۔ اسمیں تو شبہ نہیں کہ وہ فن جہاز سازی کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ لیکن تھا تو انسان ہی کا بنایا ہوا اپنے پہلے سفر میں برف کی ایک سل سے ٹکرا کر چشم زدن میں معدوم ہو گیا۔ دنیا کے

نامی گرامی اور ذی اثر لوگ اس میں سفر کر رہے تھے۔ کسی کی عقل نے کچھ کام نہ کیا۔
اللہ میاں نے جب دیکھا کہ انسان اس عبرت ناک واقعہ کو بھولتا جاتا ہے اور اسکو
اپنی عقل پر روز بروز غرور ہوتا جاتا ہے تو انہوں نے پھر اسکی گوشمالی کردی۔ حال ہی
میں انگریزوں کا سب سے بڑا ہوائی جہاز (آر۔ ۱۰۱) ہندوستان کی طرف لندن سے
روانہ ہوکر تیز رفتاری کے ساتھ عالم بالا میں چلا جا رہا تھا۔ کارکنان قدرت نے
زبان ہوکر یہ شعر پڑھا۔

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسمان نیز پرداختی

یکایک جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہوئی۔ اپنی بلند پروازی کو بھول گیا اور یک بینی و
دو گوش زمین کی طرف رجوع ہوا۔ اس جہاز کی بڑی دھوم دھام تھی مگر آناً فاناً میں
کچھ سے کچھ ہو گیا۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی حقیقت کو پہچانے۔

پانچویں مئی کو افریقہ کا کنارہ قریب آگیا۔ فاصلہ پر کچھ پہاڑ دکھائی دینے لگے
لوگ اپنی اپنی دوربینوں کو لگا کر بڑے شوق سے ان پہاڑوں کو دیکھتے رہے بات یہ ہے کہ
پانی کو دیکھتے دیکھتے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ اگر کبھی زمین نظر آئے تو بڑی گرمجوشی
کے ساتھ اسکو دیکھتے رہتے ہیں۔ چھٹی مئی کو شام کے وقت باب المندب کے قریب پہونچے
جزیرہ پیرم کے چراغ دکھائی دیتے تھے۔ درجۂ اول کا ایک مسافر قلب کی حرکت بند
ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ اسکی لاش سمندر میں ڈالدی گئی۔ خدا ایسی موت سے محفوظ
رکھے۔ رات کو کسی وقت ہم بحر احمر میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی گرمی مشہور ہے۔ پہلے
دن تو بڑی تکلیف رہی۔ پسینے چھوٹتے رہے لیکن دوسرے روز خنکی تھی اور سمندر
میں کسی قدر جوش تھا جہاز میں روزانہ اخبار تقسیم ہوتا ہے۔ چھٹی مئی کو گاندھی جی
کی گرفتاری کی خبر ملی۔ ایک دن کچھ دیر کیلئے بڑی تفریح رہی۔ ہر مسافر کو ایک

لایف بلٹ دیجاتی ہے۔ یہ ایک قسم کی پیٹی ہوتی ہے جس میں خاص قسم کے تکئے لگے ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اگر کسی وجہ سے جہاز ڈوبنے کی نوبت آئے تو اس پیٹی کو باندھ لینا چاہئے۔ اسکے سہارے سے انسان پانی پر بہتا رہتا ہے۔ جہاز والے ایکروز جملہ مسافروں کو اس پیٹی کے ساتھ مقررہ جگہ پر جمع ہونیکی ہدایت دیتے ہیں۔ سب مسافر پیٹی باندھ کر جمع ہوتے ہیں۔ اسوقت کی کیفیت تصویر لینے کے لائق ہوتی ہے، ایک دوسرے کو دیکھکر ہنستے اور مذاق کرتے ہیں۔ میں نے مذاقیہ طور پر کپتان سے پوچھا "کیا ڈوبتے وقت پاسپورٹ بھی جیب میں رکھنا لازمی ہے؟" اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔ نومئی کو سہ پہر کے وقت ہم خلیج سوئز میں داخل ہوئے۔ دائیں جانب خلیج اکابہ ہے۔ دونوں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ منظر خوشنما تھا۔ ہم نے اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ٹکٹ پورٹ سعید کا لیا ہے مگر سوئز پر اترنیکا ارادہ کر لیا کیونکہ یہاں سے قاہرہ قریب پڑتا ہے۔ جہاز کے افسر کو اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ وہ حجت کرنے لگا کہ سوئز پر اترنے کی اجازت نہیں مل سکتی کیونکہ وہاں کروڑگیری کا دفتر نہیں ہے اسکی لاعلمی پر ہم کو تعجب ہوا۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ سوئز پر مسافر اترا کرتے ہیں۔ آخر کو اس نے جواب دیا کہ کل سوئز پہونچنے کے بعد تصفیہ کرونگا۔

سوئز

دس مئی صبح آٹھ بجے کے قریب سوئز پہونچے۔ کنارہ سے کچھ فاصلہ پر جہاز ٹھیرا۔ کئی مصری سوداگر کشتیوں میں مختلف قسم کا سامان لیکر جہاز کے قریب آ گئے۔ اکثر مسافروں نے مہنگے داموں پر خریدیں لطف یہ تھا کہ خریدنے والے عربی سے ناواقف اور بیچنے والے انگریزی سے کورے چند الفاظ ان لوگوں نے سیکھ لئے ہیں۔ اسی سے کام نکالتے ہیں۔ جس وقت جہاز نے لنگر ڈالا عجب ہنگامہ برپا ہوا۔ کچھ مسافر جو سوئز پر اترنے والے تھے وہ اپنے اسباب کی فکر میں ادہر سے ادہر پھرتے تھے۔ کچھ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے بہت سے

مصری سوداگروں کا تماشہ دیکھتے تھے اور ایک بڑی تعداد ایسے مسافروں کی تھی جو ایک روز کیلئے قاہرہ کی سیر کو جانیوالے تھے۔ یہ لوگ دوسرے دن پورٹ سعید پر جہاز میں سوار ہوجائینگے۔ غرض یہ کہ جہاز پر ایک تہلکہ پڑ گیا۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں تھا۔ ایک سیاہ رنگ کے ہندوستانی پادری صاحب ادہر سے اُدہر مارے مارے پھرتے تھے۔ اس بیچارے کو کوئی پوچھتا بھی نہ تہا۔ مذہبی پیشوا ہیں تو ہوا کریں آجکل مذہب ہی کو کوئی نہیں مانتا۔ پیشوا کو کون پوچھیگا۔ ہم کو اپنا اسباب اتروانیکی جلدی تھی۔ ہمارے کمرے کا خادم جہاز کے دروازے تک ہمارا اسباب لایا۔ دستور کے مطابق اسکو انعام دیا گیا۔ ڈائننگ ہال کا ملازم جو ہماری میز پر کام کرتا تھا انعام کی امید میں دروازہ پر ملا اسکو بھی ہم نے کچھ دیدیا۔ ہندوستانیوں کی قسمت دیکھو کہ جہاز پر سوار ہوتے ہی یوروپین خادم کام کرنے کو ملتے ہیں۔ جہاز کے قریب کئی ایک کشتیاں کرایہ کی آگئیں۔ جہاز کے افسر نے ہم کو اترنے کی اجازت دیدی۔ ایک کشتی میں ہم سوار ہو گئے۔ اس میں سات مسافر اور تھے۔ تین عورتیں اور چار مرد۔ عورتوں میں ایک لڑکی امریکن تھی۔ جسکی عمر بائیس سال کے قریب ہوگی۔ ایک خاتون مسز کروک کسیقدر سن رسیدہ اور بیوہ ہیں۔ تیسری مسز لسٹائی ہیں جنکے خاوند مسٹر لسٹائی بھی ساتھ ہیں۔ بقیہ تین آدمی ان کے دوست ہیں۔ یہ سب آسٹریلیا سے لندن جارہے ہیں۔ محض قاہرہ کی سیر کے واسطے سوئز پر اُترے ہیں۔ مسٹر اور مسز لسٹائی سے جہاز پر کسی قدر روشناسی ہوگئی تھی۔ ان سب نے کہا کہ تم لوگوں کی وجہ سے ہم کو تقویت ہوگی۔ اگر سب ساتھ رہیں تو اچھا ہے ہم نے بھی اس بات کو منظور کر لیا۔ کنارہ پر پہنچنے کے بعد ایک بڑی مہم پیش آئی۔ یعنے کسٹم ہوز میں اسباب کا معائنہ کرانا لازمی تھا۔ اس میں کوئی نصف گھنٹہ لگ گیا۔ اسباب کا معائنہ بہت تفصیل کیساتھ ہوا حتیٰ کہ سگریٹ کیس کو بھی کھول کر دیکھا۔ ہمارے پاس کوئی چیز محصول طلب نہ تھی

پاسپورٹ کی جانچ پڑتال بھی ہوئی۔ اس کا خیال رہے کہ پاسپورٹ سرحد کے مقام پر ضرور دیکھا جاتا ہے۔ اسکو اپنے جیب میں بہت حفاظت کے ساتھ رکھنا چاہئے اگر خدانخواستہ یہ کھو جائے تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ معائنہ کے بعد افسر متعلقہ پاسپورٹ پر مہر کر دیتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہونیکے بعد موٹروں کی فکر ہوئی۔ سوئز سے ریل کے ذریعہ بھی قاہرہ جاسکتے ہیں لیکن ریل کا وقت نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں عرصہ بھی زیادہ لگتا ہے۔ اسلئے ہم نے موٹروں کے ذریعہ جانا پسند کیا۔ متعدد موٹریں موجود تھیں لیکن کرایہ ٹھیرانے میں بڑی تکرار رہی۔ نصف گھنٹے کے قریب وقت ضائع ہوا

غیر متعلق اشخاص کی مداخلت

دو ایک غیر متعلق آدمی جن کو بظاہر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہ تھا ناخواندہ دخیل ہو گئے۔ یہ چاہتے تھے کہ موٹر ان کے توسط سے کرایہ پر لیجائے اور کچھ رقم بطور محنتانہ ان کی نذر کیجائے۔ ہر چند ہم نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن روزانہ اس کام کو کرتے کرتے یہ لوگ بے حیا ہو گئے ہیں انکے دخیل ہونیکی وجہ سے اور بھی طوالت ہوتی تھی۔ ہمارے بھائی سلیم بیگ بڑے حکمت عملی کے آدمی ہیں۔ انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اس مصیبت کو ٹالا۔ ہم کو تین موٹروں کی ضرورت تھی۔ بڑی رد و قدح کے بعد فی موٹر تین پونڈ کرایہ طے پایا سوئز سے قاہرہ ایک سو تین میل ہے۔ کچھ دیر شہر میں کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ سوئز ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ سمندر کے کنارے پر ہونیکی وجہ سے کسی قدر رونق رہتی ہے ہم جس روز پہنچے عید الضحیٰ کا دن تھا۔ نماز سے لوگ واپس ہو رہے تھے۔ چہل پہل تھی۔ اگر ہم کو بمبئی سے جگہ ملجاتی تو قاہرہ میں عید کی نماز پڑھتے۔ وقت کی تنگی نے اس کا بھی موقع نہ دیا۔

سوئز تا قاہرہ تقریباً دس بجے سوئز سے روانہ ہوئے۔ دھوپ تیز تھی اور ہوا میں گرمی تھی۔ تمام راستہ ریگستان ہی میں سے گذرا۔ ابھی سڑک بنانیکی کوشش کیجارہی ہے۔ ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ گرمی کی وجہ سے پیاس شدت کے ساتھ معلوم ہونے لگی۔ اپنے ساتھ سوائے نان پاؤ کے اور کچھ نہ تھا سنگترے کی قسم کا ایک میوہ پرتغان ہوتا ہے۔ چند پرتغان سوئز سے خرید لئے تھے۔ پانی کی طرف سے بالکل مایوسی تھی۔ کیونکہ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ چاروں طرف ریت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ موٹر والے انگریزی سے ناواقف تھے اور ہم عربی سے محروم اسلئے ان سے کوئی مدد نہ ملی۔ بالآخر اس چٹیل میدان میں ایک چھوٹا سا کمرہ سڑک کے کنارے نظر آیا۔ قرینہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سڑک کی تعمیر کے سلسلہ میں یہ کوئی چوکی ہے یہاں موٹروں کو ٹہرایا گیا۔ میں پانی کی فکر میں چوکی کے اندر گیا۔ وہاں دو حبشی خوفناک شکل کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گلوں پر داغ کے لمبے لمبے نشان تھے۔ پانی کی چھاگلیں دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ زمین پر ایک جانب برف کی بہت بڑی سل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سنائی۔ سب جمع ہوگئے۔ ایک حبشی کے ہات میں ایک شلنگ رکھدیا اور اشاروں سے اپنا مطلب سمجھایا۔ پانی خود ہی ٹھنڈا تھا۔ ریگستان کی گرم ہوا چھاگل میں پانی کو سرد رکھتی ہے۔ تاہم پھر بھی برف توڑ توڑ کر خوب کھائی۔ حبشی معترض بھی ہوا کہ پانی ٹھنڈا ہے تو برف کیوں خراب کرتے ہو لیکن محض پانی سے تسکین نہ ہوئی۔ اس جگہ نصف گھنٹے کے قریب ٹھیر کر روانہ ہوگئے۔ ہمارا شوفر فیشن ایبل ہے۔ ہم کو اپنے پاس سے سگریٹ پلاتا جاتا تھا۔ بات چیت اشاروں میں رہتی ہے۔ گرم ہوا سے تکلیف ہونے لگی اسلئے ہوا کے رخ پر پردے لگا دیئے۔

قاہرہ ڈیڑھ بجے کے قریب ہم قاہرہ پہونچے۔ سلیم بیگ یہاں پہلے آچکے تھے

اپنے سابقہ ہوٹل کا پتہ اُن کو معلوم تھا۔ وہیں چلے گئے۔ یہ ہوٹل قاہرہ کے ممتاز محلہ ازبکیہ میں ہے۔ اسکو برسٹل ہوٹل کہتے ہیں۔ عمارت بڑی اور ساز و سامان سے آراستہ ہے صرف قیام اور ناشتہ کے فی کس شاید سات شلنگ روزانہ دینے پڑے دونوں وقت کا کھانا اور سہ پہر کی چائے اس سے الگ ہے۔ جس وقت ہوٹل پہونچے گرمی اور موٹر کے سفر کی وجہ سے طبیعت کسل مند تھی۔ ہوٹل میں اسباب رکھوایا۔ منہ ہات دھویا۔ بھوک بھی معلوم ہورہی تھی۔ اسی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ انگریز مسافروں کو اس روز کے لئے ہم نے مہمان کرلیا۔ نہانے کو دل چاہتا تھا لیکن وقت نہ ملا۔ انگریز احباب اسی دن سب کچھ دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ صبح کی ریل سے دوسرے دن انکو پورٹ سعید جانا تھا۔

اہرام مصری

چار بجے موٹروں میں سوار ہوکر اہرام مصری دیکھنے گئے۔ جس زمانہ میں موٹریں نہیں تھیں لوگ اونٹوں اور گدھوں پر جایا کرتے تھے۔ اب بہت کم لوگ اس سواری کو اختیار کرتے ہیں۔ وہاں تک ٹرام بھی جاتی ہے۔ عید کا روز تھا اسلئے بازار میں کسی قدر غیر معمولی گھماگھمی تھی۔ اہرام مصری قاہرہ کے قریب ریتیلے میدان میں واقع ہیں۔ انکی تعداد بہت ہے لیکن تین مینار سب سے بڑے ہیں۔ یہاں جہاز کے اکثر مسافر ہم کو اونٹوں پر سوار ملے۔ موٹر سے اُترنیکے بعد کچھ دور ریت میں پیدل جانا پڑا۔ سوئز کی طرح یہاں بھی بعض لوگوں نے پریشان کیا۔ یہ لوگ اپنے کو ترجمان یا رہبر ظاہر کرکے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ لمبے لمبے چغے پہنتے ہیں بعض ترکی ٹوپی استعمال کرتے ہیں اور بعض شملہ باندھتے ہیں۔ مادری زبان عربی ہے۔ کام نکالنے کی غرض سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی ہے۔ آپ ہزاران کو ساتھ لینے سے انکار کریں یہ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑینگے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ چار پانچ آدمی ہو لئے۔ انکے ساتھ ہونے سے صرف ایک فائدہ ہوا یعنی پیاس کا جب زور ہوا تو ان ہی میں سے ایک شخص لیمونیڈ کی بوتلیں کہیں سے لے آیا مگر دام بھی

اس نے من مانے لئے۔ اہرام کے قریب ایک جگہ سایہ تھا۔ گرمی کی وجہ سے آرام لینے کی ضرورت تھی اسلئے کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے۔ وہاں سے چاروں طرف کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں ان میناروں کا بھی شمار ہے۔ جغرافیہ میں اہرام مصری کا ذکر پڑھا تھا اور یہ معلوم تھا کہ دنیا کے سات عجائبات میں انکو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اس تصور نے ایک قسم کی دلچسپی پیدا کردی۔ ورنہ بہت کم لوگ اس پتھر اور چونے کے تودہ کو دیکھکر خوش ہوتے ہونگے۔ البتہ ان ارباب فن کا ذکر نہیں جو چشم بصیرت سے ان چیزوں کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ اپنا قیمتی وقت صرف کرکے ان میناروںکی اصلیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ مگر معمولی سیاح کے لئے یہ عجائبات چنداں دلچسپ نہیں ہیں۔ نہ تو اس مقام پر کوئی فرحت ہوتی ہے اور نہ کوئی عجیب بات محسوس ہوتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں اگر کوئی جاہل سے جاہل آدمی آگرہ کا تاج محل دیکھے تو ضرور اسکے دل پر ایک خاص اثر ہوگا۔

برادر عزیزم غلام یزدانی صاحب (ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی) اس موقعہ پر بہت یاد آئے۔ وہ ہوتے تو ایک ایک نکتہ پر روشنی ڈالتے۔ ہمکو اتنی بات تو ضرور محسوس ہوی کہ جن لوگوں نے ان میناروں کو بنایا وہ بڑے باہمت اور مستقل مزاج تھے۔ یہ مینار در اصل مصر کے قدیم بادشاہونکی قبروں کے گنبد ہیں۔ اسوقت اندر جانیکی ممانعت تھی اور دروازہ پر سپاہی کھڑا تھا۔ ان میناروں میں سب سے اونچا مینار چار سو پچاس فیٹ بلند ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جن بادشاہونکی قبریں عجوبہ روزگار ہوں۔ انہوں نے کس شان وشوکت کے ساتھ زندگی بسر کی ہوگی۔ مگر اب انکے نام صرف قدیم تاریخوں میں باقی رہ گئے ہیں ؎

تار بافی میکند بر کاخ کسریٰ عنکبوت　　بوم نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

اسی مینار کے قریب ایک زبردست سو فیٹ اونچی پتھر کی مورت ہے جس کو

ابوالہول کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت قدیم مورت ہے جسکا جسم اور پنجے شیر ببر کے جسم اور پنجوں سے مماثلت رکھتے ہیں لیکن چہرہ اور سینہ عورت کا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک باشوکت مجسمہ ہے۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے کہیں کہیں شکستہ ہوگیا ہے۔ سر مغرب ہمارا قافلہ یہاں سے روانہ ہوا۔ ترجمان لوگوں کو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی۔ قریب ہی ایک اونٹ بیٹھا ہوا تھا۔ مسز لشائی نے چاہا کہ اونٹ کے قریب کھڑی ہوکر اپنی تصویر لوائیں مگر یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ اونٹ والے نے میم صاحب کے شوق کا اندازہ کرلیا۔ وہ پانچ شلنگ لئے بغیر اونٹ کے پاس بھی آنے نہیں دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک شلنگ پر راضی ہوا۔

یہاں سے روانہ ہوکر ہم محمد علی پاشا کی مسجد گئے جو قلعہ میں ہے راستہ میں کئی جگہ آبشورہ پیا۔ دن بھر کی گرمی نے پیاس میں زیادتی کردی تھی یہ مسجد شہر کے اندر بلند مقام پر واقع ہے۔ قلعہ میں انگریزی فوج رہتی ہے۔ مسجد عالیشان اور دیکھنے کے لائق ہے۔

تھیٹر میں ہنگامہ

مسجد دیکھنے کے بعد بازاروں میں پھرتے رہے۔ کھانا بھی بازار میں کھایا۔ رسٹوران میں بڑا مجمع تھا۔ ایک جانب موسیقی بھی ہو رہی تھی۔ انگریز مسافروں نے کچھ خرید و فروخت کی۔ رات کو ایک عربی تھیٹر میں گئے۔ سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور تماشہ بھی معمولی تھا۔ بیچ تماشہ میں ایک ہنگامہ ہوا۔ شاید کوئی شخص بلا ٹکٹ اندر آنا چاہتا تھا۔ مار پیٹ شروع ہوگئی۔ ہم لوگ تھیٹر کے باہر چلے گئے۔ پولس نے دو ایک آدمیوں کو پکڑ کر خوب کوڑے لگائے۔ تھوڑی دیر میں سکون ہوگیا۔ تماشہ دیکھکر ہم ہوٹل واپس آگئے۔ تکان غالب تھی اور نیند کا زور تھا۔ علی الصبح اٹھنا بھی تھا کیونکہ انگریز دوست پورٹ سعید جانیوالے تھے۔

ایک پریشانی صبح چھ بجے اِن کو اسٹیشن پر پہونچایا۔ وہاں ایک فکر پیدا ہوگئی جہاز پر سے ایک بہت بڑی پارٹی قاہرہ کی سیر کو کک کمپنی کی معرفت آئی تھی اس کمپنی نے خاص اپنے مسافروں کیلئے اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا تھا جو یقینی طور پر جہاز کی روانگی سے قبل مسافروں کو پورٹ سعید پہونچا دیتی ہمارے دوستوں نے کک کمپنی کا توسط اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے طور پر چلے آئے تھے۔ اگر معمولی ریل سے یہ لوگ پورٹ سعید جاتے تو جہاز کے ملنے میں احتمال تھا۔ کک کمپنی کا ایجنٹ پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس نے ہمارے دوستوں کو اسپیشل ٹرین سے جانیکی اجازت نہیں دی۔ یہ سب لوگ پریشان ہوئے اور بات بھی پریشانی کی تھی کیونکہ اس امر کا اطمینان نہ تھا کہ معمولی ریل سے وقت پر پہونچینگے۔ اگر نہ پہونچے تو پورے پندرہ روز پورٹ سعید پر دوسرے جہاز کے انتظار میں پڑے رہو۔ کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی اور اسپیشل ٹرین کی روانگی کا وقت قریب تھا۔ میری نظر جہاز کے ایک افسر پر پڑی جو مسافروں کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے میری سرسری ملاقات جہاز پر ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے حالات بیان کئے اور امداد چاہی۔ یہ آدمی بامروت تھا معلوم نہیں اس نے کمپنی کے ایجنٹ سے کیا کہا مگر اس نے ہمارے دوستوں کو اسپیشل میں جانے کی اجازت دیدی۔ مسٹر لشائی اور مسٹر کردک نے ہم سے یہ وعدہ کیا کہ لندن میں ہمارے قیام کیلئے کوئی اچھی جگہ معلوم کرکے ہم کو اطلاع دینگے۔ ہم نے برلن کا پتہ پر خط لکھنے کے واسطے کہدیا۔ اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل واپس آئے۔ گذشتہ دن ضرورت سے زاید گردش رہی تھی اسلئے آرام لینے کی ضرورت ہوئی۔ پورا دن ہوٹل ہی میں گزار دیا۔ شام کو نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔

قاہرہ کی تاریخ قاہرہ ایک دلچسپ شہر ہے۔ متعدد قدیم عمارتیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ دریائے نیل کے دائیں کنارہ پر یہ شہر واقع

ہوا ہے۔ آبادی اسکی سات لاکھ سے اوپر ہوگی۔ اس شہر کی ابتداء ساتویں صدی عیسوی کے درمیان اسطرح ہوئی تھی کہ خلیفہ دوم کے سپہ سالار عمرو ابن عباس نے مصر کو فتح کرکے اپنا مرکز اس جگہ قایم کیا۔ اُس وقت اس شہر کا نام الفسطاط رکھا گیا۔ روایت یہ بیان کیجاتی ہے کہ سپہ سالار موصوف نے اپنا خیمہ اس نواح میں نصب کرکے اسکندریہ کی جانب کوچ کیا اور اس شہر کو فتح کرنیکے بعد اس مقام پر واپس ہوئے۔ اسی زمانہ سے شہر کی ابتداء ہوئی۔ عربی زبان میں فسطاط خیمہ کو کہتے ہیں لہذا اس مناسبت سے یہ شہر موسوم ہوگیا۔ رفتہ رفتہ عالیشان مکانات اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ لیکن سنہ ۹۶۹ عیسوی میں ایک دوسرے عرب فاتح نے الفسطاط کے شمال و مشرق میں قاہرہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ سنہ ۱۵۱۷ء میں ترکوں نے اس شہر کو فتح کرکے تقریباً تین سو برس تک حکومت کی۔ درمیان میں نپولین بوناپارٹ نے مصر کو فتح کرکے قاہرہ پر قبضہ کرلیا۔ سنہ ۱۸۰۱ عیسوی میں انگریزوں کی مدد سے ترک دوبارہ قابض ہوئے مگر یہ حکومت پائدار ثابت نہ ہوئی۔ انگریزوں کا اثر روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ ترکوں کی حکومت باقی نہ رہی۔ اب اگرچہ مصری سلطنت ہے لیکن انگریزوں کا اثر قائم ہے۔ اس تاریخی کایاپلٹ کی وجہ سے فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی رائج ہے۔ مادری زبان عربی ہے۔

قاہرہ کے بازار

شہر کا ایک حصہ قدیم ہے جس کے بازار تنگ و عماریتیں بوسیدہ ہوتی جاتی ہیں لیکن دوسرا حصہ نسبتاً جدید ہے مثلاً ازبکیہ۔ اسماعیلیہ اور قصر الدبارہ۔ اس حصہ میں یوروپین وضع کی شاندار عمارتیں اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ ایک اور حصہ حال ہی میں تعمیر ہوا ہے بلکہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا۔ یہ قاہرہ جدید کے نام سے موسوم ہے۔ عالیشان عمارتیں اور وسیع سڑکیں ہیں۔ یورپ کی قربت اور موقع کی خوبی نے اس شہر کی ترقی میں

بہت کچھ حصہ لیتا ہے ہر سال ہزارہا سیاح یورپ و امریکہ سے یہاں آتے ہیں جنکی خاطر دکانوں میں کثرت سے ہر قسم کا مال بھرا پڑا ہے۔ کھانیکی دکانیں کثرت سے ہیں انتخاب میں دقت ضرور ہوگی۔ سگریٹ فروش ہر جگہ ملتے ہیں۔ ایک بڑا تختہ ہوتا ہے جسمیں انواع و اقسام کے سگریٹ کے بکس جما لیتے ہیں۔ یہ تختہ گلے میں لٹکا رہتا ہے سگریٹ کے ساتھ دیا سلائی کی چھوٹی سی ڈبیا مفت ملتی ہے۔ آبشورہ بیچنے والے بھی بازاروں میں پھرتے ہیں۔ کانچ کا ایک بڑا برتن مرتبان کی شکل کا ہوتا ہے اس میں ٹونٹی لگی رہتی ہے۔ مرتبان میں برف کا ٹکڑا آبشورہ کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ چمڑے کی مشک والا سقہ اب کم دکھائی دیتا ہے۔ دکاندار راستہ چلنے والوں کو بلاتے بھی ہیں۔ خرید و فروخت میں مسافر کو احتیاط چاہئے۔ کیونکہ قیمتوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ امریکن سیاحوں نے عادت بگاڑ دی ہے۔ ایک دکاندار مجھسے کسی چیز کی قیمت بہت مانگنے لگا میں نے اس سے کہا میں امریکن نہیں ہوں بلکہ ہندوستانی ہوں۔ اس نے بلا تکلف جواب دیا کہ پھر تو آپکے لئے دوسری قیمت ہے۔ یہی کیفیت قلیوں اور گاڑی والوں کی ہے۔ اجنبی آدمی کو لوٹنے کی فکر میں رہتے ہیں بکس لڑکے اکثر جوتا صاف کرنیکا سامان لئے پھرتے ہیں۔ آپکو ضرورت نہ ہو تو بھی وہ اصرار کرتے ہیں کہ پالش کروالو۔ یہاں کے بازاروں میں ایک نئی بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ پچاسوں آدمی لاٹری کے ٹکٹ فروخت کے واسطے لئے پھرتے ہیں۔ اور بہت اصرار کرتے ہیں۔ یہ ٹکٹ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔

لباس وغیرہ باشندوں کے تمدن اور معاشرت پر مغرب کا اثر روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ متوسط درجہ کے لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں البتہ ترکی ٹوپی کو استقلال کے ساتھ ابتک قائم رکھا ہے یہاں کی ترکی ٹوپی ہندوستانی ترکی ٹوپی سے کسی قدر اونچی ہوتی ہے۔ نرم ٹوپی پہننے کا

رواج نہیں ہے۔ قدیم وضع کا لباس ادنیٰ طبقہ میں زیادہ تر پایا جاتا ہے مسلمان عورتیں اگرچہ نقاب پوش ہیں لیکن یہ نقاب برائے نام ہوتی ہے۔ نصف حصہ چہرہ کا کھلا رہتا ہے۔ بقیہ نصف پر باریک کپڑے کی نقاب ہوتی ہے لیکن صورت پہچانی جاتی ہے۔ اس پردہ سے نہونا بہتر ہے۔ نقاب کو قائم رکھنے کیلئے ایک بدنما چیز ناک پر لگاتے ہیں جو لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اس پر سونیکا ملمع کر لیتے ہیں۔ برقعہ ہمیشہ سیاہ رنگ کا پہنا جاتا ہے۔ ہندوستانی عورتوں کی طرح رنگ برنگ کا برقع نہیں پہنتے۔ اکثر عورتیں پردہ ترک کر کے یوروپین لباس اختیار کر رہی ہیں۔ عوام میں سیاہ رنگ کے کپڑے کا رواج زیادہ ہے۔ کالے اور گورے دونوں رنگ کے آدمی پائے جاتے ہیں لیکن آنکھیں انکی خراب ہوتی ہیں۔ شاید ریگ کا اثر ہے۔ قدیم حصہ ہو یا جدید بازار میں ہر جگہ رونق اور گھما گھمی رہتی ہے۔

بے روزگار لوگ

یہاں ہر قوم و ملت کا آدمی ملتا ہے۔ اس شہر میں ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا ہے جن کا کوئی خاص پیشہ نہیں ہے۔ بازاروں میں آوارہ پھرتے رہتے اور اجنبی مسافر کو پریشان کرتے ہیں۔ ان سے راستہ پوچھنا بھی ایک عذاب ہے۔ ہمیشہ کسی مہذب آدمی سے رستہ پوچھنا چاہیئے۔ دو ایک دفعہ ہم کو تلخ تجربہ ہوا۔ قدیم وضع کے آدمی سے ہوٹل کا راستہ پوچھا۔ وہ ایک چکر کے راستہ سے لے گیا۔ اور اس محنت کے معاوضہ میں اچھی خاصی رقم مانگنے لگا۔ بڑی حجت کے بعد اسکو ٹالا۔ ایک دفعہ مجھکو ایک خاص قسم کے بسکٹ خریدنے تھے اور میں کسی بڑی دکان کی تلاش میں تھا۔ ملتی نہ تھی۔ آخرکار ایک قدیم وضع کے آدمی سے پوچھا۔ وہ بہت مستعدی کے ساتھ میرے ہمراہ ہولیا۔ دکان قریب ہی میں تھی۔ میں دکان کے اندر گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ داخل ہوا۔ بسکٹ خریدنے کے بعد میں ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ یہ شخص

ساتھ ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تم کو ہوٹل تک پہونچا دوں گا۔ میں نے کہا مجھکو راستہ معلوم ہے۔ تمہاری ضرورت نہیں اور تم نے جو امداد کی اس پر شکرگزار ہوں لیکن وہ باتیں بناتا ہوا میرے برابر چلنے لگا۔ ہوٹل پہونچنے پر وہ بھی اندر آ گیا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ اسکو باہر کردو۔ منیجر نے کہا کہ آپ نے ناحق اس سے راستہ دریافت کیا یہ اب کچھ لئے بغیر نہیں جائے گا۔ کسی قدر تکرار کے بعد وہ ایک شلنگ لیکر ہٹا۔ ایک دفعہ پیشاب خانہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔ رات کا وقت تھا جگہ اگرچہ قریب ہی میں تھی لیکن ہم کو پتہ نہ چلا۔ ایک آدمی ساتھ ہو لیا۔ جب ہم فارغ ہو کر باہر نکلے تو وہ شخص ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم نے اس کو کچھ دیا۔ مگر اسکی تشفی نہ ہوئی۔ وہ بہت زیادہ مانگتا تھا۔ بڑی دور تک اس نے ہمارا پیچھا کیا۔ کچھ اور دیکر اس سے جان چھڑائی۔

آثار قدیمہ

آثار قدیمہ میں زیادہ تر مساجد ہیں بعض اچھی حالت میں ہیں۔ جملہ مساجد کی تعداد دو سو سے اوپر ہوگی سب سے خوبصورت مسجد سلطان حسن ہے اس کے اندر سلطان کی قبر بھی ہے یہ مسجد ۱۳۵۹ء میں مکمل ہوئی اس کا ایک مینار (۲۶۷) فیٹ اونچا ہے گنبد کی بلندی (۱۸۰) فٹ ہے اس مسجد سے متعلق ایک مدرسہ بھی ہے۔ سب سے مشہور مسجد جامع ازہر ہے جسکی تعمیر ۹۸۰ء میں ہوئی۔ دروازہ پر نقش و نگار خوبصورت ہیں۔ اس مسجد کی شہرت یونیورسٹی کی وجہ سے ہے۔ دس ہزار سے زائد طالب علم یہاں پڑھتے ہیں ہندوستان سے بھی طالب علم یہاں آتے رہتے ہیں۔ اب جدید قواعد مرتب ہوئے ہیں زمانہ حال کے ضرورتوں کے مدنظر بہت کچھ اصلاح کر دی گئی ہے۔ مسجد المردانی ۱۳۴۰ء میں تیار ہوئی۔ اسکو سلطان الناصر کے خاصہ بردار نے بنوایا تھا ایک مدرسہ بھی اس سے متعلق ہے۔ مسجد احمد ابن طولون ایک قدیم مسجد ہے جسکی تعمیر ۸۷۶ء میں ہوئی

مصر کا ایک شربت بیچنے والا

Chandrakanth Press Hyd.

مسجد عمرو ابن عاص سب سے قدیم ہے۔ ۱۹ھ ۶۳۹ء میں فاتح مصر نے اسکو بنوایا اور اسکے نام سے موسوم ہوئی۔ اس مسجد کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلسل تین سال تک امساک باراں کی وجہ سے قحط رہا مسلمانوں۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس مسجد میں نماز استقاء پڑھی۔ دوسرے ہی روز خوب بارش ہوئی۔ ایک اور مسجد لایق تذکرہ ابراہیم آغا کی مسجد ہے۔ اس میں نیلے رنگ کی چینی کاری بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جامع ازہر کے قریب حضرت امام حسین کا مزار ہے سنا ہے کہ سر مبارک یہاں دفن ہے۔ عمارت اچھی اور آراستہ ہے قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ تلاوت قرآن کے واسطے کچھ لوگ منجانب سرکار مقرر ہیں۔ چند اور مقدس مقامات ہیں جو اہل اسلام کے واسطے موجب دلچسپی ہیں مثلاً اہل بیت سے۔ مزار حضرتہ زینب۔ مزار حضرت عائشہ و امام شافعی وغیرہ۔

مصری عجائب خانہ

مصری عجائب خانہ لایق دید ہے۔ یوں تو سینکڑوں نادر الوجود اشیاء اس مکان میں موجود ہیں جنکو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کیلئے عرصہ درکار ہے مگر چند خاص چیزیں ہیں جنکو ضرور دیکھنا چاہئے۔ فرعون کی لاش کے علاوہ توت عنخ آمون اور اسکی ملکہ کی لاش اس عجائب خانہ کی خاص چیزیں ہیں۔ توت عنخ آمون مصر کا ایک بادشاہ تھا جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس قبل فوت ہوا۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مرنیکے بعد انسان کی روح قبر کے اندر رہتی ہے اور اسکو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو انسان کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں اس اعتقاد کے مدنظر یہ لوگ قبر کے اندر ضرورت کی سب چیزیں رکھدیا کرتے تھے تاکہ روح کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ چوبی پتلوں پر رنگ وروغن کرکے کھڑا کردیتے تھے خیال یہ تھا کہ ان پتلوں میں انسانی روح عود کریگی اور یہ بادشاہ کی

روح کی خدمت کرینگے۔ جس رتبہ کا انسان ہوتا تھا اسکے لحاظ سے قبر آراستہ کیجاتی تھی۔ لاش کو ایک خاص مصالحہ کے ذریعہ ایسا محفوظ کر دیتے تھے کہ ہزاروں برس وہ اصلی حالت میں رہتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ اندر کی آلایش کو کسی طرح نکال لیتے اسکے بعد اسکو ریشمی دھجیوں سے لپیٹ کر چوبی صندوق میں محفوظ کر دیتے تھے ان صندوقوں پر مرنیوالے کی حیثیت کے مطابق نقش و نگار ہوتا تھا۔ اس قسم کی متعدد لاشیں عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہیں جن کو ممی کہتے ہیں۔ باحیثیت لوگوں کے واسطے مقبرے بھی بڑے بڑے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ اہرام مصری کو دیکھ لو۔ توت غنخ آمون کے گنبد سے بیش بہا سامان انواع و اقسام کا برآمد ہوا۔ یہ چیزیں عجائب خانہ میں محفوظ ہیں

کتب خانہ

ایک کتب خانہ سرکاری بہت اچھا ہے۔ قرآن شریف کے متعدد قدیم نسخے لایق دید ہیں۔ بہت سی قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں۔ اندرونی انتظام معقول ہے۔ جا بجا عربی میں نوٹس لگے ہوئے ہیں "ممنوع الحدیث معہ الخدم" یعنے ملازمین سے باتیں نہ کرو۔ اسی طرح باغوں میں یہ نوٹس لگے ہوئے ہیں "ممنوع قطف الظہور" یعنے پھول توڑنا منع ہے۔ ہندوستان میں اس قسم کے نوٹس انگریزی زبان میں لگائے جاتے ہیں۔ اس کا لحاظ مطلق نہیں رکھتے عوام زیادہ تر کس زبان سے واقف ہیں۔

ہم وطن لوگ

ہندوستان کے ایک صاحب قادیانی ملت کے یہاں مقیم ہیں۔ ایک اخبار اردو میں شایع کرتے ہیں۔ انہوں نے ہم کو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا۔ آدمی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ دو ہندوستانی طالبعلم ہم سے ملنے کی غرض سے ہوٹل پر آئے۔ ایک حیدرآباد کے ہیں اور دوسرے بنارس کے یہ دونوں جامع ازہر میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہاں کی رسم کے مطابق ہم نے قہوہ سے انکی ضیافت کی۔ یہ بغیر دودھ کے پیا جاتا ہے۔ کڑوی چیز ہے۔ اس ملک میں یہ رسم

عام ہے کہ جو ملنے آتا ہے اُسکو قہوہ پلاتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ یہ ہمارے ہاں کے پان کا قائم مقام ہے۔ مجھکو یہ چیز پسند نہیں مگر پینا پڑتا ہے۔

مصری پاشا

ایک مصری پاشا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک علمی انجمن قائم کی ہے جسکا دفتر ایک بڑے مکان میں ہے۔ یہاں کئی حضرات سے ملنا ہوا۔ ایک صاحب انگریزی جانتے تھے۔ اس مقام پر ہم دو دفعہ گئے۔ ہر دفعہ قہوہ پینا پڑا۔ پاشا بہت خلیق آدمی ہیں۔ قاہرہ میں انکی حیثیت ممتاز ہے۔ ان کا ایک لڑکا استنبول میں ہے اور دوسرا برلن میں زیر تعلیم ہے۔ پاشا نے ہمکو ان دونوں کے نام خط لکھکر دیئے۔ اور کہا کہ میں نے دونوں کو تاکید کے ساتھ علیحدہ بھی لکھدیا ہے۔ اگر یہ لوگ تمہاری خاطر مدارات نہ کریں تو مجھکو لکھنا میں انکی خبر لونگا۔ میری خواہش پر پاشا نے ایک رقعہ قاہرہ ہائی کورٹ کے منتظم کو بھی لکھدیا کہ انکو مکان عدالت کی سیر کرادو۔ اپنا ایک خادم بھی ساتھ کردیا کہ وہاں تک ہم کو پہنچادے۔ افسوس ہے کہ منتظم کو بات کرنیکی بھی فرصت نہ تھی۔ اہل مقدمات کا مجمع تھا۔ زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ عمارت وسیع اور عالیشان ہے۔

قاہرہ کے قریب ایک جگہ شبرہ ملد ہے۔ وہاں اس غرض سے گئے کہ دیہاتی زندگی دیکھیں۔ جاکر افسوس ہوا۔ بہت غلیظ جگہ ہے۔ لوگ بھی میلے کچیلے ہیں۔ لب سڑک پیشاب یا خانہ کرتے ہیں۔ کھانیکی دوکانیں اس قدر ناپاک کہ ایک منٹ بھی ٹھہرنیکو دل نہ چاہے۔

قاہرہ کا ایک مسلمان فوٹوگرافر

قاہرہ میں ایک مسلمان فوٹوگرافر کے ہاں تصویر کھینچوائی اور کچھ تصویریں دھلنے کو دیں۔ آدمی شریف ہے قہوہ یہاں بھی پینا پڑا۔ اسکی لڑکی نوجوان ہے لیکن پردہ مطلق نہیں کرتی۔ لباس بھی یورو پین پہنے

ہو رہی تھی۔ قہوہ لیکر جب آئی تو اس نے ہم کو مخاطب کرکے کہا "السلام علیکم" فوٹو گرافر اُجرت لینے سے انکار کیا وہ کہتا تھا کہ تم لوگ مسافر ہو اور مسلمان ہو اسلئے تم سے کچھ نہیں لونگا۔ ہم نے بہت اصرار کے ساتھ اُسکو اجرت دیدی۔ ان کا نام ریاض شہاطہ ہے

شراب خانے

قاہرہ میں شراب خانے کثرت سے ہیں۔ رات بھر اُنمیں ہنگامہ رہتا ہے۔ ایک روز نصف شب کے قریب غل و شور کی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ ہوٹل کی پشت پر ایک گلی تھی۔ کھڑکی میں سے اُسطرف دیکھا تو عجیب تماشہ نظر آیا۔ سڑک پر مار پیٹ ہو رہی تھی اور شراب کے برتن اِدھر اُدھر ٹوٹے پڑے تھے۔ چند لوگ نشہ میں چور آپس میں دست و گریباں ہو رہے تھے پولس موقع پر پہونچی اور کوڑے بازی شروع ہوئی۔ اس کے بعد کچھ آدمیونکو گرفتار کرکے ایک چھوٹی موٹر میں اوپر تلے لاد دیا۔ پولس کے دو تین سپاہی خود بھی سوار ہوئے۔ اب لطیفہ سنو کہ موٹر اپنی جگہ سے ہلتی نہیں۔ ہر چند شوفر اِنجن کو طاقت پہونچاتا ہے لیکن بے سود۔ بات یہ تھی کہ کوئی پچاس ساٹھ شرابی جمع ہوگئے اور اِن سب نے موٹر کو روک لیا۔ کئی ایک تو پہلو کے تختوں پر کھڑے ہوگئے اور کچھ لوگ موٹر کے پیچھے لٹکے ہوئے تھے۔ پولس نے کوڑے مار مار کر سب کو سیدھا کر دیا پھر بھی چار پانچ آدمی موٹر سے لپٹے ہوئے چلے بھی گئے۔

فاحشہ عورتوں کا بازار

چند بازار فاحشہ عورتوں کے ہیں۔ ان مقامات پر دیسی اور یوروپین دونوں قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ اجنبی آدمی کو تنہا ان مقامات پر جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ گلی کے داخلہ پر ایک سپاہی پولس کا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اجنبی مسافرونکو گلی کے اندر جانے سے روکتا بھی ہے۔

قاہرہ میں ہندوستان کی ڈاک امریکن اکسپرس کے ذریعہ ہمکو وصول

ہوئی۔یہاں پہونچنے کی اطلاع ہم نے مکان پر بذریعہ تار برقی دیدی تھی۔ تقریباً آٹھ روپیہ خرچ ہوئے۔ برادر مکرم مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا ایک دلچسپ خط یہاں وصول ہوا۔ بھائی صاحب کی ظرافت طبع کے کیا کہنے۔کسی موقع پر بھی اسکو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے جانیکے بعد ایک شعر ذہن میں آیا جو یہ ہے۔

کوئی جاکر بتانِ مغربی کو یہ خبر کردے
چلے ہیں تین مجنوں گھر سے اب دولہا میاں بنکر

شعر کی نزاکت آفرینی میں کوئی شبہ نہیں مگر خدا کرے کہ یہ مضمون شاعرانہ خیال کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ چلتے وقت حیدرآباد کے اسٹیشن پر جو گل پوشی ہوئی تھی۔ غالباً اس منظر نے برادر موصوف کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا۔ ہمارے زمانہ قیام میں ہوٹل کا مقیاس الحرارت دوپہر کو (۸۰) درجہ تک پہونچتا تھا۔ سنا ہیکہ جون اور جولائی میں گرمی زیادہ ہوا کرتی ہے لیکن پارہ (۹۰) ڈگری سے اونچا نہیں جاتا۔ دھوپ میں تیزی ہونیکی وجہ سے ہم لوگ ٹھنڈے سوٹ پہنتے رہے۔ مگر یہاں سے روانگی کے دن ٹھنڈے کپڑوں کو ایک سوٹ کیس میں محفوظ کرکے امریکن اکسپرس کے حوالہ کردیا اور یہ ہدایت دیدی کہ ہم کو واپسی کے وقت پورٹ سعید پر سوٹ کیس ملجائے۔ اس کام کے معاوضہ میں کمپنی کچھ فیس بھی لیتی ہے جو زیادہ نہیں ہوتی۔ البتہ کنجی ان کے حوالے کردینی پڑتی ہے۔ اس کمپنی کی معرفت ہم نے بیت المقدس تک تین ٹکٹ درجہ دوم کے خرید لئے۔ کرایہ فی شخص دو پونڈ اٹھارہ شلنگ ہوا جو پینتالیس روپیہ سکہ عثمانیہ کے قریب ہوتا ہے۔ مصری پونڈ انگریزی پونڈ سے قیمت میں کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک پونڈ کے سو پیاسٹر ہوتے ہیں۔ ایک پیاسٹر ڈھائی آنے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سکہ چاندی کا ہے اسکے علاوہ تانبے کے پیسے بھی چلتے ہیں۔

قاہرہ سے بیت المقدس کو روانگی

پندرہ مئی کو شام کے چھ بجے ریل قاہرہ سے روانہ ہوئی۔ اسٹیشن پر ہمارے قادیانی دوست اور دونوں ہندوستانی طالب علم خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ مسافروں کی کثرت تھی۔ رات کو سوا نو بجے کے قریب قنطرہ پہونچے۔ یہاں مصر کی ریل ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں نہر سوئز حائل ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی نہر تقریباً اسی میل لمبی ہے صرف دو ایک مقامات پر اس قدر چوڑی ہے کہ دو جہاز وقت واحد میں گزر سکتے ہیں مگر ایسے موقع پر ایک جہاز کھڑا ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۶۹ عیسوی میں اس نہر کا افتتاح ہوا تھا۔ ایک فرانسیسی انجینیر کی کوشش اور اہتمام سے یہ نہر تیار ہوئی۔ سنہ ۱۸۷۵ء میں خدیو مصر نے اپنی جائداد کو فروخت کیا جسکے سلسلہ میں نصف نہر کے قریب حکومت انگریزی نے خرید لی۔ اسی نہر کی برکت ہے کہ ہندوستان سے یورپ کو پندرہ روز کے اندر پہونچنا ہو جاتا ہے۔ نہر کے جنوب میں بحر احمر اور شمال میں بحر روم ہے اس نہر نے دونوں سمندروں کا اتصال کر دیا ہے۔ ہم نے ایک اسٹیمر کے ذریعہ تھوڑی سی دیر میں اسکو عبور کر لیا۔ فلسطین کی سرحد پر پاسپورٹ اور سامان دیکھا گیا۔ کنارہ پر ریل تیار ملی۔ دو دو برتھ کے چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ تھے ہم تین آدمیوں کے علاوہ ایک مسافر اور تھا۔ رات کو سونیکی تکلیف رہی۔ ایک سوزنی ساتھ تھی۔ دو آدمی اسکو بچھا کر فرش پر سو گئے۔

لد

صبح سات بجے کے قریب لد جنگشن پہونچے۔ یہاں ریل تبدیل کیجاتی ہے۔ اسٹیشن پر چائے پی اور کچھ کھایا۔ یہاں دو ایک آدمی حسب معمول پیچھے پڑے کہ بیت المقدس میں قیام کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ انہوں نے رفرش منٹ روم میں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ چائے میں بھی شریک ہو گئے۔ ایک شخص نے تو اسی وقت قدس کے کسی ہوٹل کو تار بھی دیدیا کہ تین مسافر تمہارے ہاں ٹھہرینگے

ہم نے کوئی وعدہ قطعی کسی سے نہیں کیا۔ یہی جواب دیتے رہے کہ جہاں آرام ملیگا وہیں ٹھہرینگے۔ یہاں کے لوگ بیت المقدس کو قدس کہتے ہیں۔

لد سے ہماری ریل لیٹ ہوگئی۔ بجائے سوا نو بجے کے ہم گیارہ بجے کے قریب قدس پہونچے۔ لدا اور قدس کے درمیان قدرتی مناظر اچھے تھے۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر ٹوکریوں میں شہتوت بک رہے تھے۔ ایک ٹوکری ہم نے بھی خرید لی۔ یہاں کا شہتوت بڑا ہوتا ہے۔

بیت المقدس کے ترجمان

دو اسٹیشن پہلے سے کچھ ترجمان ریل میں آئے۔ ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ اسکے توسط سے سیر کیجائے اور اسکے بتائے ہوئے ہوٹل میں قیام کیا جائے۔ کئی ایک آدمیوں کو ہم نے ٹالدیا۔ لیکن ایک ترجمان ہمارے درجہ میں بیٹھ گیا۔ سگریٹ سے ہماری تواضع کی۔ انگریزی جانتا تھا۔ گورے رنگ کا نوجوان آدمی ہے۔ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ خوش پوش اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسکو اپنے پیشہ کے متعلق اچھے ڈھنگ معلوم تھے جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں تو اُس نے یہودیوں کی مذمت شروع کی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ خود عیسائی ہے۔ بار بار کہتا تھا کہ مسلمان اور عیسائی آپس میں دوست ہیں۔ یہودی ہمارے دشمن ہیں۔ نہ تو ان کے ہوٹل میں ٹھیرنا چاہئے اور نہ اس قوم کا ترجمان لینا چاہئے۔ ہم بالکل انجان رہے۔ قدس کے اسٹیشن پر اور بھی ترجمان ملے۔ کسی ہوٹل کے ملازم نے ایک تار پیش کیا جو ایک احمق نے لد سے دیدیا تھا۔ ہم نے بھی جواب دیا کہ ہم کو اسکی خبر نہیں اور نہ ہم اسکے پابند ہو سکتے ہیں۔ اسٹیشن سے باہر نکلے تو عجیب مصیبت اور کشمکش میں گرفتار ہوئے۔ ترجمانوں اور ہوٹل کے ملازموں نے ناک میں دم کردیا۔ اسباب ہمارا تتر بتر ہوگیا۔ یہ لوگ من مانے اپنی اپنی گاڑیوں میں رکھنے لگے۔ بہت وقت ضایع ہوگیا۔ ہم کو جلدی اسلئے تھی کہ جمعہ کی

نماز کیلئے تیار ہونا چاہتے تھے۔ مشکل تمام سامان کو ایک جگہ کیا اور ایک وکٹوریہ گاڑی کرایہ پر ٹھہرائی۔ ریل میں ایک شخص سے ہم کو اولیویٹ ہوٹل (.OLIVET) کا پتہ معلوم ہوا تھا۔ سیدھے وہاں چلے گئے۔ اسٹیشن سے قریب تھا۔ عیسائی ترجمان جو ریل میں ہمارے پاس بیٹھ گیا تھا۔ پیچھے پیچھے یہاں بھی آیا لیکن ہوٹل کے باہر کھڑا رہا۔ معلوم ہوا کہ ہوٹل والے اس ترجمان کے خلاف ہیں۔ ہوٹل کا مالک عیسائی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایکدوسرے ترجمان کو مقرر کر دینگے وہ آپ کو سیر کرا دیگا۔ اس آدمی کو ہم اندر نہیں آنے دیتے۔ ہوٹل والے کی ضد ہم کو ناپسند تھی۔ اس سے ہم نے صاف صاف کہدیا کہ ہم ان شرائط کے ساتھ ہوٹل میں ٹھیرنا پسند نہیں کرتے جسکے ذریعہ سہولت معلوم ہوگی سیر کریں گے۔ اس معاملہ کو ہوٹل سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے۔ اسپر وہ خاموش ہو گیا۔ ترجمان کو ہم نے یہ کہکر ٹالدیا کہ اسوقت ہم کو نماز کی جلدی ہے تم پھر کسی وقت ملنا۔

ہوٹل

ہوٹل خاصا آرام دہ ہے۔ کھانا بھی اچھا تھا۔ دو نوجوان عیسائی عورتیں کھانا کھلانے پر مقرر ہیں۔ تیسری عورت دھوبن ہے ہوٹل کا کرایہ فی شخص (۸) شلنگ روزانہ تھا۔ ایک شلنگ تقریباً ۱۲ ار سکہ عثمانیہ کے برابر ہوتا ہے۔ حتی المقدور جلدی کر کے غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ اور نماز جمعہ کی غرض سے بیت الحرم گئے۔ جس وقت ہم وہاں پہونچے لوگ نماز سے فارغ ہو کر نکل رہے تھے معلوم ہوا کہ ساڑھے گیارہ بجے یہاں نماز ختم ہو جاتی ہے بہت افسوس ہوا۔ الٹے پاؤں ہوٹل کو واپس ہوئے۔ ترجمان صاحب خدا معلوم کہاں سے تاک لگائے کھڑے تھے فوراً ساتھ ہو گئے۔ ان کو پھر ٹالدیا کہ اب فرصت نہیں ہے۔ کسی اور وقت ملنا ہوٹل آکر کھانا کھایا۔ گزشتہ رات ریل میں جو تکلیف رہی اسکی وجہ سے تکان تھی تین گھنٹے خوب سوئے۔ ہوٹل کی پشت پر اچھا نظارہ ہے۔ بڑی بڑی جدید عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں کشادہ اور اچھی سڑکیں نکلی ہیں۔ سنا ہیکہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں انگریزوں نے

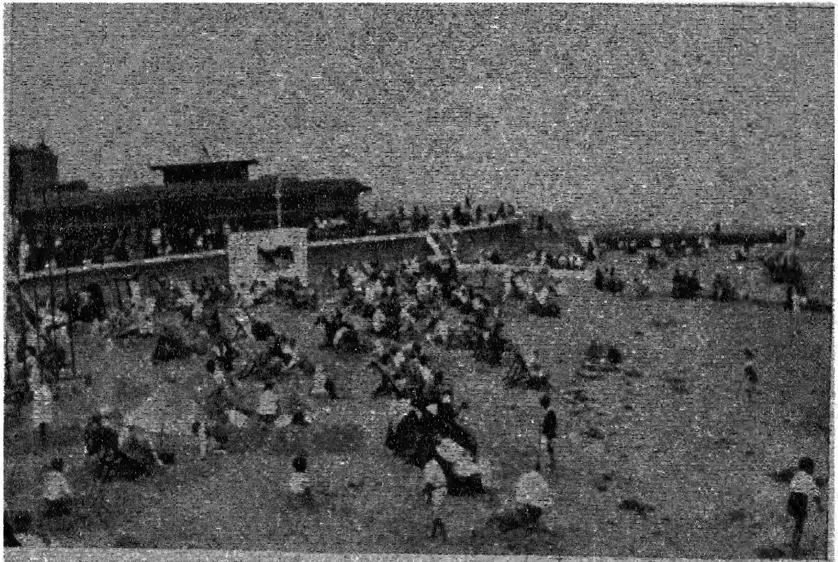

انگلستان میں نہانے کا ایک مقام

بیت المقدس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ تمام دن سردی رہی۔ حیدرآباد کا انتہائی جاڑا معلوم ہوتا تھا مگر یہ کیفیت قائم نہ رہی۔ بعد گرمی بھی ہوئی۔ شام کو چائے سے فارغ ہو کر سیر کے واسطے نکلے۔ ہوٹل کے باہر حضرت ترجمان بے زبان کھڑے ہوئے تھے۔ ہم کو انکی مستقل مزاجی بہت پسند آئی۔ یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں کی سیر بلا کسی رہبر کے نہیں ہو سکتی۔ آخر کار اس سے معاملہ طے کیا۔ دو روز میں ضروری مقامات دکھانے کا اس نے وعدہ کیا۔ تصفیہ چار پونڈ پر ہوا جس میں موٹر اور محنتانہ سب شریک تھا۔ صبح موٹر لانے کے واسطے ہم نے اس سے کہدیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسوقت بھی ہمارے ساتھ رہے لیکن ہم نے ٹالدیا۔ شہر میں دو ایک مقامات پر موٹر کے کرایہ وغیرہ کا حال دریافت کیا معلوم ہوا کہ ہم نے سودا سستا کیا ہے۔ ہوٹل والا زیادہ مانگتا تھا۔ ہمارے ترجمان نے ہوٹل والے کی ضد میں اپنا نرخ کم کر دیا۔

تاریخی حالات

بیت المقدس کو اگر تاریخی پہلو سے دیکھا جائے تو دنیا میں اس نوعیت کا دوسرا شہر نہ ملیگا۔ مسلمان۔ عیسائی اور یہود یہ سب اسکو اپنا متبرک مقام مانتے ہیں۔ اسی مقام پر حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمان نے بنی اسرائیل پر حکومت کی۔ یہیں پیدا بھی ہوئے۔ حضرت موسیٰ کا وطن بھی یہی سرزمین ہے۔ اسی نواح میں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق یہیں انکا مزار بھی ہے۔ نبی آخر الزماں یعنے پیغمبر اسلام پر معراج یہیں سے ہوئی۔ بھلا ایسا مقام متبرک کیوں نہ مانا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تقدس کی آڑ میں بڑی بڑی خونریزیاں ہوئیں۔ عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ برسوں آپس میں لڑتے رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے (۶۴) سال پہلے رومیوں نے بنی اسرائیل کو شکست دیکر اس شہر میں اپنا قبضہ کر لیا۔ یہودیوں نے کئی دفعہ بغاوت کر کے اپنا ملک رومیوں سے واپس لینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ رومیوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اچھے اچھے مکانات اور عبادت گاہ بنائے۔ قاعدہ ہے کہ زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا

رومۃ الکبرا کا ستارہ گردش میں آیا اور اسکو مسلمانوں کے ساتھ جنگ آزمائی کرنی پڑی۔ یرموک کی خونریز لڑائی نے عربوں کے واسطے بیت المقدس کا راستہ کھولدیا۔ یہ جنگ بھی تاریخ اسلام میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ اُس زمانے کے مسلمانوں کی شجاعت۔ استقلال اور ہمت کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ لشکر اسلام میں (۳۵۰۰۰) سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ دشمن کی فوج دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) سے کم نہ تھی۔ ماسوا اس کے رومیوں نے بھی جان توڑ لڑائی کا ارادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے اپنے کو پابہ زنجیر کرلیا تاکہ میدان جنگ سے بھاگ نہ سکیں۔ حالت جنگ میں کئی دفعہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس موقع پر عورتوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ مردوں کو غیرت دلا کر ان کو جوش میں لاتی تھیں۔ اسلام کے مشہور سپہ سالار خالد ابن ولید۔ ابو عبیدہ اور عمرو ابن عاص وغیرہ نے حسب عادت غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ صرف تین ہزار آدمیوں کے نقصان سے مسلمانوں نے فتح پائی۔ ۶۳۷؁ء میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور عیسائیوں نے اطاعت قبول کی۔ جبتک عربوں کی حکومت رہی عیسائیوں کو شکایت پیدا نہ ہوئی لیکن ترکوں کے زمانہ میں خصومت کا آغاز ہوا۔ عیسائیوں کو شکایت رہی کہ زائرین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ یہی چیز جنگ صلیبی کے واسطے بہانہ ہوگئی۔ چنانچہ ۱۰۹۹؁ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا لیکن سلطان صلاح الدین نے ۱۱۸۷؁ء میں نمایاں فتح حاصل کرکے حکومت اسلام کو دوبارہ قایم کیا۔ اس کے بعد تقریباً تین سو برس تک سلاطین مصر نے حکومت کی مگر ۱۵۱۷؁ء میں بزمانہ سلطان سلیم اول ترکوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا جنکی حکومت جنگ عظیم تک باقی تھی۔ ڈسمبر ۱۹۱۷؁ء سے یہ ملک سرکار انگریزی کی نگرانی میں ہے۔

حرم شریف

۱۷ مئی کو صبح کے وقت ہمارے ترجمان صاحب وقت مقررہ پر آگئے۔ سب سے پہلے حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک

وسیع احاطہ ہے جس میں متعدد متبرک آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں لیکن سب سے اہم دو عمارتیں ہیں۔ قبتہ الصخرا اور مسجد اقصٰے۔ عام طور پر داخلہ جس دروازہ سے ہوتا ہے اس کو باب الخطامین کہتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ بعض ناواقف لوگ قبتہ الصخرا کو مسجد عمرؓ سے موسوم کرتے ہیں۔ دراصل یہ غلط فہمی پر مبنی ہے البتہ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس گنبد کو کس نے بنایا۔ زمانۂ قدیم میں اس جگہ یہودیوں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی جس کی ابتداء حضرت داؤد کے زمانہ میں ہوئی لیکن حضرت سلیمان نے اس کو تکمیل کیا۔ اس عمارت کا اب نام و نشان باقی نہیں ہے لیکن اس مقام پر مسلمانوں نے یہ گنبد تعمیر کیا۔ یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو عبادت گاہ حضرت سلیمان نے اس جگہ بنائی تھی اس کا احترام مسلمان بھی کرتے تھے۔ چنانچہ شروع زمانہ میں کچھ عرصہ تک پیغمبر خدا صلعم بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اسکے بعد وحی نازل ہوئی کہ خانۂ کعبہ کی طرف منہ کرلیا کرو۔ (ملاحظہ ہو سورۂ بقر۔ رکوع (۱۶))

قبتہ الصخرا

عرب مورخین کا بیان ہے کہ سلطان عبدالملک بن مروان نے اس گنبد کو تعمیر کیا تھا اور اسی پر غلبۂ آرا ہے لیکن گنبد کے اندر ایک کتبہ بہ خط کوفی یہ خبر دیتا ہے کہ ۷۲ھ ہجری مطابق ۶۹۱ء میں گنبد کی تعمیر ہوئی مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس کتبے میں بانی کا نام عبداللہ الامام المامون دیا ہوا ہے جن کا زمانہ حکومت ۸۱۳ء میں شروع ہوا۔ تواریخ کے اس اختلاف کی وجہ سے کتبے کی صحت پر اعتبار نہیں ہوسکتا۔ ماسوا اسکے کتبے کے پتھر کا رنگ بھی عمارت کے دوسرے پتھروں کی رنگ سے مطابق نہیں ہوتا پس ہر طرح قیاس سلطان عبدالملک کے حق میں قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس گنبد کی تعمیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ خاندان بنی امیّہ کا داخلہ کعبہ شریف میں ممنوع ہوگیا تھا۔ سلطان عبدالملک کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے حدود ارضی میں ایک عبادت گاہ اس رتبہ کی قائم کریں کہ مرجع خلایق عام ہوجائے

دروازہ کی بالائی چوکھٹ پر جو کتبہ ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماموں رشید کے زمانہ میں گنبد کی مرمت ہوئی تھی۔ قبتہ الصخرا کی پوری عمارت ایک وسیع چبوترے پر ہے جو سطح زمین سے دس فیٹ بلند ہے۔ چبوترے کے کنارے سیڑھیوں کے ختم پر خوبصورت اور عالیشان کمانیں بنی ہوئی ہیں جن کو عربی میں موازین کہتے ہیں اور عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن میزان عدل ان ہی کمانوں میں لٹکائی جائے گی۔ گنبد ہشت پہل ہے جس کا ہر پہلو (۶۶) فیٹ بلند ہے۔ دیوار کے ذیلی حصہ میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے لیکن کھڑکیوں سے اوپر رنگین چینی کی اینٹیں خوش اسلوبی کے ساتھ پیوست کیگئی ہیں۔ گنبد کے چاروں طرف دیواروں پر قرآن شریف کی آیات خط طغرا میں بہت خوبی کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں۔ اس عمارت میں چار دروازے اور متعدد کھڑکیاں ہیں شمالی دروازے کو باب الجنت۔ مغربی کو باب الغرب۔ جنوبی کو باب القبلہ اور مشرقی کو باب داؤد یا باب السلسلہ کہتے ہیں۔ ہمارا ترجمان عیسائی ہونیکی وجہ سے گنبد کے اندر نہ جاسکا۔ ایک عرب شیخ قدیم وضع کے لباس میں ہمارے ساتھ ہوگئے انہوں نے اندر لیجا کر سب کچھ بتایا گنبد وسیع اور آراستہ ہے۔ قطر اس کا (۵۸) گز کے قریب ہے۔ قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر اعلیٰ درجہ کی پچی کاری ہے اور قرآن شریف کی آیات بخط کوفی سنہری حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ آرائش بہت دل آویز ہے ستونوں کی دو قطاروں نے گنبد کو تین درجوں میں تقسیم کردیا ہے۔ سنا ہے کہ اس عمارت کی آرائش میں سلطان صلاح الدین نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ گنبد کے بیچ میں مقدس چٹان ہے جس کے اطراف ایک رنگین چوبی دیوار ہے۔ چٹان کا طول (۵۸) فیٹ اور عرض (۴۴) فیٹ ہے۔ بلندی ساڑھے چھ فیٹ ہوگی۔ یہ چٹان اندر سے کھوکھلی ہے۔ روایت ہے کہ اس مقام سے آنحضرت صلعم کو معراج حاصل ہوئی اور اس جگہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو قربانی میں دینا چاہا مگر

عیسائی لوگ اس مقام کی نشاندھی اپنے گرجا میں کرتے ہیں مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت اسمٰعیل مکہ معظمہ کے قریب مقام مینا پر قربانی میں دیئے گئے۔ چٹان کے اندر پتھر کی بنچیں بنی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت داؤدؑ۔ حضرت سلیمانؑ و حضرت ابراہیمؑ عبادت کیا کرتے تھے۔ گنبد کے ایک جانب کچھ تبرکات محفوظ ہیں مثلاً موئے مبارک وغیرہ۔

باب السلسلہ کے سامنے ایک مختصر لیکن خوبصورت گنبد ہے جس کو قبتہ السلسلہ کہتے ہیں۔ سنا ہیکہ قدیم زمانہ میں یہاں ایک زنجیر لٹکی رہتی تھی جسکی تاثیر یہ تھی کہ اگر کوئی جھوٹا گواہ اسکو پکڑتا تو ایک کڑی ٹوٹ کر گر جاتی۔ قبتہ الععزا کے متصل شمال و مغرب میں قبتہ المعراج ہے۔ خانہ کعبہ سے بیت المقدس پیغمبر اسلام صلعم ایک رات میں پہونچے۔ اس سفر کی یادگار میں یہ گنبد تعمیر ہوا۔ قرآن شریف میں بھی اس سفر کا حوالہ موجود ہے (سورۃ بنی اسرائیل۔ رکوع پہلا۔ آیت پہلی۔)

قریب میں ہی چند چھوٹے چھوٹے گنبد اور ہیں مگر سب کے حالات لکھنا خالی از طوالت نہیں البتہ جنوب میں ایک خوبصورت حوض لائق تذکرہ ہے۔ اسکو ملک الاشرف ابوالنصر قائت بے نے بنوایا تھا چنانچہ اس حوض کو سبیل قائت بے کہتے ہیں۔ جنوب مشرق میں ایک منبر ہے جسکو قاضی برہان الدین نے بنوایا تھا۔ اسکے خوبصورت ستون اور کمانیں عربی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔

مسجد اقصےٰ یہاں سے فارغ ہوکر مسجد اقصےٰ میں گئے جو بالکل مقابلے میں ہے۔ اسکو اقصےٰ اسلئے کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں مکہ معظمہ سے بعید ترین مسجد یہی تھی۔ عمارت وسیع اور شاندار ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک قدیم عبادت گاہ ہے جس کا سنگ بنیاد قیام کعبہ سے صرف چالیس سال بعد رکھا گیا تھا اسکو مسلمانوں نے مسجد کرلیا سلطان عبدالملک نے مسجد کے دروازوں پر سونے چاندی کے پتر چڑھوائے جنکا جو

اب نہیں ہے۔ سلطان ابوجعفر المنصور کے زمانہ میں زلزلہ سے پہلی دفعہ جب اس مسجد کو نقصان پہونچا تو اسکی مرمت کے واسطے وہ قیمتی دھات جو آرائش کی غرض سے اسمیں لگے ہوئے تھے سکہ کی شکل میں تبدیل کر لئے گئے۔ دوسرے زلزلہ نے پھر کچھ حصہ منہدم کر دیا جسکی مرمت سلطان المہدی نے کسی قدر تغیر کے ساتھ کر دی۔ مگر امتداد زمانہ اور زلزلوں کے جھٹکوں نے عمارت کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اندر کے چوبی کھم اور شہتیر بھی بوسیدہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک مجلس انتظامی قایم ہوئی۔ اسلامی طریقہ تعمیر کے ماہر فن جمع ہوئے اور تصفیہ یہ ہوا کہ اصل عمارت کو قائم رکھکر اسکی بنیادوں کو مضبوط کر دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور بھی کام مسجد کے اندرونی حصہ میں تکمیل طلب تھے اس مجلس نے ممالک اسلام میں چندہ کیلئے وفد روانہ کئے۔ بہت کچھ کامیابی ہوئی خود ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیحضرت حضور نظام نے گراں بہا چندہ عنایت فرمایا۔ مرمت کا کام ابھی تک جاری ہے۔ مسجد کی اندرونی آرائش نے ہم کو محو حیرت کر دیا۔ پہلو کے حصوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اصل مسجد (۸۸) گز لمبی اور (۶۰) گز چوڑی ہے۔ گنبد کی سنہری زمین پر نفیس پچی کاری نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے یہ کام سلطان صلاح الدین کے زمانہ کا ہے۔ اسی وقت کی بنی ہوئی ایک محراب جانب جنوب سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں پر قائم ہے۔ خط کوفی میں دیوار پر قرآن شریف کی آیات اور رنگین پھول پتوں کی بیل عمارت کی شان کو دوبالا کرتی ہیں مسجد کے شمالی حصہ میں دروازہ کے قریب حضرت موسیٰ کے بھتیجوں کی قبریں ہیں۔ جنوب میں محراب کے قریب نہایت خوبصورت چوبی منبر ہے جس پر ہاتھی دانت اور سیپی کا کام عرب دستکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ منبر سلطان نورالدین نے بنوایا تھا۔ جنوب مغربی گوشہ میں ایک حصہ عمارت کو مسجد عمر کہتے ہیں۔ حرم الشریف کی مشرقی دیوار پر سے وادی النار اور جبل الزیتون کا منظر دیکھنے کے لائق ہے۔ کہتے ہیں کہ قیامت کے روز

اس مقام پر عدل کیا جائے گا پیغمبر اسلام جبل الزیتون پر اور حضرت عیسٰی حرم الشریف کی دیوار پر بیٹھیں گے۔ درمیان میں ایک باریک تار باندھا جائے گا۔ جو گنہگار ہیں وہ وادی النار میں گر جائینگے اور جو اچھے ہیں وہ اس تار پر سے تیزی کیساتھ گزر جائینگے۔

(واللہ عالم بالصواب)

بیت الحرم کی دونوں عمارتیں اچھی حالت میں رکھی گئی ہیں۔ دیکھکر دل خوش ہوتا ہے عیسائیوں کے مقامات کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ احاطہ کے ایک گوشہ میں مجلس انتظامی کا دفتر ہے۔ بیت الحرم کی پوری نگرانی اس مجلس سے متعلق ہے۔ یہاں کچھ دیر ہم بیٹھے۔ قہوہ سے ہماری تواضع کیگئی۔

حمام الشفا

حرم الشریف کی زیارت سے فارغ ہوکر اسکے شمالی مشرقی دروازے باب الناظر سے ہم باہر نکلے۔ کچھ دور جانیکے بعد ایک بازار میں پہونچے جسکو ہم سوق القطانین کہتے ہیں۔ یہاں ایک محصور چشمہ گنبد کے اندر ہے جسکو حمام الشفا کہتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس چشمہ کا پانی اکثر امراض کیواسطے صحت بخش ہے داخلہ کے دروازے کے قریب دیواروں پر دنیا کی ہر زبان میں اس چشمہ کے متعلق ایک روایت لکھکر جو کتے میں آویزاں کردیگئی ہے۔ چنانچہ اردو تلنگی اور مرہٹی وغیرہ میں بھی کیفیت لکھی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس روایت کا یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس چشمہ کے اطراف سینکڑوں بیمار اور معذور لوگ پڑے رہا کرتے تھے۔ ایک مقررہ وقت پر آسمان سے فرشتہ اترکر پانی کو ہلا دیا کرتا تھا۔ اس عمل کے بعد ہی سب سے پہلے جو آدمی اس چشمہ میں نہاتا اسکی شکایت دور ہوجاتی۔ ایک دن حضرت عیسٰی کا گذر اس جانب ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک لنگڑا آدمی یہاں پڑا ہوا ہے (جو ازتیس ۳۸ سال سے اس شکایت میں مبتلا ہے۔ اس سے حضرت نے دریافت کیا کہ تو چشمہ میں کیوں نہیں نہاتا۔ اس نے جواب دیا کہ مجبور ہونکہ ہر شخص اپنی فکر میں رہتا ہے۔

کوئی ایسا نہیں ہے جو ٹھیک وقت پر مجھکو چشمہ تک پہونچا سکے۔ حضرت کو اسکی حالت پر رحم آیا۔ فرمایا کہ اپنا بستر اٹھالے اور اپنے پاؤں سے چلتا ہوا جا۔ لنگڑا جو اٹھا تو پاؤں بالکل اچھے تھے۔ خوش خوش چلا گیا۔

جبل الزیتون

شام کو تین بجے کے قریب بسواری موٹر شہر کے باہر ایک پہاڑی پر گئے جسکو جبل الزیتون کہتے ہیں۔ سطح سمندر سے یہ پہاڑی تقریباً ڈھائی ہزار فیٹ بلند ہے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے آخری زمانہ سے متعلق اکثر روایات اس پہاڑی سے منسوب کیجاتی ہیں۔ بیت المقدس کا منظر اس پہاڑی سے قابل دید ہے۔ پہاڑی کے ڈھلاؤ پر انجیر اور خوبانی کے درخت جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ جبل الطور کے نیچے دامن کوہ میں بی بی مریم کا مزار ہے۔ قریب ہی میں ایک باغ ہے جس میں زیتون کے آٹھ درخت دیکھنے کے لائق ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے وقت سے چلے آتے ہیں۔ ان درختوں سے جو روغن نکالا جاتا ہے وہ بیش گراں قیمت پر فروخت ہوتا ہے اور انکے پھلوں کی گٹھلوں سے تسبیح کے دانے بنائے جاتے ہیں۔ اسی نواح میں حضرت داؤدؑ کا مزار ہے۔ گنبد معمولی ہے جسمیں کوئی خاص بات نہیں۔ سر مغرب شہر کی طرف واپس ہوگئے۔

عیسائیوں کا مشہور گرجا

شہر کے اندر عیسائیوں کا ایک بڑا مشہور گرجا ہے جسکو انگریزی میں (CHURCH OF THE HOLY SEPULCHRE.) کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا نام کنیسۃ الجنتہ ہے۔ اگرچہ ابتدا اسکی زمانہ قدیم میں ہوئی تھی مگر کئی دفعہ یہ منہدم ہوا اور بنتا رہا۔ قدیم عمارت کا کچھ حصہ اب تک باقی ہے۔ یہ عبادت گاہ بہت وسیع ہے اور اس کے اندر متعدد مقامات دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے روشن موم بتیاں ہاتھ میں لیکر جانا پڑتا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ داخلہ کے دروازے کی

کنجی ایک مسلمان دربان کے پاس رہتی ہے۔ یہ رسم قدیم سے چلی آتی ہے مسلم دربان دروازہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ گرجا کی نگرانی کے متعلق عیسائیوں کے متعدد فرقے آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ رفع فساد کی خاطر دربان مسلمان رکھا گیا ہے۔ عیسائیوںکا عقیدہ ہے کہ اسی مقام پر حضرت عیسیٰ کو سولی دیگئی اور کچھ عرصہ یہاں دفن رہنے کے بعد آسمان پر گئے۔ ایک تنگ و تاریک حجرے میں قبر کی نشاندھی کیجاتی ہے۔ دروازہ اس قدر چھوٹا ہے کہ کبڑے ہوکر اندر جاتے ہیں۔ گرجا کے ایک حصہ میں حضرت مریمؑ کی ایک بڑی مورت کانچ کے فریم میں محفوظ ہے۔ مورت پر بیش بہا زیورات زائرین کے چڑہائے ہوئے موجود ہیں۔ عمارت کا اکثر حصہ خراب حالت میں ہے۔ عیسائیوںکے فرقہ واری اختلاف کیوجہ سے مرمت کی نوبت نہیں آتی۔

دیوار گریہ

بیت الحرم کی ایک دیوار کی پشت کے کچھ حصہ کو دیوار گریہ کہتے ہیں۔ یہ دیوار (۵۲) گز طویل اور ساٹھ (۶۰) فیٹ اونچی ہے۔ بعض پتھر اس میں بہت بڑے ہیں۔ خاص خاص اوقات میں یہاں یہودیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ بالخصوص جمعہ کے دن کثرت سے آتے ہیں۔ مرد اور عورت یکساں طور پر اس دیوار کو بوسہ دیتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ بعض یہاں بیٹھکر اپنی مذہبی کتابیں پڑہتے ہیں اور گزشتہ شان و شوکت یاد کرکے اس کا ماتم کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ اس مقام پر کشت و خون ہوا تھا۔ تقریبًا پانچ سو یہودیوں کو مسلمانوں نے قتل کردیا۔ اور اس واقعہ کے بعد سے خصومت زیادہ ہوگئی۔ ہر وقت فساد کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ انگریزی فوج کے مسلح سپاہی یہاں پہرہ دیتے ہیں۔ ہم لوگ جسوقت پہونچے پہرہ موجود تھا۔ اس موقع پر ہمارے رہبر نے غالبًا ہم کو خوش کرنیکے لئے ایک احمقانہ حرکت کی۔ جھگڑے کے حالات بیان کرتے کرتے کہنے لگا کہ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے صرف پانچ سو یہودیوں کو مارا۔ اگر چاہتے تو ہزاروں کو

قتل کر دیتے۔ میں نے فوراً اس کو روک کر چپکے سے پوچھا کیا تم اس وقت دوسرا ہنگامہ کرانا چاہتے ہو۔ وہ اس اشارہ کو سمجھکر خاموش ہو گیا۔

الخلیل

بیت المقدس سے تقریباً تیس میل پر ایک مشہور زیارت گاہ الخلیل ہے جو سطح سمندر سے (۳۰۰۰) تین ہزار فیٹ بلند ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ اطراف کا منظر خوشنما ہے۔ یہاں زیادہ تر انگور اور خوبانی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اس قصبہ میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ مقام زیارت ایک عالیشان عمارت ہے جسکو حرم کہتے ہیں۔ داخلے کے دروازہ پر ایک عرب نگہبان نے ہم کو روکا کیونکہ ہم انگریزی لباس میں تھے۔ معلوم ہوا کہ عیسائیوں کو اندر جانے کی ممانعت ہے۔ ہمارے رہبر نے کہا یہ لوگ مسلمان ہیں مگر نگہبان کو یقین نہیں آتا تھا۔ ہم نے پاسپورٹ بتائے اور کلمہ بھی پڑھا۔ تب اندر جانے کی اجازت ہوئی۔ ترجمان چونکہ عیسائی تھا اسکو باہر ہی ٹھیرنا پڑا۔ اندر زائرین کا مجمع تھا۔ مسجد اور مزارات ایک ہی عمارت میں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور انکی بیوی حضرت سارہ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اور انکی بیویوں کے مزارات یہیں ہیں۔ عمارت کے باہر ایک دو منزلہ مکان میں حضرت یوسف کا مزار ہے۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ جماعت میں ہم بھی شریک ہوئے۔ رواج کے مطابق یہاں کے مجاوروں کو کچھ دیا۔ یہ لوگ زائرین کو گھیر لیتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔ بعد نماز ایک صاحب ملے جو کسی قدر اردو جانتے تھے۔ ان کا اردو جاننا ہمارے لئے موجب پریشانی ثابت ہوا۔ کچھ رقمی امداد کے خواستگار تھے۔ ہندوستان کے حالات پر گرم جوشی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ گاندھی جی کے متعلق سوالات کر کے ہماری رائے پوچھنے لگے۔ ہم نے ٹالنے کی خاطر کہدیا کہ بہت دنوں سے ہندوستانی اخبارات نہیں دیکھے۔ اسلئے کچھ معلوم نہیں مگر یہ حضرت پیچھے پڑ گئے۔ کہتے تھے کچھ نہ

کچھ ضرور بتائے۔ موٹر میں سوار ہونیکے بعد ان سے نجات ملی۔

بیت اللحم

واپسی میں بیت اللحم گئے۔ یہ حضرت عیسیٰ اور حضرت داؤد کی پیدائش کا مقام ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں یوروپین سیّاح ہم کو ملے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے مقام پر قدیم وضع کا گرجا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اس سے قدیم کوئی گرجا نہیں۔ دروازہ اس کا اس قدر نیچا ہے کہ جھک کر اندر جانا پڑتا ہے۔ اندھیرے کی مصیبت یہاں بھی ہے۔ گرجا کے اندر متعدد کمرے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا مقام ایک چھوٹے سے کمرے میں بتلایا جاتا ہے جس میں سنگ مرمر کا فرش ہے۔ دیواروں پر نقش و نگار کے آثار نمایاں ہیں

گرجا کے قریب پہاڑ کے دامن میں ایک غار ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بی بی مریم اور حضرت عیسیٰ نے یہاں پناہ لی تھی۔ اس وقت حضرت مریم کے دودھ کا ایک قطرہ یہاں گر گیا عیسائی مٹی کو متبرک خیال کرتے ہیں اور عقیدہ ہے کہ اس میں دودھ بڑھنے کی تاثیر ہے

بیت المقدس کے شمال مغرب میں ایک چھوٹا سا گاؤں النبی سمویل ہے یہاں حضرت اسمٰعیل کا مزار ہے۔ عمارت معمولی ہے لیکن قریب کے مینار پر سے اطراف کا منظر دلکش ہے۔

قدس کی آبادی

بیت المقدس کی آبادی (۷۰۰۰۰) ستر ہزار سے کچھ اوپر ہوگی۔ شہر میں یہودیوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن اطراف واکناف میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ شہر کے چاروں طرف ایک قدیم فصیل شکستہ حالت میں ہے جسکی بلندی چالیس فیٹ کے قریب ہوگی۔ اسمیں آٹھ دروازے اور متعدد برج ہیں۔ دروازوں کے نام یہ ہیں۔ باب السلطان عبد المجید۔ باب الخلیل۔ باب العمود۔ باب الظاہری۔ باب العصبات۔ باب المغربی باب النبی داؤد اور باب الدہر۔ شہر کا اصل حصہ قدیم حالت میں ہے۔

تنگ راستوں کے دونوں طرف پتھر کے مکانات ہیں۔ سنگ بستہ سڑک امتداد زمانہ کی وجہ سے ناہموار ہوگئی ہے۔ اکثر گلیاں اُوپر سے پٹی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں روشنی کے لئے کھول دیا ہے۔ شہر کا محل وقوع چند پہاڑیوں پر ہے جنکی وجہ سے نشیب و فراز ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ انتہائی بلندی سطح سمندر سے (۲۶۰۰) ڈھائی ہزار فیٹ کے قریب ہوگی۔ قرب و جوار میں غرباء کے مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں جنکی چھتیں دھابین کی ہیں۔ کاروبار زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں انگریزوں کا اثر قایم ہونے کے بعد سے تجارت میں ترقی ہوگئی۔ یورپ اور امریکہ کے سیّاح بہ کثرت آنے لگے ہیں۔ دوکانیں ہمہ قسم کے سامان سے مالامال ہیں۔ سیپ اور زیتون کی لکڑی کا سامان یہاں اچھا بنتا ہے۔ بازاروں میں مختلف اقوام کے لوگ مختلف لباس میں نظر آتے ہیں۔ مذہب کے پابند یہودی داڑھی اور زلفیں رکھتے ہیں اور اونچی اونچی ٹوپیاں خاص قسم کی پہنتے ہیں۔ لوگ عام طور پر لمبے لمبے چغے پہنتے اور کمر کے اطراف پٹکہ باندھتے ہیں۔ ترکی ٹوپی کا رواج زیادہ ہے۔ مسلمان عورتیں نقاب پوش ہو کر بازاروں میں نکلتی ہیں۔ ان کا پردہ مصر کی عورتوں کی نسبت زیادہ گہرا ہے۔ باہر سے چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ عورتیں بلا تکلف کاروبار میں مصروف رہتی ہیں۔ کیا خوب ہو جو ہندوستان میں بھی اس قسم کا پردہ رائج ہو جائے اور موجودہ چار دیواری کے پردہ سے ہمارے ملک کی عورتیں نجات پائیں۔ اکثر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہندوستان میں مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے چار دیواری کا پردہ مناسب ہے مگر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ ان ممالک اسلامی میں بھی جہاں نقاب کا رواج ہے غیر مسلم اقوام کثرت سے آباد ہیں۔ مسلمان عورتیں بلا کسی خوف و خطر کے کاروبار کرتی رہتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے

لوگ قدامت پسند ہیں۔ قدیم رواج کو قائم رکھنے کیلئے اسکی تائید میں کوئی نہ کوئی دلیل پیدا کر لیتے ہیں لیکن زمانہ کی رفتار اپنا اثر قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک روز وہ بھی آئے گا کہ ہماری عورتیں چار دیواری سے باہر نکل آئینگی۔ بحالت موجودہ پردہ کی جکڑ بندی نے انکی صحت کو خراب کر رکھا ہے۔ دھوپ اور تازہ ہوا سے بالکل محروم ہیں۔ ماسوا اسکے روزمرہ کے کام کاج میں ہر وقت بیرونی امداد کی محتاج رہتی ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

بحر لوط

شہر سے کچھ فاصلہ پر بحر لوط ہے جس کو انگریزی میں (DEAD SEA.) کہتے ہیں۔ یہ سمندر تقریباً (۴۷) میل لنبا اور دس میل چوڑا ہے۔ پانی اس کا اس قدر شور ہے کہ مچھلی اسمیں زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ اس کے کنارہ پہ کاشت ہو سکتی ہے۔ انگریز لوگ اس سمندر سے نمک نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قومی عناد

جس روز ہم بیت المقدس پہونچے عیسائیوں اور مسلمانوں کی دکانیں عام طور پر بند تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہودیوں کیساتھ جو جھگڑا ہوا تھا اسکی یادگار میں ہڑتال ہے۔ افسوس ہے کہ قومی عناد روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ایک روز بازار میں ایک اجنبی شخص نے راستہ روک کر مجھ سے سلام علیک کی اور سوال کیا کہ کیا تم مسلمان ہو۔ میں نے جواب میں کہا "الحمد للہ" اور دریافت کیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا میں عیسائی ہوں لیکن ہم لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہتا تھا کہ افسوس ہے کہ گذشتہ جھگڑے میں صرف پانچ سو یہودی مارے گئے۔ کم از کم پانچ ہزار تو مارے جاتے۔ میں نے اس کے ساتھ مزید گفتگو کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اس کو ٹالدیا۔ اصل یہ ہے کہ یہودیوں نے جو اثر موجودہ حکومت میں قائم کر لیا ہے۔ اس سے عیسائی اور

مسلمان دونوں خائف ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ خود اِن کے حقوق معرض خطر میں پڑ گئے ہیں۔ یہودیوں کا تموّل اس موقع پر بہت کچھ کام کر رہا ہے۔ دنیا میں روپیہ ہی تو اصل چیز ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل آتے ہیں۔ یہاں کے عیسائی اور مسلمان مفلس ہیں۔ مالدار فریق اکثر باتوں میں بازی لیجاتا ہے۔ شہر کے اندر آبادی بھی یہودیوں کی زیادہ ہے۔ پھر بھی جب کبھی موقع آجاتا ہے مسلمان اپنے قوتِ بازو کو استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور شبانہ روز بارگاہ خداوندی میں دست بدعا رہتے ہیں ؎

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب گبرو ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

زاویۃ الہنود

۱۹ مئی کو ہمارا قیام اس شہر میں ختم ہوا۔ ہندوستانی مسافروں کے واسطے جو ہوٹل میں قیام ناپسند کرتے ہیں ایک مناسب مقام حرم شریف کے قریب ہے جسکو زاویۃ الہنود کہتے ہیں۔ اصل میں یہ حضرت بابا فرید شکر گنج کا تکیہ ہے۔ ایک ہندوستانی بزرگ ناظر حسن نامی شیخ زاویہ ہیں۔ مسجد اقصےٰ سے دو پونڈ ماہانہ مجلس شرعیہ سے ساڑھے گیارہ پونڈ اور اوقاف سے تقریباً چار پونڈ۔ اسطرح ماہانہ سترہ پونڈ کے قریب اس زاویہ کی آمدنی ہے۔ شیخ الزاویہ چونکہ باسلیقہ آدمی ہیں اس قلیل آمدنی میں انتظام اچھا رکھتے ہیں۔ سکہ یہاں کا خاص ہے لیکن مصری اور انگریزی سکہ بھی چلتا ہے۔

بیت المقدس سے دمشق کو روانگی

بیت المقدس سے دمشق ریل کے علاوہ موٹر کے ذریعہ بھی جا سکتے ہیں۔ سڑک اعلیٰ درجہ کی بنگئی ہے۔ انگریزی حدود میں اس سڑک پر

ڈانبرڈالاجارہا ہے۔ ہم نے موٹر کا سفر اختیار کیا کیونکہ سواری اپنے قابو کی ہے اور مناظر کی سیر بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ ایک موٹر پانچ نشست والی کرایہ پر لیگئی (۴½) ساڑھے چار پونڈ کرایہ مقرر ہوا۔ بیت المقدس سے دمشق کا فاصلہ ایکسو تیس میل ہے۔ پروگرام صبح آٹھ بجے روانہ ہونیکا تھا۔ موٹر بھی ٹھیک وقت پر آئی۔ ہم لوگ سامان رکھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ چند انگریزی پولس کے افسر سامنے سے گذرے۔ موٹر کے نمبر پر انکی نظر پڑی۔ انہوں نے موٹر والے سے عربی میں کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد موٹر میں سوار ہو کر کہیں چلے گئے۔ موٹر والے نے اشارہ سے کہا کہ ابھی آتا ہوں۔ ہم حیرت میں تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہوٹل کے منیجر نے پولس کے دفتر کو ٹیلیفون دیا۔ معلوم ہوا کہ موٹر علاقہ لبنان کی ہے۔ غیر علاقہ کی موٹر بیت المقدس میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتی۔ یہ موٹر دو روز سے ٹھیری ہوئی تھی اسلئے ایک پونڈ جرمانہ دینا پڑا۔ جرمانہ ادا کر کے شوفر صاحب موٹر لیکر آئے۔ نو بجے کے قریب ہم روانہ ہوئے۔ راستہ میں مناظر قدرتی دلکش تھے۔ پہاڑیوں کے ڈھلاؤ پر کاشت کا انتظام بہت خوب ہے۔ پانی کو روکنے کیلئے کیاریاں درجہ بدرجہ اسطرح بناتے ہیں کہ دور سے یہ منظر بہت خوشنما ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں سے گذر ہوا۔

موٹر کی تیز رفتاری

شوفر کی لاپروائی سے کسی قدر تشویش پیدا ہوئی مخدوش مقامات پر بھی موٹر تیز چلاتا تھا۔ ہم اس کو بہت روکتے تھے لیکن وہ مذاق میں اڑا دیتا تھا۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے اشاروں میں بات چیت ہوتی تھی۔ آدمی خوش مذاق تھا۔ اسکے پہلو میں رفیق بیگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتًا نہ معلوم کیا خیال آیا کہ بڑی پھرتی کیساتھ رفیق بیگ کے سر سے انگریزی ہیٹ اتار کر خود پہن لی اور اپنی ترکی

ٹوپی ان کو پہنا دی۔ موٹر جا رہی تھی تیز۔ شوفر کی اس حرکت سے بیلنس خراب ہوگیا۔ موقع سڑک کا نہایت نازک تھا۔ ایک جانب گہرے گہرے غار تھے سڑک بھی زیادہ چوڑی نہ تھی۔ ہم تو یہ سمجھے کہ خاتمہ ہوگیا مگر خدا کا شکر ہے کہ شوفر نے بہت خوبی کے ساتھ حادثہ کو بچا لیا اور تعریف یہ ہے کہ بالکل متاثر نہ ہوا بلکہ ہماری پریشانی دیکھکر زور زور سے ہنستا تھا۔

النّاصرہ

دوپہر کے قریب ایک قصبہ میں پہونچے جسکو عربی میں النّاصرہ اور انگریزی میں (NAZARETH.) کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی نوعمری کا زمانہ یہیں گذرا تھا۔ مردم شماری (۱۵۰۰۰) پندرہ ہزار سے اُوپر بتلائی جاتی ہے۔ ایک رسٹوران میں کھانا کھایا۔ دکان معمولی تھی۔ مالک اس کا یہودی ہے۔ خود الگ بیٹھا رہا مگر اسکی عورت سب کام کرتی تھی۔ کھانا مانگنے میں زبان کی وجہ سے مشکل ہوئی۔ عورت کو خوب سوجھی کہ ہم کو باورچیخانہ میں لیگئی کہ جو چیز پسند ہو بتلادو۔ کھانا چنداں بُرا نہ تھا۔

ایک ناگوار واقعہ

یہاں سے روانہ ہوکر کچھ دور گئے تھے کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ ہمارے سوٹ کیس موٹر کے پیچھے پٹرول کے خزانہ پر بندھے ہوئے تھے۔ سلیم بیگ نے سگریٹ پیکر جو پھینکا ہوا کی وجہ سے وہ اسباب پر گرا۔ رفتہ رفتہ سوٹ کیس جلنا شروع ہوا۔ ہم کو خبر نہ ہوئی۔ حسن اتفاق دیکھو کہ ایک ریلوے گیٹ کے قریب دو چار دکانیں تھیں۔ کسی نے دھواں نکلتے دیکھ لیا۔ اور غل مچانے لگا۔ موٹر ٹھہرائی گئی۔ اسوقت اصل کیفیت معلوم ہوئی۔ دکان سے پانی لیکر آگ کو بجھایا۔ ایک سوٹ کیس کا کچھ حصہ جل گیا اللہ میاں کا انصاف دیکھو کہ جن صاحب نے سگریٹ پھینکا تھا ان کا ہی سوٹ کیس جلا۔

بحر الطبّاریہ

آگے چلکر (SEA OF GALLELI.) پر سے گذرے جسکو عربی میں بحر الطبّاریہ کہتے ہیں۔ اس کے کنارہ پر ایک قصبہ طباریہ نامی ہے۔ یہ ایک جھیل ہے جس کا طول تیرہ میل کے قریب ہے۔ راستہ میں کچھ پہاڑ ایسے دکھائی دیئے جنکی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ دو جگہ پاسپورٹ کا معائنہ ہوا اور ایک جگہ شام کے علاقہ میں فرانسیسی افسر نے ایک سوٹ کیس کھلوا کر دیکھا۔

دمشق

مغرب کے وقت دمشق پہونچے۔ بیت المقدس کے ہوٹل والے نے دمشق کے ایک ہوٹل کا پتہ ہم کو دیا تھا۔ یہ پیلیس ہوٹل کے نام سے مشہور ہے۔ آسایش کا ہوٹل ہے۔ کرایہ فی کس دس شلنگ روزانہ طے پایا۔ اس میں کھانا بھی شریک تھا مگر پہلی رات کھانا ہم نے باہر کھایا۔ ایک رسٹوران میں تین مسلمان ملے جو کسی قدر انگریزی جانتے تھے۔ ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ یہ بھی گاندھی جی کو پوچھتے تھے۔ ہمارے کھانے کی قیمت ان ہی لوگوں نے ادا کی۔ صبح کو جب ہوٹل سے نکلے تو ایک ترجمان چمٹ گیا۔ یہ کچھ اردو بھی جانتا تھا۔ پہلے تو ہم انکار کرتے رہے لیکن وہ کب مانتا تھا۔ مردہ بدست زندہ کا حساب ہوا۔ آخر کو سیر کرانیکے لئے اسے مقرر کرنا پڑا۔

تاریخی حالات

دمشق کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہے۔ اسکی موجودہ آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔ شہر کا موقع بہت خوب ہے اور اطراف واکناف سرسبز اور شاداب ہیں۔ دمشق کی قدامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں بھی اس کا وجود تھا۔ تاریخی حالات دلچسپ ہیں لیکن طوالت کے اندیشہ سے تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے مختصر یہ کہ ۶۳۵ء میں خلیفہ دوم کے زمانہ میں عربوں نے اس شہر کو فتح کیا لیکن محاصرہ خلیفہ اول کے عہد میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ بات اس زمانہ کی ہے جبکہ مسلمان

ملک گیری کے نشہ میں چور ہو رہے تھے اور انکی تلوار کی دھاک اطراف و جوانب میں بیٹھ چکی تھی۔ پھر بھی ابتدائی زمانہ تھا۔ لشکر و ساز و سامان کی قلت کو دیکھکر دشمن ان کو حقیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ فتح دمشق سے تقریباً دو ہی سال قبل جب یزدجرد شاہ ایران کے دربار میں عرب کے مشہور سپہ سالار سعد ابن وقاص کے ایلچی پہونچے تو انکی ظاہری حالت دیکھکر بادشاہ نے تحقیر آمیز گفتگو شروع کی۔ ایران کا نامی گرامی شاعر فردوسی اس گفتگو کا خاکہ اسطرح کھینچتا ہے۔ بادشاہ نے کہا ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

خداوند کریم کا لطف و کرم مسلمانوں کے شریک حال تھا۔ باوجود دشمنوں کی کثرت کے فتح ان ہی کے نام پر ہوتی گئی۔ دمشق کی رومی حکومت بھی اپنی جگہ مطمئن تھی کہ مسلمان کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ لیکن عربوں کی بہادری نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا۔ اسلامی لشکر خالد بن ولید کے زیر کمان تھا۔ انکے تحت ابوعبیدہ اور عمرو ابن عاص جیسے نامی گرامی مجاہدین کام کررہے تھے۔ ایک رات اہالیان شہر کسی تقریب کے سلسلہ میں جشن منارہے تھے۔ خالد بن ولید نے اس موقع کو غنیمت جانکر چند افسروں کو ساتھ لیا۔ ایک مشک کے ذریعہ خندق کو پار کیا اور کمند لگا کر قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے۔ ان کے پیچھے کچھ فوج رسی کی سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر پہونچی۔ دربانوں کو تہ تیغ کرنیکے بعد قلعہ کا دروازہ کھولدیا گیا۔ عیسائیوں نے جب شکست کی صورت دیکھی تو خود ہی دوسرا دروازہ کھولکر ابوعبیدہ کو راستہ دیدیا۔ دونوں سپہ سالار شہر کے ایک حصہ میں ایک دوسرے سے ملے اس وقت سے عیسائیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ خاندان بنو امیہ کے زمانہ میں اس شہر کی شان و شوکت دوبالا ہوگئی۔ امیر معاویہ نے اسکو اپنا دار السلطنت

قرار دیا لیکن جب خاندان عباسیہ کا تسلط ہوا۔ جنگ صلیبی کے زمانہ میں سلطان صلاح الدین کا مرکز یہی شہر تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ء میں ہلاکو خاں نے اپنا قبضہ جمایا۔ اس کے بعد کچھ دنوں مصریوں کی حکومت رہی۔ سنہ ۱۳۰۰ء میں تاتاریوں نے شہر پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا۔ اچھی اچھی عمارتیں جلا دی گئیں۔ سنہ ۱۳۹۹ء میں امیر تیمور نے اس جانب رخ کیا۔ اہالیان شہر نے بہت کچھ مال متاع دیکر اپنی جان بچائی۔ امیر تیمور اپنے ساتھ یہاں کے ہتیار بنانے والوں کو لے گیا۔ اسوقت سے دمشق کی مشہور تلوار سمرقند و خراساں میں بھی تیار ہونے لگی۔ بالآخر سنہ ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم نے مستقل طور پر ترکوں کی حکومت قائم کرلی جو جنگ عظیم تک باقی تھی۔ اب یہ ملک فرانسیسوں کے زیر اثر ہے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں اس شہر میں ایک بڑا کشت و خون مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوا۔ تقریبًا چھ ہزار عیسائی بازاروں میں مارے گئے۔

عام حالات

یہاں کے مکانات اندر سے بہت خوشنما اور دل آویز ہوتے ہیں۔ دیواروں پر نقش و نگار کے علاوہ قرآن شریف کی آیات بھی لکھی جاتی ہیں۔ اکثر مکانوں میں حوض ہوتا ہے جسکے اطراف چمن بندی کرتے ہیں۔ عورت مرد تقریبًا ایک نمونہ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے ہیں۔ پائجامہ ان کا اس وضع کا ہوتا ہے جو پنجاب میں رائج ہے۔ مسلمان عورتیں نقاب گھیری ڈالتی ہیں۔ تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ بازاروں میں اکثر منشی قلم دوات لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ نقاب پوش عورتیں ان سے خطوط وغیرہ لکھواتی ہیں۔ بعض عورتیں بھیک مانگتی دیکھی گئیں۔ مادری زبان عربی ہے مگر فرانسیسی کا رواج روز افزوں ترقی پر ہے انگریزی جاننے والے کم ہیں۔ ہمارے ہوٹل کا منیجر انگریزی جانتا ہے۔

جامع الاموی

دمشق میں ڈھائی سو کے قریب مساجد ہیں جن میں ستر بڑی ہیں۔ سب سے بڑی اور مشہور مسجد جامع الاموی ہے

جو سوق الحمیدیہ نامی بازار کے مشرقی گوشہ میں واقع ہے۔ بیت المقدس میں قبۃ الصخرا اور دمشق میں مسجد اموی خاندان بنی امیہ کی شان و شوکت کی دو بڑی یادگاریں ہیں۔ دراصل یہ عمارت عیسائیوں کی عبادت گاہ تھی۔ جسکے مشرقی حصہ کو فتح دمشق کے وقت عربوں نے مسجد بنا لیا۔ بقیہ حصہ جانب غرب بدستور عیسائیوں کے قبضہ میں رہا چنانچہ ایک عرصہ تک مسلمان اور عیسائی ایک ہی دروازہ سے عبادت کے واسطے داخل ہوا کرتے تھے۔ یہ صورت حال خدشہ سے خالی نہ تھی اسلیئے باقتضائے مصلحت سلطان ولید نے عیسائیوں سے عمارت کا مغربی حصہ بھی لے لیا اور اس کا معاوضہ کسی اور مناسب طریقہ پر کر دیا۔ اس کے بعد سلطان موصوف نے اس عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کی۔ کہتے ہیں کہ بارہ سو کاریگر قسطنطنیہ سے بلائے گئے۔ فرش اور دیوار کے زیرین حصہ میں قیمتی سنگ مرمر لگایا گیا۔ بالائی حصہ میں بہترین پچی کاری کی گئی جس کے آثار ابتک نمایاں ہیں۔ محرابوں کو قیمتی جواہرات اور انگور کی سنہری بیلوں سے آراستہ کیا گیا۔ مسجد کی چوبی چھت میں اعلیٰ درجہ کا طلائی کام کر کے اس میں چھ سو سنہری چراغ آویزاں کیئے۔ الغرض کوئی دقیقہ اسکی زینت کو بڑھانے میں باقی نہ رکھا لیکن سلطان عمر وابن عبد العزیز نے قیمتی چراغوں کو اتار کر انکی جگہ دوسرے چراغ کم قیمت کے آویزاں کیئے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مسجد کا ایک حصہ آتش زدگی سے ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے اسکو اصلی حالت میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی مسجد میں حضرت یحیٰؑ کا مزار ہے۔ چند اور متبرک مقامات اس مسجد کے اندر بتلائے جاتے ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہے۔

ہم مسجد کے مغربی دروازہ باب البریدسے اندر داخل ہوئے تھے۔ دروازہ کے چاروں ستونوں پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں اور قدیم رنگ و روغن کے آثار ابتک نمایاں ہیں۔ مسجد کے جنوب و مغربی گوشہ میں جو مینار ہے اس کو

مدنیتہ الغربیہ کہتے ہیں۔ مصری اور عرب فن تعمیر کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسکے جوابی مینار کو مدنیتہ العیلی کہتے ہیں۔ تیسرا مینار مدنیتہ العروس شمال میں ہے۔

سلطان صلاح الدین کا گنبد

مسجد کے باہر قریب میں اس نامی گرامی سلطان کا مزار ہے جس نے جنگ صلیبی میں کارہائے نمایاں کرکے اسلام کی شان کو باقی و برقرار رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ گنبد کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اگر سلطان صلاح الدین جیسا شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو آج خدا معلوم کتنی یادگاریں اس کے نام پر قائم ہو جاتیں۔ اس کے کارناموں کا مقابلہ اگر اس گنبد سے کیا جائے جس کے زیر سایہ وہ میٹھی نیند سو رہا ہے تو خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ یہ کردی النسل بادشاہ دریائے شط العرب کے کنارہ ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا ابتدائی زمانہ میں اگرچہ عالی مرتبت نہ تھا مگر لوگ کہتے ہیں ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے قوت بازو اور غیر معمولی قابلیت سے مصر و شام کا بادشاہ ہو گیا۔ ۱۸۹۸ء میں قیصر جرمنی جب دمشق کی سیر کو آیا تو اس نے سلطان کی قبر پر پھول چڑھائے۔ گنبد خوبصورت لیکن مختصر ہے۔ ایک نقاب پوش عورت اسکی نگران کار تھی۔ اس نے ہم کو پانی پلایا۔ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر مسلمانوں کی پست ہمتی کا مرثیہ پڑھتے رہے۔ مسجد کو دیکھکر جو کچھ مسرت ہوئی تھی وہ رنج اور تاسف میں تبدیل ہو گئی۔

مدرسہ ملک الظاہر بے بارس

کچھ فاصلہ پر مدرسہ ملک الظاہر بے بارس ہے عمارت کے اندر دیواروں پر منقش تصاویر لائق دید ہیں۔ سلطان اور اس کے بیٹے کی

قبور بھی اسی مقام پر ہیں۔ مدرسہ سے متعلق ایک مختصر کتب خانہ ہے جسکو مدحت پاشا نے جمع کیا تھا۔ بعض قلمی نسخے نایاب ہیں۔ مقابل میں سلطان کے بیٹے کی بنائی ہوئی ایک مسجد ہے۔ یہ دونوں عمارتیں فن تعمیر کے لحاظ سے ستائش کے لائق ہیں۔ سلطان بے بارس اصل میں ایک مملوک سلطان کا سپہ سالار تھا جو بعد کو خود مختار ہو گیا۔ عیسائیوں اور تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت سی فتوحات اس نے حاصل کیں

مزارات

دمشق کے قریب ایک گاؤں الصالحیہ ہے۔ کچھ دور تک ٹرام جاتی ہے مگر ہم موٹر کے ذریعہ گئے تھے یہاں ایک مشہور بزرگ محی الدین العربی کا مزار ہے۔ جانب مغرب ایک پہاڑی سطح سمندر سے چار ہزار فیٹ بلند ہے جسکی چوٹی پر ایک گنبد بنا ہوا ہے اسکو قبۃ النصر کہتے ہیں۔ یہاں سے اطراف کا منظر بہت دلفریب ہے۔ قیصر جرمنی بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ حضرت بلال۔ امیر معاویہ۔ حضرت زینب (دختر حضرت علیؓ) اور یزید کی قبریں بھی دمشق کے قریب ہیں۔

بازارات

یہاں کے بازارات قدیم سے مشہور ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ ان پر ٹین کی چھت ہے۔ راستہ چلنے والوں کو موسمی تکالیف سے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ بندوبست کیا گیا ہے۔ بازاروں میں خاص رونق رہتی ہے۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں جس طرح خونچے والے آواز لگاتے پھرتے ہیں وہی کیفیت یہاں بھی دیکھی گئی۔ البتہ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے انکی آوازیں عجیب وغریب معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی تو پہلو سے یہ آواز آئیگی "بَرِّدْ علی قلبک" (اپنے قلب کو ٹھنڈا کرو) یا "اطفی الحرار" (اپنی پیاس بجھاؤ) یہ شخص آلشورہ بیچتا ہے اور اگر تمہارے کان میں یہ آواز آئے "اللہ الرازق یا برازق" تو سمجھو کہ یہ آدمی روٹی بیچ رہا ہے۔ برازق ایک قسم کی روٹی ہوتی ہے

جس پر مسکہ لگا کر تل چھڑک دیتے ہیں۔ عربی میں بازار کو سوق کہتے ہیں چنانچہ یہاں کے بازاروں کے نام کے ساتھ سوق ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً سوق الحمیدیہ۔ سوق علی پاشا۔ سوق الخیاطین وغیرہ۔ بازاروں کے علاوہ چند مارکٹ ہیں جن کو خان کہتے ہیں۔ خان سعد پاشاہ سب سے بہتر ہے۔ میوے کی دکانیں کثرت سے دیکھی گئیں۔ ایک بڑی دکان مٹھائی کی دیکھی جس میں انواع واقسام کی مٹھائیاں خوبصورت بکسوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ دکان والا کہتا تھا کہ اس دکان کی مٹھائی غیر ممالک میں بھی جایا کرتی ہے۔

نقاب پوش عورتیں اپنے کاروبار کیلئے بلا تکلف باہر نکلتی ہیں۔ ایک روز عجیب لطیفہ ہوا۔ ہم لوگ بازار میں گشت لگا رہے تھے کہ کوئی دیوانہ اس طرف آ گیا۔ اسکی بعض حرکات سے لوگ سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر جان چھپانے لگے۔ ایک نقاب پوش عورت ایسی خوف زدہ ہوئی کہ بلا تکلف رفیق بیگ سے چمٹ گئی۔ اسوقت ان کی پریشانی دیکھنے کے لائق تھی۔ قاہرہ کی طرح یہاں بھی فاحشہ عورتوں کا بازار ہے رات کے وقت وہاں مجمع رہتا ہے۔ البتہ بیت المقدس میں یہ چیز مفقود ہے۔ رات کے وقت سڑکوں پر روشنی کا بندوبست خاطر خواہ نہیں پایا گیا۔ اکثر اندھیرا رہتا ہے۔ لوگ زیادہ تر گورے رنگ کے اور حسین ہوتے ہیں۔

کوہ لبنان

۲۱ مئی کو صبح کے وقت ہم دمشق سے بیروت روانہ ہوئے ترجمان کے ذریعہ موٹر کا بندوبست کیا گیا۔ تقریباً تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ کوہ لبنان کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں سے ہو کر سڑک گذرتی ہے۔ مناظر قدرتی کی دلفریبی بیان سے باہر ہے۔ یہاں کا ہوش ربا منظر دنیا کے بہترین مناظر میں شمار کیا جاتا ہے۔ گھاٹیوں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی ہیں۔ موسم گرما میں اکثر لوگ یہاں آ کر رہتے ہیں۔ کہیں کہیں چھ ہزار فیٹ کی

بلندی پر سے سڑک گذری ہے۔ ریل کی سڑک بھی ان ہی پہاڑوں پر سے بنائی گئی ہے۔ بعض چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ دیکھنے میں آیا۔ عجیب دلفریب اور دلکش مقام ہے۔ دل چاہتا تھا کہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ ایک مقام پر نصف گھنٹے تک بیٹھے تفریح کرتے رہے۔ ان ہی پہاڑوں پر سے سمندر بھی دکھائی دیتا ہے۔

بیروت

بارہ بجے کے قریب بیروت پہونچے۔ یہ ایک خوبصورت بندرگاہ ہے جسکی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔ زیادہ تر عیسائی آباد ہیں۔ رونق اور چہل پہل دمشق سے زیادہ ہے۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی تجارت بھی بڑھی ہوئی ہے۔ عربی اور فرانسیسی عام طور پر بولتے ہیں انگریزی داں کم ہیں۔ ایک ہوٹل میں قیام کیا جو ارزاں اور اچھا تھا۔ تینوں آدمیوں کیلئے ایک پونڈ روزانہ مقرر ہوا۔ اس میں کھانا بھی شریک تھا لیکن زبان کی تکلیف رہی۔ ہوٹل والے انگریزی سے ناواقف تھے۔ کھانےکی فہرست عربی میں تھی۔ مجبوراً باورچی خانہ میں جاکر چیزوں کا انتخاب کر لیتے تھے۔

یہاں کوئی دلچسپ آثار قدیمہ نہیں ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ بیروت سے بذریعہ ریل انگورہ جائیں لیکن چند مشکلات کا سامنا تھا۔ ملک کے اس حصہ میں ریل کا سفر ابھی آرام دہ نہیں ہے۔ تمام باتوں پر غور کرنیکے بعد جہاز کے ذریعہ قسطنطنیہ جانا مناسب معلوم ہوا۔ سٹمار کمپنی کا ایک جہاز برازیل ۲۲ مئی کو روانہ ہونیوالا تھا۔ اس میں تیسرے درجہ کے کیبن بھی تھے۔ فی شخص چھ پونڈ سے کچھ اوپر کرایہ معہ کھانیکے ہوا۔ ساڑھے تین دن میں یہ جہاز بیروت سے استنبول پہونچتا ہے غالباً سب کو معلوم ہے کہ جنگ عظیم کے بعد جدید حکومت نے قسطنطنیہ کا نام استنبول سے تبدیل کر دیا ہے۔ اور بہت سختی کے ساتھ اس قاعدہ کی پابندی کرتے ہیں

۲۲ مئی کو نو بجے کے قریب جہاز کی کمپنی کے دفتر گئے اور ٹکٹ خریدے۔ وہاں ایک مہذب نما آدمی سے ملاقات ہوئی جو فارسی جانتا تھا۔ کمپنی کا ملازم انگریزی برائے نام جانتا تھا۔ مہذب نما آدمی نے ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ناخواندہ مہمان بنکر دخل درمعقولات کرنے لگا۔ ہم سمجھے کے اخلاقاً ہماری امداد میں مصروف ہے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ سلام روستائی بے غرض نیست۔ اسباب بندرگاہ تک پہونچانے کیلئے ان کے توسط سے ایک مزدور کو بلوایا۔ چلتے وقت حضرت کی نظر کچھ کرنا پڑا۔

بیروت کا ترجمان

دس بجے کے قریب بندرگاہ پہونچے۔ یہاں بہت سے امور تکمیل طلب تھے۔ ایک ترجمان صاحب دستور کے مطابق شکار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم کو آتا دیکھکر انکے چہرہ پر آثار مسرت نمایاں ہوئے۔ اور وہ استقبال کے واسطے آگے بڑھے۔ انکا دل اندر سے کہتا ہوگا کہ

اے آمدنت باعث آبادی ما
ذکر تو بود زمزمہ شادی ما

الغرض بلا کسی گفت وشنید کے وہ ہمارے رہبر بن گئے۔ کچھ اس طرح راستہ بتاتے ہوئے ہمارے سامنے چلنے لگے کہ جیسے ہم ہی نے ان کو مقرر کیا تھا۔ ان سے نجات بظاہر مشکل معلوم ہوئی اس لئے ہم نے بھی ان کو اپنا رہبر ہونا تسلیم کرلیا بندرگاہ کے دفتر میں رہبر کے ساتھ کچھ دیر پھرنا پڑا۔ کن کن باتوں کی دریافت ہوئی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ رہبر ہم کو کمرے کے باہر کھڑا کرکے خود اندر چلا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد آکر کہتا کہ یہاں طبی معائنہ ہوا کرتا ہے۔ میں نے سب کچھ طے کرلیا ہے۔ یہاں کچھ دینا پڑے گا ورنہ یہ لوگ ستائیں گے۔ اسیطرح کئی دفعہ

باتیں بناکر وہ کچھ نہ کچھ ہم سے لیجاتا۔ خدا معلوم اسکی جیب میں یہ رقم گئی یا اس نے کسی کو دی البتہ ایک کمرہ میں ہمکو بھی بلایا گیا۔ ہمارے نام پاسپورٹ کے حوالہ سے ایک رجسٹر میں لکھے گئے۔ اس دفتر کا ایک ملازم کچھ الفاظ انگریزی کے جانتا تھا گاندھی جی کے حالات دریافت کرنے لگا۔ کولمبو سے برابر یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ بازار ہو کہ ہوٹل ہو جب کوئی شخص ملتا گاندھی جی کے حالات دریافت کرتا ہم کسی نہ کسی طرح پہلو بچا لیتے کیونکہ اوّل تو یہ لوگ انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں ان کو مطلب سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے غیر ملک میں اجنبی لوگوں سے سیاسی امور پر گفتگو کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ تمام امور سے فارغ ہونیکے بعد ایک دوسری مصیبت سے سامنا ہوا یعنے ترجمان کے محنتانہ کا سوال معرض بحث میں آیا۔ اس کا مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ بڑی جھک جھک ہوتی رہی بلکہ وہ جہاز پر ہمارے پیچھے کیبن کے اندر آگیا۔ شاید وہ سمجھا کہ اجنبی ہونے کی وجہ سے ہم لوگ مرعوب ہو جائیں گے۔ اس خیال خام نے اسکو کسی قدر گستاخ بنا دیا۔ بات زیادہ بڑھ گئی۔ ہمارے برادر کرم مرزا اسلیم بیگ صاحب کی رگوں میں خون مغلیہ موج زن ہوگیا۔ قریب تھا کہ وہ اس بدتمیز کی گردن ناپتے مگر اتنے میں دو ایک ملازمین جہاز وہاں آگئے اور انہوں نے ترجمان کو باہر نکال دیا۔

بیروت سے استنبول بذریعۂ جہاز

بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ یہ ایک چھوٹا سا جہاز اطالوی کمپنی کا ہے دو ایک افسر انگریزی جانتے ہیں مگر ملازمین اس زبان سے ناواقف ہیں تیسرے درجہ کے کیبن آرام دہ ہیں۔ لیکن کھانا معمولی تھا۔ کھانیکا کمرہ صاف ستھرا اور میز کرسی سے آراستہ تھا۔ ہمارا باورچی بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اسکی ہر ایک حرکت

ہندوستان کے ہیجڑوں کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ کمر کی لچک۔ ہاتوں کا مٹکانا اور طرز گفتگو غرض کسی بات میں کم نہ تھا۔ سب مسافر یوروپین تھے۔ کچھ عورتیں تھیں اور کچھ مرد۔ تیسرے درجہ کے واسطے ڈک بھی اچھا ہے۔ الغرض خاصا آرام ملا۔ ہمارے درجہ میں دس بارہ مسافر تھے۔ ایک جرمن تھا جو ویانا سے بسلسلہ کاروبار بمبئی جانیوالا تھا۔ لیکن سیاسی شورش کی خبر سنکر پورٹ سعید سے واپس ہو گیا۔ اس کو خوف تھا کہ بمبئی میں کوئی اس کو انگریز سمجھ کر جان سے مار ڈالے گا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے گفتگو رہتی تھی۔ دو عورتیں ڈنمارک کی رہنے والی تھیں ایک سن رسیدہ اور دوسری نوجوان تھی۔ سن رسیدہ عورت کسی تعلیمی انجمن کی معتمد ہے اور نوجوان عورت اسکی مددگار ہے۔ انجمن کے اغراض کی خاطر یہ دونوں مختلف ممالک میں دورہ کرتی رہتی ہیں۔ دونوں انگریزی سے کافی طور پر واقف ہیں۔ سن رسیدہ عورت سے اکثر تعلیمی امور پر گفتگو رہتی تھی۔ اس نے ہم کو ڈنمارک آنے کی دعوت دی۔ کہتی تھی کہ اس نے فرانسیسی زبان سے قرآن شریف کا ترجمہ ڈنمارک کی زبان میں کیا ہے اور ایک کتاب دنیا کے مذاہب پر لکھنے والی ہے ابھی تک یہ اپنی انجمن کا رسالہ ہر مہینہ ہمارے پاس بھجوایا کرتی ہے۔ یہ دونوں عورتیں اٹلی جا رہی ہیں۔ ایک امریکن مسافر یونان جا رہا ہے۔ چونکہ انگریزی جانتا تھا اس سے اکثر بات چیت رہتی تھی۔ ایک انگریز مسافر ہے جس کی عمر (۷۰) ستر سال کے قریب ہوگی۔ اسکی بیوی مر چکی ہے۔ اولاد کی طرف سے بےفکری ہے۔ جوانی میں روپیہ خوب کمایا۔ بڑھاپے میں سیاحت کا شوق ہوا۔ اب گھر میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ کسی روز سمندر ہی میں یا غیر ملک کے کسی ہوٹل میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا آخر کب تک خاک چھانتے رہوگے۔ کیا تم کو آرام کی ضرورت نہیں ہے۔ جواب ملا کہ "جب تک ہاتھ پاؤں کام

کرتے ہیں میں اپنے شوق کو پورا کرتا رہونگا۔ زندگی کے دن تھوڑے سے باقی رہگئے ہیں۔ میں اپنی ہوس کو پورا کیوں نہ کروں۔ اب رہا مرنا تو اسکے لئے جگہ کی کیا خصوصیت ہے۔ جہاز پر مرے تو سمندر میں جگہ کی کمی نہیں اور کسی ہوٹل میں مرے تو دفن کرنیوالوں کی کمی نہیں۔" سبحان اللہ کیسے کیسے خیالات کے لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ مگر ہمارا اعتقاد کچھ اور ہے۔ انجام کار جو تری مرضی ہو کیجو پر ایسی موت بارخدایا نہ دیجو۔

اس جہاز پر تیسرے درجہ والوں کو سہ پہر کی چائے نہیں دیتے۔ جبکو ضرورت ہے وہ درجہ دوم میں جاکر بادائی قیمت چائے یا کافی پی سکتا ہے۔

ایک دلچسپ قصہ

بڑھیا اور نوجوان عورت کے درمیان تعلقات کسی قدر کشیدہ معلوم ہوئے۔ بڑھیا کو نوجوان پر بھروسہ نہیں تھا سختی کے ساتھ اس پر نگرانی رکھتی تھی۔ ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ کھانے کی میز پر سن رسیدہ عورت میرے مقابل بیٹھی تھی۔ نوجوان عورت کے اور میرے درمیان سلیم بیگ بیٹھے۔ بسلسلہ گفتگو بڑھیا نے مجھ سے کہا کہ مسٹر بیگ تم چونکہ مجسٹریٹ ہو اسلئے میں تم سے ایک قانونی مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں فرض کرو ایک نوعمر لڑکی کسی نوجوان مرد پر عاشق ہے اور یہ دونوں مصر کے قدیم مقبروں میں سیر کے واسطے جاتے ہیں وہاں بعض نادرالوجود اشیاء معائنہ کی غرض سے رکھی ہوئی ہیں۔ معشوقہ کی فرمایش پر اس کا عاشق محافظ مقبرہ کو رشوت دیکر ایک چیز حاصل کرلیتا ہے اور اس مال مسروقہ کو نوجوان لڑکی باوجود علم کے تحفتاً قبول کرلیتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ عورت قانوناً اور اخلاقاً جرم کی مرتکب ہوئی یا نہیں۔ میں نے کہا میرے نزدیک تینوں آدمی مجرم ہیں۔ یہ سنکر نوجوان عورت برانگیختہ ہوئی مجھ سے تو مخاطب ہوئی نہیں لیکن بڑھیا کی اس نے خبر لے ڈالی۔ کہتی تھی کہ تم

بالکل غلط واقعات بیان کر رہی ہو۔ مجھکو ذاتی علم ہے کہ واقعہ کچھ اور ہے۔ دونوں میں بے لطف گفتگو ہونے لگی۔ ہم نے مصلحت وقت کے خیال سے گفتگو کا رنگ بدل دیا۔ اس وقت بات ٹل گئی۔ دوسرے دن کھانیکے وقت نوجوان عورت میرے قریب بیٹھ گئی۔ اِدہر اودہر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا جب ختم ہوگیا۔ اور لوگ اٹھنے لگے تو مجھکو اس نے ٹھیرالیا۔ کہتی تھی کافی بیکر جانا۔ میں ٹھیر گیا سب لوگ جب چلے گئے تو اس نے کہا میں نے تم کو اس غرض سے روکا ہے کہ ایک غلط فہمی کو رفع کردوں۔ کل جو گفتگو بڑھیا نے کی تھی اسکی وجہ سے ممکن ہے کہ تم کو میرے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی ہو۔ میں نے کہا اس واقعہ کو تمہاری ذات سے کیا تعلق ہے۔ جواب دیا کہ جس نوجوان لڑکی کا ذکر بڑھیا نے کیا تھا در اصل مراد مجھسے ہے لیکن اصلی واقعات کچھ اور ہیں جن کا اظہار نامناسب خیال کرتی ہوں مگر تم کو باور کرانا چاہتی ہوں کہ میرے اخلاق اس قدر گرے ہوئے نہیں ہیں جیسا کہ اس بڑھیا کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے کہا تم اطمینان رکھو ہم نے اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اسکے بعد اس نے اپنے متعلق ایک عجیب و غریب قصہ بیان کیا جسکو میں صحیح باور نہیں کرتا۔ اس نے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی روحانی قوت کو اس درجہ بڑھالیا ہے کہ اگر چاہوں تو ہر ایک عضو میرے جسم سے الگ ہو جائے بلکہ جسم کے متعدد ٹکڑے ہو جائیں اور جسوقت چاہوں تمام جسم اصلی حالت میں آجائے میں نے اظہار تعجب کرکے تماشہ دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔ اس نے کہا کچھ عرصہ سے میری مشق کم ہو گئی ہے کیونکہ فرصت نہیں ملتی اسلئے اب پوری طرح اس کام کو نہیں کرسکتی۔ میں نے عدیم الفرصتی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ میں اسلام پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ عربی سے

محض نا واقف ہے۔

طرابلس الشرق

پہلے دن شام کو چار بجے جہاز طرابلس الشرق کے بندرگاہ پر پہونچا۔ ایک کشتی کے ذریعہ ہم سیر کرنے گئے۔ امریکن مسافر بھی ساتھ ہوگیا۔ جہاز بندرگاہ سے فاصلہ پر ٹھیرا ہوا سرد اور تیز تھی۔ کشتی چھوٹی اور ہلکی ہونے کی وجہ سے ہلتی بہت تھی۔ مجھکو خفیف سا چکر معلوم ہوا۔ اگر کچھ دیر اور بیٹھنا پڑتا تو حالت یقیناً خراب ہوجاتی۔ ایک وکٹوریہ گاڑی کرایہ پر لیکر شہر میں گشت کی۔ چھوٹا مقام ہے۔ شہر کے ایک حصہ میں خچروں کی ٹرام چلتی ہے۔ ہم نے بازار میں کچھ میوہ وغیرہ خریدا۔ نقاب پوش عورتیں کاروبار میں مصروف نظر آئیں۔ واپسی کے وقت بندرگاہ پر ایک چھوٹا سا مجمع دیکھا۔ ایک مسلمان مسافر جہاز پر سوار ہونیکے لئے جا رہا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب خدا حافظ کہنے کے لئے جمع تھے۔ کئی ایک نقاب پوش عورتیں بھی موجود تھیں۔ یہ اس مسافر سے ملکر روتی تھیں۔ جہاز پر پہونچنے کے بعد بہت دیر تک دوران سر رہا۔ دوسرے دن جزیرہ سائپرس کے دو مقامات پر جہاز نے لنگر ڈالا۔ تجارتی سامان لیا گیا اور کچھ دیا گیا۔ یہاں مسافر سیر کے واسطے نہیں اُترے۔ جرمن مسافر سے اکثر گفتگو رہتی تھی۔ وہ بار بار ہندوستان کے حالات دریافت کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہندوستان میں عام طور پر یوروپین لوگوں کے قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسٹریا میں کپڑے اور جوتے بہت سستے بنتے ہیں۔ یہ کہتا تھا کہ انگلستان والے بنے بنائے سوٹ آسٹریا سے لیجاتے ہیں اور اپنا لیبل لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ خدا معلوم اس کا بیان حقیقت پر مبنی تھا یا محض تجارتی مصالح پر۔

درۂ دانیال

۲۵ مئی کو شام کے چار بجے جہاز درۂ دانیال میں داخل ہوا۔ سمندر کا یہ حصہ اپنے موقع کے لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ قدرت نے اس کو ایسے نمونہ پر بنایا ہے کہ غنیم کا سمندر کی طرف سے قسطنطنیہ پر حملہ کرنا مشکل ترین امر ہے۔ یہ سمندر تقریباً (۴۵) میل لمبا ہے۔ دونوں جانب پہاڑیاں ہیں۔ کسی مقام پر پانچ میل سے زاید چوڑا نہیں ہے۔ اور کہیں کہیں اسکی چوڑان ایک میل سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دونوں طرف توپیں لگا دیجائیں تو انکی زد سے غنیم کا کوئی جہاز بچکر نہیں نکل سکتا۔ ایشائی ساحل کی جانب قلعۂ سلطانیہ ہے۔ کلید بحر اسکے بالمقابل ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں یہاں بڑی معرکہ آرائی ہوئی۔ چنانچہ ایک طرف یادگار بھی قائم ہے۔

استنبول کا موقع

صبح کو سات بجے جہاز استنبول پہونچا۔ شاخ زرین کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ دنیا میں اس نوعیت کا منظر کمیاب ہے۔ تاوقتیکہ نقشہ پیش نظر نہ رکھا جائے قسطنطنیہ کا موقع اچھی طرح سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ درۂ دانیال ایک تنگ آبنائے ہے۔ جس کے جنوب میں بحیرۂ روم ہے اور دوسری جانب بحر مارمورہ ہے۔ بحر مارمورہ اور بحر اسود کے درمیان ایک دوسرا تنگ آبنائے ہے جسکو باسفورس کہتے ہیں۔ باسفورس کے جنوبی دہانہ پر یورپ کے ساحل کے جانب استنبول آباد ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس شہر کی حیثیت ایک جزیرہ نما کی ہے۔ بالکل ہندوستان کا جنوبی حصہ معلوم ہوتا ہے محل وقوع سات چھوٹی پہاڑیوں پر ہے۔ اس کے شمالی جانب شاخ زرین ہے۔ مشرق میں باسفورس ہے اور جنوب میں بحر مارمورہ ہے۔ شاخ

زریں نے شہر کو دو حصوں پر منقسم کر دیا ہے۔ ایک جانب استنبول ہے اور دوسری جانب غلطہ و پیرا۔ باسفورس کے مشرقی جانب ایشیا کے ساحل پر سقوطرہ واقع ہے۔

شاخ زریں

شاخ زریں کی لنبائی تقریباً ساڑھے چار میل ہے۔ وسعت اگرچہ کم ہے لیکن گہرا اتنا ہے کہ بڑے بڑے جہاز اس میں بلا خوف وخطر آتے جاتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز شاخ زریں کے قریب پہونچا مساجد کے عالیشان مینار اور گنبد دکھائی دینے لگے۔ عجیب دلکش منظر تھا۔ غلطہ کا بندرگاہ شاخ زریں پر ہے۔

پاسپورٹ کا جھگڑا

جہاز نے جسوقت لنگر ڈالا ترکی پولس کے افسر جہاز پر آگئے اور پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ ہمارے پاسپورٹ پر کک کمپنی کے توسط سے ویسا ہوا تھا۔ بمبئی میں فی الحال ترکی گورنمنٹ کا کوئی نمایندہ نہیں ہے۔ سویڈن کا سفیر نیابت کرتا ہے اس نے مقررہ فیس لیکر ہمارے پاسپورٹ پر ویسا کیا تھا۔ ترک افسر نے اس ویسا کو تسلیم نہیں کیا۔ اسکو شبہ تھا کہ شخص مجاز نے ویسا کیا ہے یا نہیں۔ جہاز کے ایک افسر کے توسط سے بات چیت رہی کیونکہ ترک افسر انگریزی سے ناواقف تھا۔ اس معاملہ میں تکرار ہوتی رہی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ پاسپورٹ پولس کے صدر دفتر میں بغرض دریافت بھجوا دیئے جائیں۔ اس کارروائی میں چونکہ عرصہ درکار تھا۔ اس لئے اس شرط پر جہاز سے اترنے کی اجازت دیگئی کہ اپنے ہوٹل کا پتہ لکھوا دیں۔ ہم نے کہا ہم بالکل اجنبی ہیں۔ شہر میں جانیکے بعد ہوٹل دیکھیں گے اور جو پسند آئے گا اس میں ٹھہرینگے۔ ترک افسر اس پر رضامند نہ ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ جہاز ہی پر ہوٹل کا انتخاب کرلو۔ ہم نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے البتہ امریکن اکسپرس کے ذریعہ ہم سے خط وکتابت کرسکتے ہو۔ جواب ملا کہ ہمارے

پاس ہوٹلوں کی فہرست موجود ہے۔ کسی ایک ہوٹل کا انتخاب کر لو۔ ورنہ جہاز سے اُترنے کی اجازت نہیں ملسکتی۔ پولس افسر کا یہ فیصلہ سنکر کئی ایک ہوٹلوں کے نمائندے جو وہیں کھڑے تھے ہم کو گھیرنے لگے۔ اطمینان کے ساتھ بات کرنا مشکل ہو گیا لطف یہ کہ انگریزی ایک کو نہیں آتی تھی۔ مردہ بدست زندہ کی مثل صادق آئی۔ ایک شخص کے ساتھ ہو لئے۔ اس نے ہوٹل کا پتہ پولس افسر کے پاس نوٹ کروا دیا۔ اور ہمارا اسباب اٹھوا کر بندرگاہ پر لایا۔ ہمارا کام اتنا ہی تھا کہ اسکے ساتھ ہو جائیں۔

زمانۂ جنگ کے بعد سے پاسپورٹ کی مصیبت ایجاد ہوئی ہے۔ نہایت تکلیف دہ طریقہ ہے۔ اس جکڑ بندی نے مسافرین کی جائز آزادی کو سلب کر لیا ہے۔ اکثر لوگ اس طریقہ کو مسدود کرنے کیلئے غل بھی مچا رہے ہیں۔ ترکی پولس کی اسقدر سختی مسافرین کے ساتھ باعث زحمت ضرور ہے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یورپ میں سب جگہ یہی عمل ہے۔ جہاز پر ایک امریکن عورت تھوڑی دیر کیلئے شہر میں جا کر واپس آنا چاہتی تھی۔ ترک افسر نے اسکو اترنے کی اجازت نہ دی۔ اعتراض یہ تھا کہ پاسپورٹ پر ویسا نہیں ہوا ہے۔ اول ویسا کی فیس داخل کرو اسکے بعد جاؤ۔ وہ کہتی تھی کہ میں امریکن سفیر سے ملنے جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں جہاز پر واپس آ جاؤنگی۔ جواب ملا کہ زیادہ گفتگو کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت ہے۔ جانا چاہتی ہو تو چار ڈالر (تقریباً سولہ روپیہ) یہاں رکھدو میم صاحبہ اپنا سا منہ لیکر رہگئیں۔ ایک یونانی مسافر اپنی بیوی کو شہر کی سیر کرا کے واپس آنا چاہتا تھا۔ یہ شخص ویسا کی فیس دینے پر بھی آمادہ تھا لیکن جواب ملا کہ تمہارے پاسپورٹ میں ترکی کا ذکر نہیں ہے اس لئے اجازت نہیں ملسکتی۔ دونوں میاں بیوی استنبول دیکھنے کا بڑا اشتیاق رکھتے تھے۔ اجازت نہ ملنے پر حسرتناک نظر سے شہر کی طرف دیکھنے لگے۔ یونانی نے یہ بھی کہا کہ بیروت کے ترکی سفیر نے ہم سے کہا تھا

جہاز ہی پر ٹکٹ دیکر ویسا کروا لینا۔ پولس افسر نے کہا یہ بات خلاف قاعدہ ہے۔ ترکی سفیر کی تحریر پیش کرو۔ غرض یہ کہ اجنبی مسافروں کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

جہاز سے اُترنیکے بعد کسٹم ہوز یعنے کروڑ گیری کے دفتر میں گئے۔ یہاں سامان دیکھا گیا۔ جہاز پر بعض مسافروں نے ڈرا دیا تھا کہ کروڑ گیری والے بہت ستائینگے۔ لیکن شکر ہے کہ بہت آسانی کے ساتھ یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اس کے بعد رہبر نے ہم کو ایک قریب کے قہوہ خانے میں بٹھا دیا۔ خود بھی قہوہ میں شریک رہا۔ بہت دیر تک یہاں بیٹھے رہے۔ اس نے جب چلنے کو کہا تو اس کے ساتھ ہو لئے۔ ایک موٹر میں سامان رکھا گیا۔

ہوٹل

پیرا میں ایک جرمن ہوٹل ہے وہاں لیجا کر اس نے ہم کو ٹھیرا دیا۔ یہ ہوٹل ہم کو ناپسند تھا۔ لیکن پتہ لکھوا چکے تھے اس لئے مجبوراً ٹھیرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ رہبر صاحب ہوٹل کے ملازم نہیں ہیں بلکہ دونوں طرف سے کمیشن لیتے ہیں۔ بڑی دیر تک معاوضہ کے متعلق بحث رہی۔ یہ شخص چاہتا تھا کہ ہم اسکے ذریعہ سے شہر کی سیر کریں لیکن آدمی معقول معلوم نہیں ہوا اس لئے ہم نے اسکو ٹالدیا۔ کھانا شامل کر کے تینوں آدمیوں کیلئے چھبیس شلنگ روزانہ قرار پائے۔

پاسپورٹ واپس مل گئے

ہم کو اپنے پاسپورٹ کی فکر لگی ہوئی تھی۔ تین روز انتظار کر کے ہم کک کمپنی کے دفتر گئے۔ منیجر نے پولس کے دفتر سے ٹیلیفون ملا کر بہت دیر تک باتیں کیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں لیکن منیجر نے کہا کہ آپ لوگ اطمینان رکھیں شام کو ہوٹل پر پاسپورٹ مل جائیں گے چنانچہ رات کو ایک پولس افسر پاسپورٹ

لیکر آیا۔ ایک فارم پر ہمارے نام لکھے گئے اور پاسپورٹ واپس مل گئے مگر دوبارہ تصویر کھنچواکر داخل کرنی پڑی۔

جس ہوٹل میں ٹھیرے اس کا مالک انگریزی نہیں جانتا تھا لیکن اسکی بیوی واقف تھی۔ ہوٹل کی ایک خادمہ بھی انگریزی بول لیتی تھی۔ شہر کے جس حصہ میں یہ ہوٹل ہے اسکو پیرا کہتے ہیں۔ بڑی بڑی دکانیں ہوٹل اور رستوران اس حصے میں ہیں۔ یوروپین آبادی بھی اسی طرف ہے۔ عمارتیں اگرچہ کئی منزل کی ہیں لیکن سڑکیں تنگ ہیں۔ یہاں کے اکثر مکانات لکڑی کے اور بوسیدہ ہیں۔ بازاروں میں رونق رہتی ہے۔

استنبول کی تاریخ

قسطنطنیہ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اسکے جدید نام استنبول پر آجکل بہت اصرار ہے۔ سنا ہے کہ بعض دفعہ ڈاکخانہ والے ان خطوط کو جن پر قسطنطنیہ لکھا ہو اس عذر کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں کہ اس نام کا کوئی شہر یہاں نہیں ہے۔ سب سے قدیم نام اس شہر کا (BYZANTIUM) ہے۔ اس وقت یونانی حکومت تھی۔ ۳۳۰ء عیسوی میں روم کے ایک بادشاہ قسطنطین اعظم نے یہاں اپنا دارالحکومت قائم کرکے اسکو ازسرنو آباد کیا۔ اُس وقت سے بانی کے نام پر یہ شہر مشہور ہوا۔ بہت عرصہ تک رومۃ الکبریٰ کا یہ مشرقی دارالسلطنت رہا۔ مستحکم فصیل اور موقع کی خوبیوں نے متعدد دفعہ اسکو دشمنوں کے سخت حملوں سے محفوظ رکھا۔ ۱۴۲۲ء میں سلطان مراد ثانی نے اسکو فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تقریباً تیس برس بعد سلطان محمد ثانی نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ اسکو فتح کیا۔ ترکوں کی یہ کامیابی سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہے۔ استقلال اور شجاعت کا جو ثبوت انہوں نے دیا وہ ہمیشہ کیلئے اس قوم کے واسطے طرۂ امتیاز رہے گا۔

اُس زمانہ میں مسلمانوں کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔

فرق نیاز فرش زمیں پر پڑا ہوا
ہمت کا پاؤں عرش بریں پر گڑا ہوا

جنگ عظیم تک یہ شہر ترکی سلطنت کا دارالخلافت رہا۔ بعد کو مصطفےٰ کمال پاشا نے مرکز حکومت انگورہ میں منتقل کر دیا۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

شہر کے تین بڑے حصّے استنبول۔ غلطہ اور پیرا کے نام سے موسوم ہیں۔ اصلی آبادی استنبول ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان دو بڑے پل ہیں جن میں سے ایک پل اچھی حالت میں ہے اور کثرت سے آمد و رفت رہتی ہے۔ اس پر سے گذرنے کیلئے ایک قلیل ٹکیس دینا پڑتا ہے۔ غلطہ اس شہر کا بندرگاہ ہے جہاں دن بھر سینکڑوں اسٹیمر۔ کشتیاں اور جہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے بنک اور تجارتی کوٹھیاں بھی اس حصہ میں ہیں۔ غلطہ کے پشت پر پیرا ہے۔ یہ کسی قدر بلندی پر ہے۔ چنانچہ غلطہ سے پیرا کو جانے کیلئے بعض راستوں پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں غلطہ میں ایک قدیم برج (۱۴۸) فیٹ بلند ہے شہر میں کہیں آگ لگتی ہے تو اس برج پر سے اطلاع دیجاتی ہے۔

استنبول کی مساجد

استنبول میں چند مساجد دیکھنے کے لایق ہیں جنمیں سب سے مشہور مسجد ایا صوفیا ہے۔ یہ عمارت پہلے عیسائیوں کی عبادت گاہ تھی۔ ترکوں نے اسکو مسجد کرلیا۔ اس کی اندرونی آرایش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ باہر سے عمارت معمولی ہے لیکن اندر مختلف رنگ کے قیمتی سنگ مرمر اور سنہری بلور کے ٹکڑوں کی پچی کاری و دیگر سامان آرایش نے عجیب شان پیدا کر دی ہے۔ قیمتی قالینوں کا فرش ہے جو اب بوسیدہ ہو گئی ہیں

ان میں سے سیل کی بو بھی آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ان کو دھوپ بھی نہیں دیتا۔ مذہب کی طرف سے جو لاپروائی ترکوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ قدیم مساجد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہیں۔ مسجد سلطان احمد۔ مسجد ایوب۔ اور مسجد بنی والدہ (جس کو سلطان محمدؒ چہارم کی والدہ نے بنوایا تھا) دیکھنے کے لائق ہیں۔ مسجد سلیمان ترکی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسکو سلطان سلیمان نے بنوایا تھا۔ تقریباً آٹھ سو مساجد اس شہر میں ہیں جن میں سے بیس مسجدیں تو ایسی ہیں جو پہلے عیسائیوں کی عبادت گاہ تھیں۔ آجکل کے زمانہ میں بہت کم لوگ نماز کیلئے مسجدیں آتے ہیں۔

استنبول کے حصہ میں شاخ زرین کے کنارہ ایک قدیم محل ہے جس کو عسکی سرائے کہتے ہیں۔ پہلے اس محل میں ترک سلاطین رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اسکے داخلہ کا بڑا دروازہ باب ہمایوں کے نام سے مشہور تھا اور اسی مناسبت سے حکومت ترکی کو باب عالی بھی کہتے تھے۔ یہ دروازہ آتش زدگی سے جل گیا۔ ۱۸۵۵ء میں سلطان عبدالحمید نے اس محل کی سکونت کو ترک کیا اور اس جدید محل میں چلے گئے جو باسفورس کے کنارہ پر دولما باغچہ کے نام سے مشہور ہے یہ ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان عمارت ہے۔ ہم نے اس کے پھاٹک کی ایک تصویر لی۔ عسکی سرائے میں اب ترکی عجائب خانہ ہے۔

باسفورس

شہریت کے لحاظ سے اس شہر میں کوئی خصوصیت نہیں ہے البتہ قدرتی مناظر اچھے ہیں۔ شاخ زرین کے علاوہ باسفورس کے دونوں جانب سرسبز پہاڑیاں۔ مکانات اور قلعہ وغیرہ بہت دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ روزانہ متعدد اسٹیمر غلطہ سے باسفورس کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔ مسافروں کی کثرت رہتی ہے۔ اکثر اوقات بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔

باسفورسس کے ایشائی ساحل پر سقوطری۔ اناطولی حصار۔ اور اناطولی کا واغی خاص مقامات دیکھنے کے لائق ہیں۔ آخر الذکر مقام پر ایک قلعہ چھ سو برس پہلے کا بنا ہوا ہے۔ یوروپین ساحل پر ایک قلعہ روملی حصار ہے۔ جسکو سلطان محمدؒ فاتح نے نہایت عجلت اور مستعدی کے ساتھ تعمیر کروایا تھا تاکہ اس جانب سے شہر پر حملہ کرنے میں سہولت ہو اس سے آگے بڑھکر تھیراپیا ہے۔ یہاں موسم گرما میں یوروپین لوگ اور دیگر عمائد شہر رہا کرتے ہیں۔ فی الواقعی یہ مقام رہنے کے لائق ہے۔ زمین کا نشیب و فراز اور سبزہ زار ایک خاص قسم کی فرحت پیدا کرتا ہے۔ شہر کی نسبت یہاں خنکی رہتی ہے۔

بیوک درہ

تھیراپیا کے قریب بیوک درہ نامی ایک قصبہ ہے۔ اس مقام پر ہم دو دفعہ گئے۔ قاہرہ میں جن مصری پاشا سے ملاقات ہوئی تھی اُن کے بڑے فرزند یہاں رہتے ہیں ہم موٹر کے ذریعہ یہانتک آئے۔ پاشا کا مکان لب سڑک ہے۔ ایک ملازم کے ذریعہ ان کے والد کا رقعہ بھجوا دیا گیا۔ ملازم نے ہم کو ملاقاتی کمرہ میں بٹھایا۔ مکان وسیع اور آراستہ ہے۔

اعزالدین پاشا

پانچ منٹ بعد پاشا اندر سے آئے۔ یہ ایک نوجوان خوشرو آدمی ہیں۔ کسی قدر انگریزی جانتے ہیں۔ بہت اخلاق کے ساتھ ملے۔ کہتے تھے میرے والد نے مجھکو علیحدہ بھی خط لکھا ہے۔ کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے رخصت ہونا چاہا تو انہوں نے روکا اور کہا میری والدہ نے مجھکو ہدایت کردی ہے کہ آپ لوگوں کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دوں۔ جب اصرار زیادہ ہوا تو ہم ٹھیر گئے۔ پاشا نے اپنا مکان دکھایا۔ عقب میں ایک خانہ باغ ہے۔ وہاں کرسیاں پڑی تھیں۔ دیر تک وہاں بیٹھکر باتیں کرتے رہے۔ باغ میں سے ایک قسم کا تازہ میوہ توڑ کر پاشا نے ہمکو

کھلایا۔ یہ میوہ لذیذ ہوتا ہے۔ ایک بجے کے قریب میز پر کھانا ہوا۔ کئی طرح کے خوش ذائقہ کھانے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر مکان کے بالائی حصہ میں بیٹھے۔ گراموفون بجتا رہا۔ اور قہوہ کے کئی دور ہوئے۔ اس اثناء میں پاشا کی بہن بھی آئیں۔ لباس بالکل یوروپین تھا۔ تقریباً ۲۰-۲۲ سال کی عمر ہوگی مگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی انگریزی اپنے بھائی سے زیادہ جانتی ہیں۔ دیر تک ہندوستان کے متعلق گفتگو رہی۔ آگرہ کے تاج محل کی انہوں نے بہت تعریف سنی ہے۔ اسکو دیکھنے کا بہت اشتیاق ظاہر کرتی تھیں۔ سہ پہر میں پاشا ہم کو اپنی موٹر میں قریب کے دو ایک مقامات پر لے گئے۔ قدرتی مناظر بہت دل آویز تھے۔ سرِ شام پاشا کی موٹر میں اسٹیمر کے اسٹیشن تک گئے۔ وہاں سے اسٹیمر میں سوار ہو کر استنبول واپس آئے۔

دوسرے دن ملاقات بازدید کیلئے پاشا ہمارے ہوٹل میں آئے۔ ہم نے بھی رواج کے مطابق قہوہ سے ان کی ضیافت کی۔ ہمارے پاس ہندوستان کے کچھ امام ضامن تھے جن پر کارچوبی کام میں "خدا حافظ" اور دوسرے دعائیہ جملے لکھے ہوئے تھے۔ ہم نے پاشا کو تین امام ضامن دیئے۔ اُس وقت ہمارے پاس اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں تھا۔ جس روز ہم استنبول سے چلنے لگے پاشا ہم کو خیرباد کہنے کی غرض سے ہوٹل آئے۔ ہم ہوٹل سے روانہ ہو چکے تھے اسلئے وہ ہم کو راستہ ہی میں ملے۔ انکی بہن بھی ساتھ تھیں۔ پاشا اسٹیشن تک آنا چاہتے تھے لیکن ہم نے اصرار کے ساتھ ان کو روک دیا۔ استنبول کی بنی ہوئی مٹھائی کا ایک بکس پاشا نے ہم کو دیا جسکو ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ پاشا کا نام اعزالدین ہے۔

پرنکی پو شہر کے قریب ایک جزیرہ ہے جسکو پرنکی پو کہتے ہیں۔ جمعہ کو یا کسی اور تعطیل کے دن لوگ کثرت سے وہاں

تفریح کے واسطے جایا کرتے ہیں۔ ہم بھی جمعہ کے دن اسٹیمر کے ذریعہ وہاں گئے۔ درجہ اول میں بھی مسافروں کی کثرت کیوجہ سے جگہ ملنا مشکل ہوگیا۔ مدرسہ کے کمسن لڑکے اور لڑکیاں تعطیل کے دن معلم یا معلمہ کے ساتھ سیر کیلئے باہر جایا کرتے ہیں۔ ان بچوں کی ایک بڑی جماعت اسٹیمر پر تھی جس وقت یہ بچے قومی راگ گاتے ہیں۔ ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہم تمام دن اس جزیرے میں بیٹھے رہے۔ خوب صورت جنگل ہے۔ یہاں ایک کرایہ کی کشتی میں بیٹھکر سمندر کی خوب سیر کی

ایک ناگوار واقعہ

اس سیر میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ کشتی والا باتوں میں مصروف تھا۔ سامنے سے ایک اسٹیمر تیز رفتاری کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ ایسے موقع پر کشتی کو فاصلہ پر ہٹا لیا کرتے ہیں تاکہ اسٹیمر کی زد سے دور رہے۔ بات یہ ہے کہ اسٹیمر کی رفتار پانی کو کاٹتی رہتی ہے جسکی وجہ سے اسٹیمر کے قریب چاروں طرف پانی میں تلاطم رہتا ہے۔ اگر کوئی کشتی بالکل قریب آجائے تو اس کے الٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہماری کشتی والا چونکہ غافل رہا اسٹیمر بالکل قریب آگیا۔ اسٹیمر نے سیٹی کے ذریعہ آگاہ بھی کیا مگر کشتی والا کسی قدر پریشان ہوگیا۔ غرض یہ کہ کشتی موجوں کی زد میں آگئی۔ ڈوبنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ نصف سے زیادہ الٹ گئی۔ خداوند کریم کا فضل شامل حال تھا جو خود بخود سیدھی ہوگئی۔ کچھ فاصلہ پر دو عورتیں کشتی چلاتی چلی جارہی تھیں۔ فوراً ہماری طرف اظہار ہمدردی کے لئے آئیں مگر ہماری زبان سے واقف نہ تھیں۔

عام حالات

لوگ عام طور پر دو زبانیں جانتے ہیں۔ ترکی اور فرانسیسی۔ انگریزی بولنے والے بہت کم ہیں۔

بازار میں بوقت ضرورت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ دو ایک دفعہ بازار میں پیشاب خانہ تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ انگریزی۔ فارسی اور عربی الفاظ استعمال کئے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا بالآخر ہوٹل واپس آنا پڑا۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ ٹیکسی والے سے کرایہ کے متعلق تکرار ہوئی۔ وہ اپنی کہتا تھا اور ہم اپنی کہتے تھے۔ راستہ چلنے والے حلقہ بنا کر تماشہ دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ ان میں انگریزی سے واقف کوئی نہ ہوتا۔ ایسے موقع پر اجنبی آدمی ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ اول تو لوگ جمع ہو کر مسافر کو ایک تماشہ بنا لیتے ہیں۔ دوسرے زبان کی اجنبیت پریشان کرتی ہے ہر موقع پر اشاروں سے کام لینا مشکل ہوتا ہے۔ غیر ملک میں ہنگامہ آرائی کر کے قانون کے جھمیلوں میں پھنسنا مسافر کے واسطے نامناسب ہے۔ ٹیکسی والا بھی ان باتوں کو سمجھتا تھا اور اپنی بات پر اڑا رہتا تھا۔ آخر میں جیت اسی کی رہتی تھی۔ جو کچھ وہ مانگتا دینا پڑتا۔ اگرچہ ٹیکسی میں میٹر لگا رہتا ہے لیکن اجنبی مسافر کو دیکھکر یہ لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ منزل پر پہنچتے ہی میٹر کو ملا دیتے ہیں اور من مانے کرایہ مانگتے ہیں۔

استنبول کے دیسی رسٹوران نہ تو صاف ستھرے ہیں اور نہ ان میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ البتہ پیرا میں اچھے اچھے یوروپین رسٹوران ہیں۔ ہم کو اپنے ہوٹل کا کھانا پسند نہ آیا۔ باہر کسی رسٹوران میں کھا لیا کرتے تھے۔ سارے شہر میں کوئی عورت نقاب پوش یا کوئی مرد ترکی ٹوپی پہنے ہوئے دکھائی نہیں دیا۔ لباس اور زبان یکساں ہونیکی وجہ سے عیسائی اور مسلمان میں امتیاز نہیں ہوسکتا۔

بے نقاب عورتیں پردہ کی قید سے آزاد ہونیکے بعد ترک عورتیں اکتساب معیشت میں بھی حصہ لینے لگیں چنانچہ ڈاکخانہ اور ریل کے دفاتر میں اکثر مسلمان عورتیں کام کرتی ہوئی دکھائی دینگیں

اقتصادی پہلو سے اگر دیکھو تو عورتوں کا بے نقاب ہو جانا ملک کے واسطے بڑی حد تک مفید ثابت ہوا لیکن اندیشہ یہ ہے کہ روزانہ میل جول کیوجہ سے یورپین طرز معاشرت کی قابل اعتراض باتیں یہاں کی سوسائٹی میں داخل نہ ہو جائیں۔ اگر یہ لوگ حیا سوزی کی زہریلی ہوا سے اپنے کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ثابت ہوئے تو بے شک یہ جدید طرز معاشرت مبارکباد کے لائق ہے لیکن یورپ اور ہندوستان کے بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ ترکوں نے اپنے قومی امتیاز کو مٹا دیا ہے۔ ٹوپی کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط بھی اٹھا دیا گیا ہے۔ اب جدہر دیکھو جدید رومن رسم الخط دکھائی دیگا۔ خدا کرے یہ سب باتیں ملک کے حق میں مفید ثابت ہوں اور یہ مجاہدین اسلام صراط المستقیم پر قایم رہیں۔ اتنا تو ہم بھی ضرور کہینگے کہ قدیم اسلامی شان و شوکت کے آثار یہاں مطلق پائے نہیں جاتے۔ یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم کسی اسلامی سلطنت میں آئے ہوئے ہیں ؎

گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب باد بہار
رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہو گی زینہار

جمعہ کے دن عام طور پر تعطیل ہوتی ہے۔ کاروبار بند رہتا ہے۔ عیسائیونکو بھی اسکی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اتوار کے دن عیسائیوں کو اختیار ہے چاہے کاروبار بند کریں یا جاری رکھیں۔ موسم ایک حالت پر نہیں رہتا دن بھر میں کئی رنگ بدلتا ہے۔ گرمی بھی ہوئی اور سردی بھی لیکن پارہ کبھی (۸۰) ڈگری سے اونچا نہیں ہوتا۔ ترکی ایک پونڈ کا نوٹ تقریبًا دو شلنگ کے برابر ہوتا ہے اور ایک پونڈ کے سو پیاسٹر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر رواج نوٹوں کا ہے سکہ کی مالیت کم ہونیکی وجہ سے نوٹ کثیر تعداد میں رکھنے پڑتے ہیں دکانوں میں اشیاء کی قیمت پیاسٹر میں لکھی ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک چیز کی قیمت

دو سو پیاسٹر ہوتی ہے۔ اجنبی آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ بڑی مہنگی چیز ہے لیکن حساب لگا کر دیکھو تو تین روپیہ کے قریب ہوئے۔

استنبول سے روانگی

دوسری جون کو شام کے چھ بجے کے قریب حیدر پاشا ریلوے اسٹیشن سے ہم بداپسٹ روانہ ہوئے۔ امریکن اکسپرس کمپنی کے ذریعہ ریل کے ٹکٹ خریدے۔ ہنگری اور بلقان کا (جسکو اب یوگوسلیویا کہتے ہیں) کچھ سکہ بھی لیا۔ ہر ملک کا سکہ پہلے ہی سے بنوا لینا چاہئیے۔ ورنہ بڑی تکلیف گذرتی ہے۔ کک کمپنی اور امریکن اکسپرس کی معرفت بلامعاوضہ یہ کام ہو جاتا ہے۔ بداپسٹ کے ہوٹل کا پتہ بھی امریکن اکسپرس سے معلوم کر لیا۔ چونکہ ریل میں دو دن اور دو راتیں گذارنی تھیں اسلئے رات کے آرام کا بندوبست ضروری تھا چنانچہ بداپسٹ تک ؔ ویگن لی کی گاڑی میں سفر اختیار کیا۔ راست برلن تک ٹکٹ لینے میں سہولت معلوم ہوئی فی شخص (ع۵ پونڈ دس شلنگ کرایہ ہوا۔ ویگن لی ایک کمپنی ہے جس کا الحاق حال میں کک کمپنی کے ساتھ ہو گیا۔ کمپنی مذکور اس قسم کی گاڑیاں تیار کرتی ہے جن میں سونے کا بندوبست ہوتا ہے۔ ایک گاڑی میں تقریباً تیس مسافر سفر کر سکتے ہیں دو برتھ کا ایک کمپارٹمنٹ ہوتا ہے اس میں منہ ہات دھونے کیلئے سیلاپچی۔ کانچ کی صراحی میں پینے کا پانی۔ توال۔ صابن غرض کہ آسائش کا سب سامان موجود رہتا ہے۔ مخملی بانات کے گدے اور نفیس صاف ستھری گاڑیاں ہیں۔ ایک ملازم خدمت کے واسطے ہر وقت گاڑی میں متعین ہے۔ سر شام کمپارٹمنٹ میں بستر کر دیتا ہے اور صبح کو لپیٹ کر نیچے کیطرف رکھدیتا ہے یہ ریل بہت آہستہ چلتی ہے۔

بلگیریا

استنبول سے روانہ ہونیکے بعد علی الصبح ہم بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہوئے۔ سابق میں اس حصہ ملک کو بلقان کہتے تھے لیکن جنگ عظیم کے ختم پر تمام صوبہ کی کایا پلٹ ہوگئی۔ بلغاریہ۔ سرویا۔ مانٹی نیگرو آسٹریا کا کچھ حصہ شامل کرکے ایک علیحدہ صوبہ قایم ہوا جسکو یوگوسلیویا کہتے ہیں۔ اس جدید صوبہ کا دارالسلطنت بلگریڈ ہے۔ بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہونیکے بعد ایک اسٹیشن پر مسافروں کا سامان دیکھا گیا۔ سختی کی حالت یہ ہے کہ اسٹیشن پر ریل کے پہونچتے ہی وردی پہنے ہوئے سپاہی قطار باندھکر ٹرین کے قریب کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں چائے پینے کی غرض سے پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا مگر ان سپاہیوں نے روک دیا۔ ہمارے درجہ کا ملازم انگریزی جانتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبتک سامان کا معائنہ نہ ہوجائے پلیٹ فارم پر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ ہم نے ہرچند سمجھایا کہ اول تو ہم اس ملک میں اُترنے کا ارادہ نہیں رکھتے دوسرے یہ کہ چائے پیکر فوراً واپس آجائیں گے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

کروڑگیری والونکی سختی

کوئی چیز محصول طلب ہمارے پاس نہ تھی۔ یہ عجیب زبردستی ہے کہ ریل میں بھی اسباب دیکھتے ہیں۔ جو لوگ علاقہ انگریزی سے ریاست نظام میں آتے ہیں ان کو اکثر غل مچاتے سنا ہے کہ سامان کھول کر دیکھنا نہایت بدنما طریقہ ہے۔ اس سے مسافرونکو پریشانی ہوتی ہے۔ اُن حضرات کو غالباً یہ معلوم نہیں ہے کہ یورپ کے اکثر ممالک میں حیدرآباد سے زیادہ سختی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تو نہیں ہوتا کہ ریل میں اسباب کھلواکر مسافروں کو تکلیف دیجائے۔ اور پلیٹ فارم پہ پہرہ کھڑا کرکے مسافرونکی آزادی کو سلب کرلیا جائے۔ الغرض جب اس مصیبت سے

نجات ملی تو ہم اسٹیشن پر گئے ریل چھوٹنے کے قریب تھی اسلئے جلدی جلدی صرف ایک پیالی چائے پیکر واپس آگئے۔ خالی پیٹ تکلیف دیتا رہا۔ شکر ہے کہ حیدرآباد کا قانون کروڑگری مسافر کو بھوکا نہیں رکھتا۔ کھانے کی گاڑی جو استنبول سے لگی تھی وہ رات کو کسی اسٹیشن پر علٰحدہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آگے چلکر صوفیا پر دوسری گاڑی لگے گی۔

ایک نقصان

یہ واقعہ بھی لایق ذکر ہے کہ رات کو ہم نے کھانا ریل ہی میں کھایا تھا۔ کھانیکے بہت دیر بعد ڈائننگ کار کا آدمی ہمارے درجہ میں بل لیکر آیا۔ ہمارے پاس بل ادا کرنیکے لایق سکّے نہیں تھے اسلئے ایک بڑی رقم کا نوٹ اسکو دیدیا۔ زبان کی اجنبیت کیوجہ سے بات چیت نہ ہو سکی۔ لیکن اشارہ سے اسکو یہ سمجھا دیا کہ بقیہ رقم واپس کر دینا۔ اسکی خبر نہ تھی کہ رات ہی کو یہ گاڑی علٰحدہ ہو جائیگی۔ اس خیال سے کہ صبح کو حساب ہو جائے گا۔ ہم نے تقاضا بھی نہیں کیا اور بے فکری کے ساتھ سو گئے۔ صبح کو چائے کے وقت یہ سنا کہ گاڑی رات ہی کو الگ ہو گئی۔ ہم نے اپنے ملازم سے یہ قصہ بیان کیا تو اُس نے کہا اگر رات ہی کو مجھ سے کہتے تو میں رقم واپس لا دیتا اب مجبوری ہے۔ یا تو وہ آدمی یہ سمجھا کہ تم نے اسکو انعام دیا ہے یا اس نے جان بوجھکر بے ایمانی کی۔ اسوقت ہم کو خیال ہوا کہ ہم ابھی یورپ میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ حصہ ملک برائے نام یورپ ہے۔

صوفیا اور اسکے باشندے

ریل سے قدرتی مناظر اچھے دیکھنے میں آئے۔ دونوں جانب جنگل خودرو پھولوں کے تختوں سے مالامال تھا۔ بلامبالغہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے چمن لگادیا ہے لیکن اصل میں یہ کاریگری کارکنان قدرت کی تھی۔ صوفیا ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ کوئی خاص چیز دیکھنے کے لایق یہاں نہیں ہے

اسلئے ہم اس مقام پر نہیں اترے۔ شہر اسٹیشن سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ بلغاریہ کا دارالسلطنت ہے۔ بلگر لوگ در اصل ایشیائی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں بلقان میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اُسوقت سے جنگ عظیم تک اس ملک میں کبھی امن نہ رہا ہمیشہ جنگ وجدل میں اُن کا وقت گذرا۔ لوگ مضبوط اور جفاکش ہیں۔ اُن کا اصلی پیشہ زراعت ہے۔ جنگ عظیم میں بلغاریہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ نتیجہ میں نقصان اٹھانا پڑا۔ نہ صرف قومی قرضہ کا بار اُن پر ہے بلکہ ڈھائی ہزار مربع میل سے کچھ زاید زرخیز حصۂ زمین ہاتھ سے جاتا رہا۔ پانچ سو برس تک ترکوں کے زیر حکومت رہنے کے بعد انہوں نے آزادی حاصل کی تھی لیکن جرمنی کو امداد دینے کی وجہ سے ان پر تباہی آئی۔

لباس صوفیا میں مسلمانوں کی آبادی تین ہزار کے قریب ہے۔ یہ لوگ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں نقاب پوش ہیں۔ ترکی کے جدید طرز تمدن کا اثر ان لوگوں پر نہیں ہوا۔ یہاں کے باشندوں کا لباس نہ تو خالص یوروپین ہے اور نہ مشرقی۔ شہر کے رہنے والے تعلیم یافتہ لوگ بالکل یوروپین لباس پہنتے ہیں مگر جو زراعت پیشہ اور غیر تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنے اصل لباس پر قایم ہیں۔ ایک قسم کی گول اور چپٹی ٹوپی ہوتی ہے جسکو استراخانی کہتے ہیں۔ اس کا بہت رواج ہے۔ نیلے رنگ کے موٹے کپڑے کے قمیص۔ اس پر خوبصورت کشیدے کے کام کی صدری۔ سفید یا نیلے رنگ کا پیجامہ جو گھٹنے کے نیچے سے تنگ اور اوپر کی جانب ڈھیلا ہوتا ہے۔ کمر کے اطراف ایک سُرخ رنگ کا پٹکہ۔ یہ انکا معمولی لباس ہے۔ جوتے کچھ عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں پر گودڑ لپیٹ لیا ہے۔ عورتیں شوخ اور بھڑک دار لباس پہنتی ہیں سیاہ اور لمبے بالوں پر خوش رنگ کسا وا۔ سفید لٹھے کا گون (لہنگا) جس پر کشیدے کا کام ہوتا ہے۔

بہت مقبول ہے۔ اکثر سفید گون پر ایک دوسرا رنگین گون گل بوٹے کا خوبصورتی کیلئے پہنا جاتا ہے۔ رنگ برنگ کی صدریاں کشیدہ کے کام کی بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کم سن لڑکیوں کی متعدد چوٹیاں ہوتی ہیں جنکو سونے چاندی کے سکوں یا کوڑیوں سے آراستہ و پیراستہ رکھتے ہیں۔ ان عورتوں کو دیکھکر مجھے ہندوستان کی بنجارنیں یاد آئیں۔ تقریباً اسی نمونہ کا لباس ہوتا ہے۔ تعلیم بہت کم ہے۔ سنا ہیکہ گورنمنٹ کے خزانہ میں اس قدر روپیہ نہیں ہے کہ مدارس کا بار زیادہ اٹھا سکے۔

اسٹیشنوں پر ایک قسم کا میوہ بکثرت دیکھنے میں آیا۔ یہ بیر کے برابر سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں اُن کو رکھکر اوپر سے سرخ رنگ کا باریک کپڑا ڈھانک دیتے ہیں۔ یہ وہی میوہ تھا جو استبول میں پاشا کے مکان پر ہم کھا چکے تھے۔ علی الصبح ایک عورت یہ میوہ بیچتی ہوئی آئی۔ پوری ٹوکری خریدنا ہماری ضرورت سے زاید تھا۔ ہم نصف ٹوکری خریدنا چاہتے تھے مگر بیچنے والی اس پر راضی نہ ہوئی۔

ایک ترک مسافر

ہمارے پہلو کے ڈبے میں ایک ترک مسافر معہ اپنی بیوی کے تھے۔ یہ بھی نصف ٹوکری خریدنا چاہتے تھے ہم نے پوری ٹوکری خریدلی ترک مسافر ہمکو نصف ٹوکری کی قیمت دینا چاہتے تھے لیکن ہم نے لینے سے انکار کیا اور نصف میوہ اُن کو دیدیا۔ اس کا بدلہ اتارنے کی ان کو بڑی گھبراہٹ تھی۔ فوراً اپنے درجے میں سے ایک بکس استنبول کی مٹھائی کا لائے یہ اسی قسم کی مٹھائی تھی جو پاشا نے ہمارے ساتھ استبول سے کردی تھی۔ ہم نے ایک ڈلی اس میں سے لے لی۔ یہ ترک مسافر صوفیا پر اتر گئے۔ دو روز بعد تجارت جائیں گے۔ بین الاقوامی زبان یعنے اشاروں کے ذریعہ جس قدر بات چیت اُنسے ہوسکی اس سے پتہ یہ چلا کہ کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ بیوی یورپین لباس میں اور بے نقاب تھیں۔ صوفیا پر تین چار عورتیں ان کو لینے کے واسطے آئی تھیں۔

وہ بھی بے نقاب تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی یہاں کے رہنے والی نہیں ہیں ورنہ نقاب پوش ہوتیں

بلگریڈ کا اسٹیشن

۱۴ ار جون کو صبح کے وقت ہم بلگریڈ پہونچے۔ یہاں ایک دوسری ریل تیار ہو گی اور ہمارا درجہ اس ریل میں لگ جائے گا۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ تقریبًا چھے گھنٹے کا وقفہ یہاں ملیگا۔ شہر بالکل ملحق ہے اسلئے سیر کرنے کا کافی موقع تھا۔ میں کسی قدر سویرے اٹھکر ناشتہ کیلئے تیار ہو گیا۔ ریل جب پلیٹ فارم پر ٹھیری تو میں اس خیال سے اترا کہ رفرشمنٹ روم میں جاکر ناشتہ کر لوں۔ سلیم بیگ اور رفیق بیگ ہنوز ریل ہی میں تھے۔ پلیٹ فارم کے ایک کونہ میں ٹرین سے کسی قدر دور رفرشمنٹ روم تھا۔ اسکے سامنے ورانڈہ میں میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں مگر وہ حصہ لکڑی کے کٹھرے سے محصور تھا۔ دروازہ پر ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا۔ اندر جاتے وقت اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ورانڈہ میں نشست خالی نہ تھی اسلئے میں کمرہ میں چلا گیا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے تک پندرہ بیس منٹ لگے۔ اسکے بعد میں پلیٹ فارم پر واپس ہونیکے لئے جب نکلا تو ٹکٹ کلکٹر نے

ایک پریشانی

روک دیا لیکن بڑی وجہ پریشانی کی یہ پیدا ہو گئی کہ پلیٹ فارم پر سے ہماری ریل غائب تھی۔ ٹکٹ کلکٹر انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں نے باہر جانے کیلئے جب اصرار کیا تو اس نے دروازہ میں قفل ڈالدیا۔ میں نے بین الاقوامی زبان میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ریل کہاں چلی گئی اور ہمارا کمپارٹمنٹ کیا ہوا۔ اس نے زبان سے تو بہت کچھ کہا مگر سمجھنے والا کون تھا۔ مجھکو خوف یہ ہوا کہ ریل چھوٹ نہ گئی ہو اور جو اطلاع دیر تک ٹھیرنیکی ملی تھی وہ غلط ہو۔ میرا ٹکٹ ریل ہی میں تھا۔ اور جیب میں نہ تو روپیہ تھا نہ پاسپورٹ رفرشمنٹ روم میں انگریزی داں آدمی کو تلاش کیا مگر کوئی نہ ملا۔ ٹکٹ کلکٹر اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس پریشانی میں ایک اطالوی مسافر دکھائی دیا جو ہماری

گاڑی میں استنبول سے آیا تھا۔ یہ شخص کسی قدر انگریزی جانتا تھا۔ اس سے میں نے کہا کہ کچھ مدد کرو۔ اس نے ٹکٹ کلکٹر سے خدا معلوم کیا باتیں کیں لیکن مجھ سے کہا تم کو اندر ہی ٹھیرنا ہوگا کیونکہ یہاں اجنبی مسافروں پر نگرانی سخت ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا یہ تو بتاؤ کہ ریل کدہر غائب ہوگئی۔ اس نے کہا ریل تو چھوٹ گئی اب تم کو کسی دوسری ریل سے جانا پڑے گا۔ یہ سنکر ایک سناٹا سا آگیا۔ لیکن مجھکو یقین نہ آیا۔ ممکن ہے کہ اس نے مذاق کیا ہو یا اسکو خود معلوم نہ ہو۔ غرض یہ کہ مختلف قسم کے خیالات دل میں آتے تھے اور پریشانی بڑہتی جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد خدا معلوم ٹکٹ کلکٹر کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے دروازہ کھولدیا۔ اسٹیشن پر متعدد پلیٹ فارم تھے۔ ایک پر ریل کھڑی دکھائی دی دوڑکر اس طرف گیا مگر یہ معلوم کرکے مایوس ہوئی کہ یہ نہ تو ہماری ریل ہے اور نہ اس میں ہمارا درجہ ہے۔ کئی آدمیوں کے ساتھ اشارہ بازی رہی لیکن تھوڑی دیر کی تفریح کے سوا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بالآخر مایوس ہوکر رفرشمنٹ روم کیطرف واپس آگیا۔ یہاں کی زبان بھی خاص ہے۔ نہ تو جرمن ہے اور نہ فرانسیسی۔ رسم الخط بھی کچھ عجیب ہے۔ حروف پڑھے نہیں جاتے۔ مجھے بیت الخلا کی تلاش تھی۔ سارے اسٹیشن کا چکر لگا ڈالا۔ کمرے تو بہت سے تھے اور ہر کمرہ پر بورڈ لگا ہوا لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ بیت الخلا کونسا ہے۔ اتفاق سے اطالوی مسافر پھر ملا۔ اس سے دریافت کیا تو اس نے اشارہ سے سامنے ایک کمرہ کو بتایا جس پر عجیب نمونہ کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ کمرہ پر ایک سن رسیدہ عورت بطور نگرانکار کھڑی تھی۔ عورت کو دیکھکر خیال ہوا کہ شاید یہ زنانہ بیت الخلا ہو۔ اندر جانے میں پس و پیش ہوا۔ دوبارہ اطالوی مسافر سے جاکر پوچھا۔ اس نے کہا تم عورت مرد کا خیال نہ کرو بلا تکلف اندر چلے جاؤ۔ باوجود اسکے میں کسی قدر رکتا ہوا گیا۔ عورت نے کچھ پوچھا مگر میں نے صرف گردن ہلادی اس نے اندر جانے کے لئے اشارہ کیا۔ کمرہ میں داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ اندر کی جانب دو کمرے ہیں ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ۔ داخلہ کے کمرہ میں ایک طرف منہ ہات دہونے کا سامان

لگا ہوا تھا۔ سفید اور اُجلے تو ال۔ کنگھا۔ برش اور کچھ خوشبو کی چیزیں سلیقہ کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ حوائج سے فارغ ہونیکے بعد منہ ہاتھ دھویا۔ خادمہ نے ٹوپی اور کپڑوں پر برش کر دیا۔ کچھ مقامی سکے جیب میں پڑے تھے۔ اسکو محض اندازہ سے چند سکے دیدیئے پیسے لیکر اس نے کچھ کہا جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہت کم دیا گیا۔ کچھ پیسے اور دیئے لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ کتنے دیئے۔ بعد کو تحقیق ہوا کہ اصل سکہ یہاں کا دینار ہے جو تقریبًا آٹھ آنے کے برابر ہوتا ہے۔ ایک دینار کے سو پیسے ہوتے ہیں۔ جنکو پراس کہتے ہیں۔ میں نے خادمہ کو پہلی دفعہ چار پانچ پراس دیئے تھے جو شاید دو پیسے کے برابر ہوتے ہونگے۔ جب ہی اس نے عذر کیا کیونکہ یورپ میں دو پیسے کیا چیز ہوتے ہیں اس قصہ کو ختم کر کے جب کمرہ سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دونوں بھائی اسٹیشن پر میری تلاش میں پریشان پھر رہے ہیں۔ کیا خوب یا تو کچھ دیر پہلے میں انکی تلاش میں سرگرداں تھا یا اب وہی فکر ان کو لاحق ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ سب کی پریشانی دور ہوئی۔ یہ معلوم ہوا کہ ریل سے علیحدہ کرنیکے بعد ہمارے درجہ کو اسٹیشن سے فاصلہ پر چھوڑ دیا تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ اتنی سی بات معلوم کرنا کس قدر مشکل ہو گیا تھا۔ خدا کسی اجنبی آدمی کو ایسے ملک میں جہاں کی زبان سے وہ ناواقف ہو کبھی بیمار نہ ڈالے مرض کچھ ہوگا اور دوا کچھ ملیگی۔ زندہ واپس آنا مشکل ہو جائیگا۔ قدرت کی کارسازیوں کو دیکھو کہ ایک بنی نوع انسان کو کتنی مختلف زبانیں بخشی ہیں اس چھوٹے سے دماغ کی وسعت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک آدمی پچاسوں زبانیں بول سکتا ہے اور ہر زبان کے الفاظ کو ان کے مفہوم کے ساتھ برسوں اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ سیاح کے واسطے بہت ضروری ہے کہ جس ملک کی سیر کے لیئے جائے وہاں کی زبان سے بھی آشنا ہو ورنہ سیاحت چنداں مفید نہ ہوگی۔ کیونکہ اصلی چیز تبادلہ خیالات ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ انسان ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو سکتا ہے۔ لطف تو اسی میں ہے کہ

کچھ اپنی کہے اور کچھ دوسرے کی سنے۔ اور جب بات ہی نہ کروگے تو ایک دوسرے کے حالات سے کیا خاک مطلع ہو سکتے ہو۔ جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی کورے واپس آ گئے بقول ارشدی سمرقندی ؎

کسے کز وہنر و عیب باز خواہی جسُت
بہانہ ساز و بگفتارش اندر ار نخسُت
سفال را ز طپانچہ زدن ببانگ آرند
ببانگ گرد دپیدا شکستگی ز درُست

خدا بھلا کرے کک کمپنی اور امریکن اکسپرس کا کہ ان کمپنیوں کی معرفت غیر ممالک کی سیر بخوبی ہو جاتی ہے۔

ریل کا خادم

رائے قرار پائی کہ شہر کی سیر کے واسطے چلنا چاہئے لیکن یہ بھی خیال ہوا کہ کسی رہبر کو ساتھ لینا مناسب ہوگا۔ ہمارے درجہ کا خادم کیونکہ زبان سے واقف تھا اسلئے اس سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ ایک فیشن ایبل سوٹ پہنکر آ گیا۔ خاصا جنٹلمین معلوم ہوتا تھا۔ یورپ کی تین چار زبانوں میں یہ گفتگو کر سکتا ہے۔ حضرت کی سوانح عمری بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اصلی وطن روس ہے لیکن پیدا ہوئے جرمن میں۔ باپ انگریز مگر ماں روسی۔ کمپنی سے جو تنخواہ اسکو ملتی ہے وہ زیادہ نہیں لیکن مسافروں سے انعام و اکرام ملتا رہتا ہے۔ اسطرح ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے قریب اسکو ملجایا کرتے ہیں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی۔ کہتا تھا اس قلیل آمدنی میں شادی کر کے بیوی کا خرچ کہاں سے اُٹھاؤں ہمارے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ میں بیوی تو ایک طرف کنبہ کی پرورش لوگ کرتے ہیں۔ اور شادی تو اکثر بے روزگاری کے عالم میں ہو جاتی ہے اگر پوچھو کہ بال بچوں کی گذر

کیسے ہوگی تو جواب یہی ملتا ہے کہ ؎

کارساز ما بفکر کار ما　　　　فکر ما در کار ما آزار ما

بلگریڈ

بہت دیر تک شہر میں پھرتے رہے۔ اب بلگریڈ از سرتاپا نیا بنگیا ہے۔ قدیم عمارتوں کو توڑ کر چوڑی چوڑی پختہ سڑکیں نکالی گئی ہیں۔ چوراہوں پر بڑے بڑے حوض اور ان میں خوشنما فوارے لگے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف خوبصورت اور عالیشان عمارتیں تیار ہوگئی ہیں۔ قدیم حصہ برائے نام کہیں کہیں باقی ہے جسکو جدید شہر سے کوئی مناسبت نہیں۔ آرائش کا کام ہنوز بہت تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ یہ شہر دریائے ڈینوب اور ساوے کے سنگم پر واقع ہے۔ لب دریا ایک قلعہ اکیسو تیس فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس قلعہ میں قارا مصطفےٰ کی قبر ہے۔ یہ ایک مشہور ترکی وزیراعظم تھا۔ ایک عرصہ تک روسیوں کے مقابلہ میں معرکہ آرائی کرتا رہا اسکے بعد جب ملک ہنگری نے آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو مصطفےٰ قری نے ہنگری کا ساتھ دیا۔ ویانا کا محاصرہ کیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا اس شکست کی پاداش میں سلطان کے حکم سے مصطفےٰ قری کو بلگریڈ میں قتل کیا گیا اور ایک چاندی کی کشتی میں اس کا سر رکھکر سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ ایک مشہور اور جنگجو ترکی سپہ سالار تھا۔ ۱۵۲۱ء میں سلطان سلیمان نے اس شہر کو فتح کیا اور ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر ترکوں کی حکومت قایم رہی۔ اسکے بعد کچھ دنوں آسٹریا کا قبضہ رہا۔ ۱۶۹۰ء میں دوبارہ ترکوں نے آسٹریا سے چھین لیا۔ مگر یہ حکومت عارضی تھی کیونکہ کوئی پچیس برس بعد ہی آسٹریا نے حملہ دوبارہ کیا اور ترک مدافعت نہ کرسکے۔ بالآخر قبضہ چھوڑنا پڑا۔ ۱۷۳۰ء میں ایک اخیر انقلاب ترکوں کے حق میں ہوا۔ یہ پھر شہر پر قابض ہوئے۔ مگر ایک سو تیس برس کے قریب حکومت کرنیکے بعد ہمیشہ کے واسطے اس ملک والوں کے حق میں دست بردار ہوجانا پڑا۔ ترکوں کے

تاریخی کارنامے بھی خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ بلگریڈ کے قلعہ کو دیکھکر دل پر ایک خاص اثر ہوا۔ کیسی جد وجہد اور جان توڑ کوشش کے بعد یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی۔ لیکن من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال۔

جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب

لباس

قدیم عمارتوں میں مسجد۔ گرجا اور شاہی محل ہیں۔ دریا کے کنارے پر ایک خوبصورت چمن ہے جہاں لوگ تفریح کی خاطر جمع ہوتے ہیں لباس تقریباً وہی ہے جو صوفیا میں دیکھا گیا۔ عورت مرد دونوں زرق برق اور شوخ رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں البتہ شہر کے تعلیم یافتہ طبقے میں یوروپین لباس مروج ہے مسلمان عورتیں زیادہ تر پنجابی وضع کا پیجامہ پہنتی ہیں مگر ان میں جو نئی روشنی والی ہیں انہوں نے اگرچہ اونچا فراک اختیار کر لیا ہے لیکن نقاب کو ابھی تک نہیں چھوڑا یوروپین لباس پر نقاب ایک بے جوڑ سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ شہر کی سیر سے فارغ ہو کر ریل کے وقت ہم اسٹیشن واپس آگئے۔

بداپسٹ کا ہوٹل

چوتھی جون کو رات کے آٹھ بجے کے قریب ہم بداپسٹ پہونچے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں پہونچنے کے بعد رہبروں اور ہوٹل کے نمائندوں سے نجات ملی اسٹیشن پر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آتا۔ اسٹیشن کے پاس امپیریل ہوٹل میں قیام کیا جس کا پتہ ہم کو استنبول میں امریکن اکسپرس کے ذریعہ ملا تھا۔ اچھا بڑا ہوٹل ہے۔ کھانیکا انتظام بھی معقول ہے لیکن کرایہ وغیرہ کے متعلق آتے ہی تصفیہ کر لینا چاہئے۔ اگر دونوں وقت کا کھانا پابندی کے ساتھ ہوٹل میں کھاؤ تو کرایہ کم ہوگا۔ باہر کھاؤ تو زیادہ ہوگا۔ ہم نے لاعلمی کی وجہ سے اس کا تصفیہ

نہیں کیا تھا۔ آخر میں کرایہ زاید دینا پڑا۔ ہوٹل کا منیجر آدمی خلیق اور انگریزی داں ہے ملازمین انگریزی سے ناواقف ہیں۔ جرمن بولتے ہیں۔ چیمبر میڈ یعنے خادمہ کو مطلب سمجھانے میں اشاروں سے کام لینا پڑا۔ دو ایک دفعہ تو یوں کام چلایا کہ کاغذ پر انگریزی میں مطلب لکھدیا۔ خادمہ نیچے منیجر کے پاس لیگئی اور اس نے جواب لکھدیا۔ کبھی کبھی بات چیت والی کتاب بھی کام دیتی تھی۔ کمروں کے لحاظ سے کرایہ کم زیادہ ہے فی شخص آٹھ شلنگ یومیہ دینے پڑے۔

بداپسٹ

یہ شہر دریائے ڈینیوب کے دونوں جانب واقع ہے۔ دریا کے ایک جانب قدیم حصہ ہے جس کو بدا کہتے ہیں۔ دوسری جانب کی آبادی نسبتاً جدید ہے جس کو پسٹ کہتے ہیں اور پورے شہر کو بداپسٹ کہتے ہیں۔ یہ شہر صوبہ ہنگری کا دارالسلطنت ہے۔ آبادی اسکی نو لاکھ تیس ہزار سے اوپر ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ شہر بارونق اور خوبصورت ہے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک ترکوں نے یہاں حکومت کی لیکن اس زمانہ میں یہاں کے باشندے بیرونی حکومت سے آزاد ہونے کیلئے جان توڑ کوشش کرتے رہے بالآخر (۱۶۸۶) سولہ سو چھیاسی عیسوی میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ شہر کا جو حصہ پسٹ کے نام سے موسوم ہے وہ نہ صرف کاروبار کے لحاظ سے ممتاز ہے بلکہ عالیشان عمارات اور بڑے بڑے بازار بھی اسی حصہ میں ہیں۔ اِن بازاروں کے نام کچھ ایسے سخت ہیں کہ اردو میں اُن کا تلفظ ادا ہونا بہت مشکل ہے۔ دو بازار جو سب سے خوب صورت معلوم ہوے وہ اندرسی اور کراسپی ہیں۔ اندرسی میں ناچ گھر کی عمارت دیکھنے کے لایق ہے۔ یہ اس ملک کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ خیال کیجاتی ہے۔ نامور مصورین کی کاریگری اُن تصاویر سے ثابت ہوتی ہے جو مکان کی چھت اور دیواروں پر منقش ہیں۔ قریب ہی ایک تصویر خانہ ہے جو ۱۹۰۶ء عیسوی میں قائم ہوا۔ اسمیں

اعلیٰ درجہ کی تصاویر کا بڑا ذخیرہ ہے۔ زیادہ تر رونق دریا کے کنارہ پر رہتی ہے۔ شام کے وقت چہل قدمی کے واسطے یہ مقام بہت دلکش ہے۔ یہاں بڑا مجمع رہتا ہے۔ اس نواح میں ایک عمارت ہے جس میں مشرقی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ نیچے کی منزل میں سفر کے متعلق معلومات بہم پہونچانیوالی مختلف کمپنیوں کے دفاتر ہیں۔ اُوپر کی منزل بطور ناچ گھر استعمال کیجاتی ہے۔ اسکے متصل جو دریا کا کنارہ ہے وہ فرانسس جوزف کوئے کہلاتا ہے۔ اس کو کارسو بھی کہتے ہیں۔ یہ سڑک تقریباً ڈیڑھ میل لمبی ہے۔ سڑک کے برابر عالیشان عمارتیں اور درخت ہیں۔ مخالف سمت پر یعنے دریا کے اوس جانب قلعہ ہے جس کا منظر اس سڑک سے بہت دلکش ہے۔ ایک جانب پارلیمنٹ کی عالیشان عمارت ہے جو ۱۹۰۲ء میں مکمل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ لندن میں جو پارلیمنٹ کی عمارت ہے اسکے بعد خوبصورتی اور وسعت میں اس عمارت کا جواب یورپ میں نہیں ملتا۔ اس کا طول (۸۷۰) فیٹ ہے۔ وسط میں ایک عالیشان گنبد بنا ہوا ہے پارلیمنٹ کے متصل عدالتی مکانات دیکھنے کے لائق ہیں۔ یہاں کا سب سے بڑا گرجا جو سینٹ اسٹیفن کے نام سے مشہور ہے اندرسی بازار سے قریب ہے۔ اطالوی طرز کی خوبصورت عمارت ہے۔ اندرونی آرائش اور پچی کاری دیکھکر دل خوش ہوتا ہے شہر میں ایک اور مقام تفریح کا وارِدس لیجٹ ہے جو کھیل کود کے واسطے مخصوص ہے۔ اس کا رقبہ (۲۴۰) ایکڑ کے قریب بیان کیا جاتا ہے۔ پھولوں کی افراط اور سبزہ سے یہ جگہ گلدستہ بنی ہوئی ہے۔ یہاں دل بہلانے کے بہت کچھ سامان ہیں۔ چڑیا خانہ اور عجائب گھر بھی قریب ہی میں ہے۔ سارے شہر میں جا بجا خوبصورت مجسمے عمارتوں کی زیب و زینت کی خاطر اور اکابر قوم کی یادگار میں بنے ہوئے ہیں۔

آثار قدیمہ سیاح کو سیر کرانے کیلئے متعدد بڑی بڑی موٹریں مقررہ مقامات پر کھڑی رہتی ہیں۔ ہر موٹر کے ساتھ ایک

رہبر ہوتا ہے جو یورپ کی مختلف زبانیں جانتا ہے۔ بہتر طریقہ سیر کرنے کا ان موٹروں کے ذریعہ ہے۔ کک کمپنی یا امریکن اکسپرس کے معرفت بھی ان کے ٹکٹ ملجاتے ہیں۔ ہم نے یہاں کی سیر اسی طریقہ پر کی تھی۔ سیر کے ختم پر رہبر کو اگر کچھ دینا چاہو وہ شکریہ کے ساتھ قبول کرلیگا۔ خود ہرگز مطالبہ نہ کریگا۔ اصل میں یہ موٹر کمپنی کا ملازم ہوتا ہے۔ شہر کا جو حصہ بُدا کہلاتا ہے۔ اس میں ایک قدیم قلعہ پہاڑی پر ہے۔ قدیم شاہی محل بھی یہیں ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے دریا اور شہر کا منظر بڑا دلفریب ہے۔ محل کی عمارت۔ اسکی اندرونی آرائش اور سازو سامان وغیرہ فی الحقیقت شاہانہ ہیں۔ اس میں آٹھ سو ساٹھ کمرے ہیں۔ سامان کو دیکھکر طبیعت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہاں لوگ قدیم چیزوں کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ کیسی اچھی حالت میں انکو محفوظ رکھا ہے۔ قریب ہی میں ایک گوتھک وضع کا خوبصورت گرجا ہے۔ اگرچہ اسکی تعمیر تیرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھی لیکن پندرھویں صدی میں یہ اختتام کو پہنچا۔ ترکوں کے زمانہ حکومت میں ڈیڑھ سو برس تک یہ گرجا مسجد کا کام دیتا رہا۔ بلکہ یہاں کی سب سے بڑی مسجد یہی تھی۔ اسلامی حکومت کے زوال پر جب عیسائیوں کا دور دورہ ہوا تو انہیں نے اسکو گرجا کرلیا۔ ہمارا رہبر سیر کراتے وقت اکثر ترکی حکومت کا ذکر بلحاظ ضرورت کرتا تھا۔ اسوقت ہمارے قلوب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ افسوس کہ زمانہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ جس ملک میں اتنے عرصہ تک اسلامی حکومت رہی ہو وہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر تلاش بھی کرو تو کوئی ذی وجاہت مسلمان نہ ملیگا۔ مسلمانوں کی تیرہ بختی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے ؎

کیا فائدہ جو تذکرۂ ماضئے کریں — کیوں یادِ رفتگاں میں ماتم بپا کریں
بے سود اگرچہ تا بقیامت بکا کریں — اک امر اختیار سے خارج ہے کیا کریں

گندھک کے چشمے

دریائے ڈینوب پر سے عبور و مرور کے لئے چھ پل بنے ہوئے ہیں۔ ایک پل بہت شاندار اور خوبصورت ہے

اس کا شمار یورپ کے بہترین ملکوں میں کیا جاتا ہے۔ اس شہر کی ایک خصوصیت لائق ذکر یہ ہے کہ یہاں گندھک کے چشمے کثرت سے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کیلئے سائنس کے اصول کے مطابق بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ اچھی اچھی عمارتیں اور حوض بنے ہوئے ہیں۔ بیماروں کی ضروریات کو مدنظر رکھکر ہر ایک بات کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ اکثر امراض کے واسطے ان چشموں میں نہانا مفید ہوتا ہے۔ بڑی رونق کے مقامات ہیں۔ خوب چہل پہل رہتی ہے۔ ایک ہی حوض میں عورت مرد ساتھ نہاتے ہیں۔ یہ تماشہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ہندوستانیوں کو یہ کیفیت دیکھکر تعجب ہوتا ہے مگر یورپ میں یہ طریقہ معیوب نہیں ہے۔ اس قسم کا ایک مقام فرانسس جوزف پل کے کنارہ پہاڑی کے نیچے بنا ہوا ہے جسکو سینٹ گلبرٹ باتھ کہتے ہیں۔ یہیں پر اسی کے نام ہوٹل بھی ہے جو بداپسٹ کا بہترین ہوٹل مانا جاتا ہے۔ ان تمام چشموں میں پانی گرم ہوتا ہے اور حوض میں بجلی کے ذریعہ لہریں پیدا کیجاتی ہیں۔ دریا میں ایک جزیرہ سینٹ مارگریٹ نامی ہے۔ یہ بڑی تفریح کا مقام ہے۔ بالخصوص نہانے کا مقام بالکل پرستان معلوم ہوتا ہے۔ کنارہ کنارہ بہت دور تک ریت بچھی ہوئی ہے۔

جلبسی قوم کے لوگ

موسیقی کے لحاظ سے یہ حصہ ملک خاص امتیاز رکھتا ہے ایک قوم جلبسی کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے عادات اور حالات اکثر ہمارے ہاں کے بنجاروں سے ملتے جلتے ہیں۔ انکی موسیقی بہت ہر دل عزیز ہے۔ اکثر بڑے بڑے رسٹوران میں جلبسی باجہ نوازی ہوتی رہتی ہے۔ لوگ عام طور پر خلیق ہیں۔ ہوٹل کے ملازمین کو دیکھا کہ ہر وقت تواضع کیلئے جھکے چلے جاتے ہیں یہانتک کہ دوہرے ہو جاتے ہیں۔

عام اخلاق اور لباس

ہمارے ہوٹل میں ایک بڈھا جو مالک ہوٹل معلوم ہوتا تھا بہت خوش مزاج تھا۔ اسکی سفید داڑھی ناف تک پہونچ گئی تھی۔ ہم نے اس سفر میں ایسی ڈاڑھی کہیں نہیں دیکھی۔ تراش اس واڑھی کی ایسی خوبصورت تھی کہ اوپر سے یہ تدریج پتلی ہوتی چلی آئی تھی اور آخر میں صرف دو تین بال رہگئے تھے۔ ہندوستان میں بعض سکھوں کی داڑھی اس نمونہ کی دیکھی گئی ہے۔ یہ بڈھا بھی اکثر تعظیم کے واسطے دوہرا ہوجاتا تھا۔ ہاتھ چومنے کی رسم جسطرح ممالک مشرقی میں پائی جاتی ہے یہاں بھی دیکھنے میں آئی۔ دیہاتی لوگوں کے لباس میں مشرق کا اثر موجود ہے۔ چنانچہ یہ لوگ زرق برق اور فوق البھڑک کپڑے بہت شوق سے پہنتے ہیں۔ ٹوپی میں آرائش کیلئے پھول اور پر وغیرہ لگاتے ہیں لطف تو یہ ہے کہ مرد بھی اسی قسم کا مذاق رکھتے ہیں۔ انکے رنگ برنگی لباس جو یہ خاص موقعوں پر پہنا کرتے ہیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ معاشرت اور عادات وغیرہ کے لحاظ سے یہ ملک نہ تو خالص یورپ کہا جاسکتا ہے اور نہ اس کا شمار بلاد مشرقیہ میں ہے۔ دونوں قسم کی تہذیب کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے۔ یہاں لوگوں کو سرخ مرچ بھی کھاتے ہوئے دیکھا لیکن اس طرح کہ مرچ کا باریک پوڈر مثل سفوف بنالیتے ہیں اور شیشوں میں اسکو بھر لیتے ہیں کھانے کے وقت نمک اور سیاہ مرچ کی طرح اس سفوف کو بھی بقدر ضرورت چھڑک لیا کرتے ہیں۔ رات کو ایک بجے تک بازاروں میں رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں آکر پہلی دفعہ ہم نے یہ تماشا دیکھا کہ بدچلن عورتیں سڑکوں پر چکر لگاتی رہتی ہیں اور راستہ چلنے والوں کو مسکرا مسکرا کر اپنی طرف راغب کرتی ہیں قاہرہ اور دمشق میں جیسا کہ میں ذکر کرچکا ہوں کہ اس قسم کی عورتوں کے لئے مخصوص مقامات ہیں۔ جنکے باہر وہ اپنا پیشہ انجام دینے کیلئے نہیں جاسکتیں استنبول

میں اب قانوناً ایسے مقامات بند کر دیئے گئے ہیں اور بدچلن عورتیں بازاروں میں نظر نہیں آتیں۔

ویانا میں ہوٹل کا جھگڑا

۱۷ اکتوبر کو سر مغرب ہم ویانا پہونچے ہم نے استنبول سے چلتے وقت امریکن اکسپرس کے ذریعہ ویانا میں قیام کا بندوبست کر لیا تھا کمپنی نے ہم سے کچھ رقم پیشگی کرایہ کی وصول کر لی تھی اور کہا تھا کہ ہوٹل کے بل میں یہ رقم وضع ہو جائے گی۔ ہم کو باضابطہ رسید دیدی گئی اور ایک پرچہ پر ہوٹل کا پتہ لکھکر ہم کو دیدیا۔ خدا معلوم پتہ لکھنے میں دفتر والے نے کیا غلطی کی کہ ہم کو اسکی وجہ سے کسی قدر پریشانی اٹھانی پڑی۔ اسٹیشن پر ہم نے ایک گاڑی دو گھوڑونکی کرایہ پر لی اور ہوٹل کا پرچہ گاڑی والے کو دیدیا۔ وہ پہلے ہمکو جس ہوٹل میں لے گیا وہاں انگریزی بولنے والی دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمکو امریکن اکسپرس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی اطلاع تمہارے متعلق پہونچی ماسوا اسکے ہمارے ہوٹل میں آجکل جگہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو پتہ ہوٹل کا تھا اسے دیکھکر انہوں نے گاڑی والے کو کچھ ہدایت دی اور ہم سے کہا کہ یہ ہوٹل قریب ہی میں ہے۔ گاڑی والا تم کو وہاں لیجائے گا۔ ہم اس دوسرے ہوٹل میں پہونچے۔ دراصل یہ ایک خانگی ہوٹل تھا جسکو پن سی اون کہتے ہیں۔ اسکی مالکہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ انگریزی جانتی تھی اس نے پتہ دیکھکر کہا یہی ہوٹل ہے۔ ہم لوگ اتر گئے۔ صرف ایک کمرہ خالی تھا جس میں دو پلنگ تھے تیسرے پلنگ کیلئے کمرہ چھوٹا تھا۔ مالکہ نے اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ سلیم بیگ اس کمرہ میں ٹھیر گئے صبح کو ہم نے میڈم سے ہوٹل کے کرایہ اور کھانے پینے کے متعلق جب گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ ہوٹل وہ نہیں ہے جس کا پیشگی کرایہ ہم دے چکے ہیں

البتہ دونوں ہوٹل ہم نام ہیں جسکی وجہ سے مالکہ کو بھی غلط فہمی ہوئی۔ یہ بات معلوم کرکے کسی قدر تشویش ہوئی کیونکہ ہماری ایک معقول رقم بطور پیشگی رقم پھنسی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ رقم اس ہوٹل سے وصول نہیں کیجاسکتی تھی۔ بالآخر اس جھگڑے کے تصفیہ کیلئے مجھ کو امریکن ایکسپرس کے دفتر جانا پڑا۔ تمام قصہ سننے کے بعد منیجر نے کہا کہ تم نے غلطی کی جو ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھیر گئے۔ اب رقم کیسے واپس مل سکتی ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ تمہاری کمپنی نے پتہ صاف اور تفصیل کے ساتھ لکھکر نہیں دیا ہم مسافر اور اجنبی آدمی ہیں۔ ہم کو اس شہر کے حالات سے واقفیت نہیں۔ بہت دیر تک منیجر دونوں ہوٹل والوں سے ٹیلیفون پر بات کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ اصل ہوٹل کی مالکہ کہتی ہے کہ ہم ان مسافروں کے انتظار میں تھے اور جگہ بھی انکی محفوظ تھی اسلئے پیشگی رقم واپس نہیں دیجاسکتی۔ کچھ دیر کی حجت کے بعد منیجر نے ہماری رقم ہمکو واپس دیدی لیکن کہا تھا کہ ہماری غلطی اگرچہ نہیں ہے لیکن کمپنی کو نیک نام رکھنے کی خاطر تمہاری رقم واپس کئے دیتے ہیں۔ اس جھگڑے میں شام ہوگئی۔ واپسی کے وقت میں راستہ بھول گیا۔ ہوٹل بھی فاصلہ پر تھا۔ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ معلوم کرنا بھی مشکل تھا کہ کس موٹر بس میں بیٹھنا چاہئے۔ آخر کار بڑی تلاش کے بعد ایک صاحب مع اپنی میم صاحبہ کے ملے۔ معمولی انگریزی جانتے تھے۔ انکی امداد سے ایک موٹر بس میں سوار ہوا۔ میم صاحبہ نے موٹر والے کو سمجھا دیا کہ اُن کو فلاں مقام پر اتار دینا۔ اسطرح میں ہوٹل کے قریب تک موٹر بس میں پہونچ گیا۔

ایک میلہ

ہمارے قیام کے زمانہ میں شہر کی اکثر دکانیں بند رہیں اور بازار بے رونق معلوم ہوئے۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ شہر کے قریب ایک مقام پر جسکو پراٹر کہتے ہیں کئی روز تک ایک زبردست میلہ رہا۔ اس جگہ

بہت بڑا پارک ہے جس کا رقبہ (۷) مربع میل کے قریب ہوگا۔ رات دن یہاں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ تفریح کے وہ تمام اسباب موجود تھے جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں۔ سماٹرا کیطرف کے کچھ کالے پیلے لوگ بھی بطور نمائش موجود تھے۔ انکے دیکھنے کو ایک کثیر مجمع ہر وقت ڈیرے کے سامنے لگا رہتا تھا۔ ایک ڈیرے کے سامنے ایک شخص بہت بڑا پیجامہ شلوار کے نمونے کا لئے کھڑا تھا۔ کہتا تھا کہ اندر ایک بہت موٹی عورت ہے جس کا یہ پیجامہ ہے۔ عورت اس قدر موٹی ہے کہ اس کے پیجامہ میں ایک آدمی آجاتا ہے۔ چنانچہ وہ عملاً ایسا کرکے بتلاتا تھا۔ گویا یہ ایک اشتہار تھا کہ اس عورت کو دیکھنے کے لئے آؤ۔ دو روز تک شہر کی دکانیں بالکل بند رہیں اور میلہ آباد رہا۔ شہر میں سگریٹ تک ملنا دشوار ہوگیا تھا۔

ہوٹل ہمارا ہوٹل جس محلہ میں تھا اسکو کارنی سنگا سے کہتے ہیں ہوٹل کی مالکہ روس کے طرف کی رہنے والی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ خاوند اور بال بچے وہیں رہا کرتے ہیں۔ دروازہ ہوٹل کا بہت شاندار ہے اندرونی حصہ میں مختلف مکانات مختلف لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔ میڈم کے قبضہ میں چھ سات کمروں سے زیادہ معلوم نہیں ہوے۔ ہمارے پہلو کے کمرے میں ایک ترک عورت ٹھیری ہوئی تھی جسکا خاوند مرض فالج میں مبتلا ہوکر بغرض علاج یہاں کسی شفاخانہ میں تھا۔ ہوٹل میں دو نوجوان عورتیں کام کاج کے واسطے ملازم ہیں۔ یہی کھانا پکاتی ہیں۔ انگریزی بالکل نہیں جانتیں۔ نہایت باادب اور سلیقہ شعار ہیں۔ یورپ کے عورتوں کی بیباکی اور آزادی ان میں مطلق نہیں ہے۔ میڈم اکثر اپنے کام سے باہر چلی جایا کرتی تھی اسلئے ان لڑکیوں سے کام لینے میں کسی قدر مشکل ضرور واقع ہوتی تھی۔ ہر ایک بات کیلئے اشارہ کرنا پڑتا تھا۔ رفیق بیگ کو زکام کی شکایت ہوگئی۔ انہوں نے اپنے ساتھ جو شاندے

کی یونانی ادویات رکھی تھیں جنکو جوش دلوانے کی ضرورت تھی۔ اس مطلب کو سمجھانے میں بڑی کوشش کرنی پڑی۔ ہوٹل کا دروازہ آٹھ بجے کے بعد بند ہوجاتا تھا لیکن اندر کی طرف پھاٹک کے قریب ایک نگہبان سویا کرتا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر یہ دروازہ کھول دیتا۔ پہلی دفعہ جب ہمارے لئے اس نے دروازہ کھولا تو اسکو کچھ پیسے ہم نے دیئے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا رہا جسکو ہم نہیں سمجھے۔ صبح کو میڈم سے معلوم ہوا کہ رات کو دروازہ کھولنے کے معاوضہ میں نگہبان کو ایک مقررہ رقم دینی پڑتی ہے اور ہم نے معاوضہ کم دیا ہے۔ نگہبان اس کا تکملہ چاہتا ہے۔ ہم کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھایا کرتے تھے۔ دس شلنگ کے اندر ہی سب کچھ طے پا گیا۔

عام حالات

ہوٹل کے قریب میں ایک باغ بھی تھا۔ شام کیوقت یہاں بڑی تفریح رہتی ہے۔ ایک دفعہ اس باغ میں کافی پینے کیلئے میں رسٹوران میں گیا۔ کافی نہیں ملی مگر لوگ جما ہوا دہی شوق سے کھا رہے تھے۔ ایک پیالہ میں مجھکو بھی دیا گیا اچھا ذائقہ دار دہی تھا۔ یہ شہر زیادہ قدیم نہیں ہے۔ عمارتیں سب سنگین اور عالیشان ہیں۔ اکثر بازار خوبصورت اور سڑکیں چوڑی ہیں۔ جس طرف جاؤ ایک نمونہ کے مکانات دکھائی دیتے ہیں۔ آبادی بیس لاکھ سے اوپر بتلائی جاتی ہے۔ زمانہ جنگ کے بعد جس قدر مفلسی اور مصیبت اس شہر پر آئی یورپ کے کسی شہر پر نہ آئی ہوگی۔ اب حالت سنبھلتی جاتی ہے۔ صنعت وحرفت کے لحاظ سے یہ ایک اہم مقام مانا جاتا ہے۔ چمڑے کا سامان اور چوبی فرنیچر یہاں اچھا بنتا ہے۔

شہر کا بہترین حصہ وہ ہے جسکو رنگ اسٹراسے کہتے ہیں۔ عالیشان اور سجی ہوئی دکانیں اور قہوہ خانہ وغیرہ دیکھنے کے لائق ہیں۔ شہر کے مشرقی

گوشہ میں دریائے ڈینیوب بہتا ہے جس میں سے ایک نہر کاٹ کر شہر میں لیگئے ہیں۔ یہ حصہ بہت بارونق ہے۔ ہم نے اس شہر میں پھولوں کی کثرت دیکھی۔ میلہ کیوجہ سے اکثر کرایہ کی گاڑیاں بھی پھولوں سے سجائی گئی تھیں۔ گھوڑے یہاں زبردست اور شاندار دکھائی دیئے۔

چند مقامات اس شہر میں خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک گرجا سینٹ اسٹیفن نامی ہے جسکا گنبد ساڑھے چار سو فیٹ بلند ہے اگرچہ ۱۳۰۰ء عیسوی میں یہ گرجا بننا شروع ہوا تھا لیکن تعمیر اسکی ۱۵۱۰ء میں ختم ہوئی۔ طبابت کے واسطے یہاں ایک خاص یونیورسٹی ہے جو تمام دنیا میں مشہور ہے۔ ایک ہزار سے اُوپر طلباء اس میں پڑھتے ہیں۔ بعض ہندوستانی طالب علم بھی دیکھنے میں آئے۔ ایک قدیم محل ہے جسکو دیکھنے کیلئے موٹر کوچ کے ذریعہ گئے۔ رہبر انگریزی جانتا تھا۔ محل دیکھنے کے لئے ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ یہاں کی مشہور ملکہ میریا تھریسیا کے رہنے کے کمرے دیکھے۔ اکثر سامان جو ملکہ روزمرّہ استعمال کرتی تھی جیسے کا ویسا رکھا ہوا ہے۔ جس طرح نپولین کی آرام گاہ اور اس کا پلنگ وغیرہ محفوظ ہے ایک گھنٹہ ایسا دیکھنے میں آیا جس میں تین سال کے بعد کنجی دیجاتی ہے یہ سب کچھ صحیح لیکن پوچھو کہ ان کو استعمال کرنیوالے کہاں ہیں۔ شاید قبر میں انکی ہڈیاں بھی اصلی حالت میں باقی نہ ہونگی ان چیزوں کو دیکھکر بڑی عبرت ہوتی ہے۔

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں — تاج فغفور و تخت خاقانی

محل کی اندرونی آرائش اور ساز و سامان تعریف سے باہر ہے۔ عجائبخانہ میں اکثر چیزیں بیش بہا موجود ہیں۔ ایک گلدان موتیوں کا بنا ہوا دیکھا۔ اسمیں گلدستہ بھی رکھا ہوا تھا لیکن غور سے دیکھو تو تعجب ہوگا کہ یہ گلدستہ اصلی پھولوں کا

نہیں ہے بلکہ تمام جواہرات کا بنا ہوا ہے۔ رنگ برنگ کے جواہرات اس نزاکت اور خوبصورتی کے ساتھ جڑے ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے عجائبخانہ میں شاہی جواہرات محفوظ رکھے گئے ہیں۔ شہر بحیثیت مجموعی نہایت خوبصورت ہے یہاں کے کھانے میں مشرقی اثر پایا جاتا ہے۔ ہم کو اکثر چاول کھانے کو ملے۔ ایک زمانہ میں ترکوں نے اس شہر کا بھی محاصرہ کر لیا تھا لیکن خدا کو کچھ منظور تھا ان کی سعی کامیاب نہ ہوئی۔

ویانا تا برلن

۱۱ر جون کو صبح آٹھ بجے کے قریب ہم ویانا سے برلن روانہ ہوئے راستہ میں منظر بہت اچھا تھا۔ بہت دور تک دریا کا کنارہ ملا۔ کثرت سے مرد اور عورت نہاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ سرسبز پہاڑ اور چشمے بہت دلکش تھے۔ جنگل بھی خوبصورت تھا۔ کچھ دیر تک ہمارے درجہ میں ہم تین ہی مسافر رہے۔ آرام لینے کے لئے لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان عورت ہمارے درجہ میں آ گئی جسکی وجہ سے ہمیں بیٹھا رہنا پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عورت شہر پراگ تک ہمارے ساتھ جائیگی۔ وہ تھوڑی سی انگریزی جانتی تھی۔ ہم کو بھی غنیمت معلوم ہوا کیونکہ جب کبھی کوئی انگریزی داں ملجاتا تھا تو ہم کو معلومات حاصل کرنیکا موقع ملتا تھا۔ اس عورت کے ساتھ سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔ ملک کے عام حالات اور زمانہ جنگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ عورت چوڑیوں کے کارخانہ میں کام کرتی ہے اور اس کارخانہ سے ہندوستان کو بھی چوڑیاں جاتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسکی شادی پہلے ہوئی تھی لیکن کچھ عرصہ ہوا کہ خاوند سے طلاق لے لی اور اب دوسری شادی کی فکر میں ہے۔ بار بار منہ پر پوڈر اور ہونٹوں پر سرخی لگاتی تھی۔ یورپ میں سنگار کا یہ طریقہ عام ہو گیا ہے۔ بازار ہو۔ ریل ہو یا ٹرام ہو

ہر جگہ یہ بناؤ بلا تکلف ہوسکتا ہے۔ سلیم بھائی نے بدوران گفتگو اسکی عمر دریافت کی اس پر وہ کسی قدر ناراض ہوئی اور کہنے لگی معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ پہلی دفعہ یورپ میں آئے ہو۔ یہاں کسی عورت کی عمر دریافت کرنا گویا اسکی ہتک کرنا ہے۔

یورپ میں عورت ہمیشہ جوان رہتی ہے

یورپ میں عورت ہمیشہ جوان ہی رہنا چاہتی ہے۔ تم عمر دریافت کرکے اسکے بڑھاپے کو یاد دلاتے ہو۔ ہم نے کہا واقعی ہم اس ملک کے رسم و رواج سے ناواقف ہیں۔ اس لئے معافی چاہتے ہیں مگر یہ بتاؤ کہ تمہارے نزدیک کیا عورت کا حسن دولت لازوال ہے اس نے کہا غلط ہو یا صحیح۔ عورت تو اپنے حسن اور جوانی کو لازوال ہی سمجھتی ہے۔ مرد کے واسطے زیبا نہیں ہے کہ اسکے خلاف یاور کراکے اسکے دل کو ٹھیس لگائے۔ البتہ اگر تم کو عمر معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو دفتر صفائی میں جاکر دریافت کرسکتے ہو۔ اللہ اکبر۔ خودپسندی کی بھی انتہا ہوگئی۔ کاش کوئی ان عورتوں کو سمجھائے کہ

شان ہو جس میں دلربائی کی ۔۔۔ خندہ گل سے بے بقا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی ۔۔۔ جنس کاسد سے ناروا تر ہے
(حالی)

یہ عورت شہر پراگ کی بڑی تعریف کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ اگر تم لوگ یہاں ٹھیر جاؤ تو میں تم کو اچھی طرح سیر کرا دونگی۔ ہم نے وقت کی تنگی کا عذر کرکے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب پراگ کا اسٹیشن قریب آیا تو میں نے اس خاتون سے کہا کہ اسٹیشن پر پینے کا پانی ملسکے تو دلوا دو کیونکہ ہم زبان نہ جاننے کی وجہ سے خود انتظام نہیں کرسکتے۔ اس نے کہا کہ اسٹیشن پر تم لوگ پانی مت پیا کرو۔ ہر مقام پر اچھا پانی ملنا مشکل ہے اور بیماری کا اندیشہ رہتا ہے۔ یا تو بیر استعمال کرو یا چشمہ کا پانی پیا کرو جو بوتلوں میں ملتا ہے۔ اسٹیشن آیا تو اس نے کہا کہ میرے ساتھ پلیٹ فارم پر چلو میں

چشمہ کا پانی دلوا دیتی ہوں۔ پلیٹ فارم پر ایک چھوٹی سی دکان تھی اس پر ایک عورت کام کر رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ چشمہ کا پانی تو نہیں ہے لیکن بیر مل سکتی ہے چونکہ اس میں نشہ نہیں ہوتا اور پیاس زور کی تھی

بیر کا رواج

اسلئے ہم کو بیر پینی پڑی۔ جرمنی میں بیر کا بڑا رواج ہے۔ مرد اور عورت سب پیتے ہیں۔ اسکے علاوہ گرمی کے موسم میں چشمہ کا پانی اور تازہ آبشورہ بھی بکثرت پیا جاتا ہے پراگ سے ہمارے درجہ میں دو مسافر اور آن بیٹھے۔ یہ دونوں میاں بیوی تھے جن کا مکان ناروے کے کسی شہر میں تھا محض سیر کی غرض سے سفر کر رہے تھے۔ یہ دونوں جرمن زبان سے ناواقف تھے لیکن انگریزی ٹوٹی پھوٹی جانتے تھے۔ برلن تک یہ ہمارے ساتھ رہے۔ ہم نے حسب عادت ان سے بھی باتیں کیں۔ بچوں کو وطن میں چھوڑ کر آئے تھے جلدی واپس جانا چاہتے تھے۔

برلن

رات کو ساڑھے دس بجے برلن پہونچے۔ ویانا سے روانہ ہوتے وقت ہم نے امریکن اکسپرس کے ذریعہ برلن کے ایک پن سیون کا پتہ لے لیا تھا۔ پن سیون کو خانگی ہوٹل سمجھئے برّاعظم میں اور بالخصوص جرمنی میں یہ بکثرت موجود ہیں۔

ایک تکلیف دہ رواج

ایک تکلیف دہ رواج جس کا ہم کو علم نہ تھا برلن میں یہ ہے کہ پن سیون کا دروازہ رات کو آٹھ بجے بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر مسافر کے پاس کنجی نہ ہو تو وہ کسی طرح اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ باہر سے اندر والوں کو مطلع کرنیکا کوئی مقررہ طریقہ نہیں ہے۔ ہم اسٹیشن سے ایک ٹکسی لیکر پن سیون پہونچے تھے۔ دروازہ حسب معمول بند تھا۔ ہم نے اور موٹر والے نے ہوٹل والوں کو اطلاع دینے کی ہر چند کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تالیاں

بھی بجائیں۔ شور وغل بھی کیا مگر بے سود۔ ایک پولس کانسٹبل بھی وہاں آگیا اس نے بھی دروازہ کھلوانیکی کوشش کی مگر نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار مجبور ہو ایک دوسرے ین سیدن کو گئے۔ جس کا پتہ ہمارے پاس موجود تھا وہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد مایوس ہوکر ہم وہاں سے روانہ ہونیکا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک میم صاحب وہاں آگئیں۔ انکے پاس کنجی تھی۔ دروازہ کھولکر اندر جانے لگیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ داخل ہوئے۔ انکو انگریزی نہیں آتی تھی۔ موٹر والے نے اپنی زبان میں کچھ سمجھایا۔ میم صاحبہ نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے چلے آؤ تیسری منزل تک ہم انکے پیچھے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے اشارہ سے بتلایا کہ یہ دروازہ بن سیون کا ہے۔ اور دروازہ کے پہلو میں جو بٹن لگا ہوا تھا اسکو دبا دیا۔ منٹ بھر کے بعد ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا۔ میم صاحبہ نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اور اپنے کمرہ کی طرف چلی گئیں۔ جس عورت نے دروازہ کھولا وہ چیمبر میڈ یعنے خادمہ تھی۔ ہم نے اشاروں کے ذریعہ اس کو سمجھایا کہ ہم مسافر ہیں اور قیام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کمرہ کی کنجی لینے مالکہ کے پاس گئی۔ جب واپس آئی تو ہم کو اشارہ سے اندر بلایا کہ اپنا کمرہ پسند کرلو۔ ایک کمرا بڑا تھا جس میں دو پلنگ تھے اور ایک کمرہ چھوٹا تھا جس میں ایک پلنگ تھا۔ ہم نے یہ دونوں کمرے پسند کرلئے اور اس سے کہا کہ نیچے سے ہمارا اسباب منگوالو۔ وہ نیچے اسباب لینے چلی گئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہم نے دیکھا کہ خادمہ۔ شوفر اور رفیق بیگ سامان اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ رفیق بیگ بہت خفا تھے کہ تم دونوں آرام سے اوپر ٹھیر گئے اور مجھکو اسباب اٹھانا پڑا۔ موٹر والے نے بھی ڈبل کرایہ وصول کیا۔ آدمی اگرچہ مضبوط تھا لیکن تیسری منزل تک سامان اٹھا کر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بیچارہ ھانپ گیا اور خادمہ کا بھی بُرا حال ہوگیا۔ اس ہوٹل میں اگرچہ برقی جھولا موجود تھا لیکن رات کو

بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک بجے کے قریب ہم پلنگ پر لیٹے اور صبح کو آٹھ بجے تک خوب سوئے۔

ہوٹل صبح کو ایک دوسری خادمہ نظر آئی جو انگریزی کے کچھ الفاظ جانتی تھی۔ ہوٹل کی مالکہ نیچے کی منزل میں رہتی ہے۔ یہ عورت سن رسیدہ اور انگریزی سے ناواقف تھی لیکن اسکے ساتھ ایک دوسری خاتون بھی تھی جو انگریزی جانتی تھیں۔ ان کے توسط سے ہم نے ہوٹل کے شرایط معلوم کئے۔ روزانہ نو مارک فی شخص طے پایا۔ ایک مارک ایک شلنگ کے برابر ہوتا ہے یا یوں سمجھو کہ حالی بارہ آنہ ہوئے۔ اس رقم میں ناشتہ اور دو وقت کا کھانا بھی شامل تھا البتہ سہ پہر کی چائے شامل نہ تھی۔ یہ ہوٹل برلن کے ایک مشہور محلہ پوٹس دام اسٹراسے میں واقع تھا۔ اسی ہوٹل میں چند امریکن سیاح مرد اور عورت ٹھیرے ہوئے تھے۔ کھانے کے وقت اکثر ان سے گفتگو رہتی تھی۔ ہم ایک ہفتہ اس ہوٹل میں ٹھیرے۔ خاصا آرام دہ ہوٹل ہے۔ کھانا بھی اچھا تھا لیکن جس حصہ شہر میں رفیق بیگ کو روزانہ کام تھا وہاں سے یہ مقام دور تھا اسلئے ہم ایک دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ یہ کارل اسٹراسے میں ہے۔ اس ہوٹل میں کوئی بھی انگریزی سے واقف نہ تھا اور صرف صبح کا ناشتہ ملتا تھا۔ کھانے کا انتظام نہیں تھا۔ ہم لوگ باہر کسی رستوران میں کھا لیا کرتے تھے۔ برلن کا مشہور محلہ فریڈرِشس اسٹراسے اس ہوٹل سے بالکل قریب ہے۔

برلن میں ہندوستانی برلن میں چند ہندوستانیوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب پروفیسر خیری ہیں جو خانگی طور پر عربی وغیرہ پڑھاتے ہیں۔ بہت شریف اور ہمدرد آدمی ہیں۔ وہیں شادی کر لی ہے اور صاحب اولاد ہیں۔ ایک دوسرے صاحب دہلی کے رہنے والے ہیں جن کا نام منظور احمد ہے۔ سات برس سے برلن میں طالب علم ہیں۔ انہوں نے ہمکو برلن کی بہت کچھ سیر کرائی ایک اور مسلمان طالب علم ملے جو حیدر آباد کے رہنے والے

ہیں۔ معلوم ہوا کہ برلن میں ہندوستانی مسلمانوں کی اچھی تعداد ہے۔

برلن برلن شہر جرمنی کا دار السلطنت ہے اور دریائے اسپری پر واقع ہے اسکی آبادی (۴۰۰۰۰۰۰) چالیس لاکھ سے زیادہ ہے صفائی اور حفظان صحت کے لحاظ سے یہ شہر تمام یورپ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ نسبتاً یہ ایک جدید شہر ہے اسلئے باقاعدہ اور سلیقہ کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور سیدھی ہیں۔ مکانات اگرچہ خوبصورت نہیں ہیں لیکن سنگین۔ روشن اور ہوادار ہیں ایک خصوصیت اس شہر کی یہ ہے کہ تنگ و تاریک اور میلی کچیلی گلیاں بالکل نہیں ہیں۔ جنگ عظیم سے قبل یہ شہر روز افزوں ترقی پر تھا لیکن جنگ کے سلسلہ میں جو مالی اور تجارتی نقصان جرمنی کو اٹھانا پڑا اس کا اثر اس شہر کی رفتار ترقی پر بہت کچھ پڑا۔ اب پھر ترقی کے آثار پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ جرمن چونکہ جفاکش اور ذہین لوگ ہیں اسلئے اپنے ملک کی ترقی کے واسطے جدوجہد میں برابر مصروف ہیں۔

افلاس سنا گیا ہے کہ آجکل جرمن اور آسٹریا میں جتنے بے روزگار آدمی ہیں اتنے یورپ کے کسی حصہ میں نہیں۔ مالی حالت خراب ہوگئی ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ افلاس انسان کے اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے۔

افلاس ہے مقدمہ قہر ذو الجلال — افلاس سے زیادہ جہاں میں نہیں وبال

ڈرپوک پست ہمت و ست و دنی خیال — افلاس کر ہی دیتا ہے انسان کو پائمال

اس عام قاعدہ سے جرمنی بھی نہ بچ سکا چنانچہ برلن کے بازاروں میں عام طور پر بدچلن نوجوان عورتیں چکر لگاتی ہیں اور زیادہ تر اجنبی مسافروں کو اپنا شکار بنانے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ بعض اس قدر بے شرم اور بے حیا ہیں کہ باوجود انکار کے بہت دور تک پیچھا کرتی ہیں۔ بعض سگریٹ مانگتی ہیں۔ بعض اشارے کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ اس قسم کی سینکڑوں عورتیں بازاروں میں ملتی ہیں۔ سنا ہے

جنگ سے پہلے یہ کیفیت نہ تھی۔ مسافر کو چاہئے کہ ایسی عورتوں سے اپنے آپ کو بچاتا رہے۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ میں کسی رسٹوران میں چائے پی رہا تھا۔ دو تین کرسیاں میرے قریب خالی پڑی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی آکر میرے قریب بیٹھ گئی۔ یورپ میں چونکہ یہ ایک معمولی بات ہے مجھکو اس پر تعجب نہیں ہوا لیکن حسب عادت میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمکو انگریزی آتی ہے یا نہیں معلوم ہوا کہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتی ہے۔ سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کیلئے اس قدر بہانہ کافی تھا۔ برلن کے عام حالات پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے فرمائش کی تم میرے ساتھ ہوٹل چلو۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت بازاری ہے۔ اس سے میں نے کہا کہ کسی کے ساتھ غیر مقام پر جانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ لیکن میں تمہارے حالات دریافت کرنے کا مشتاق ہوں۔ اگر تم تھوڑا سا وقت اپنا دلسکو تو اسکا معاوضہ کردیا جائیگا۔ اس نے پوچھا تم مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا یہ بتاؤ کہ تم نے اس قسم کی زندگی کیوں اختیار کی ہے۔ اور شادی کیوں نہیں کرلیتی ہو۔ جواب میں اس نے کہا کہ میرا باپ انگریز تھا۔ مگر ماں جرمن تھی۔ جنگ عظیم کے کچھ دنوں بعد ماں باپ مر گئے۔ میرا ایک چچا میری پرورش کرتا رہا۔ سن بلوغ کو جب پہنچی تو اس نے میری پرورش ترک کردی۔ اسوقت یہاں افلاس کا بہت زور تھا کھانے پینے کو لوگ محتاج ہو رہے تھے۔ اکثر آلو کے چھلکے اُبال کر اس پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بیمار پڑ گئے۔ میرے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اسلئے میں نے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کیا۔ اب میرے ساتھ کوئی شادی نہیں کرتا۔ اگر موقعہ ہو تو میں ضرور نکاح کرلوں۔ میری آمدنی کا اوسط دو سو روپیہ ماہانہ کے قریب ہے۔ جس میں سے کچھ رقم بڑھاپے کے لئے میں پس انداز کرتی ہوں۔ چار و ناچار

زمانہ اکثر بیکاری میں گذرتا ہے کیونکہ اجنبی مسافر اس ملک میں اس وقت بہت کم آتے ہیں۔

برلن کے بازار

برلن کا ایک بہت بڑا بازار اونٹر ڈن لنڈن ہے جو ایک میل لنبا ہے۔ اس سڑک کے بیچ میں ایک چوڑی روش ہے جسکے دونوں طرف لیمو کے درخت ہیں۔ اس مناسبت سے سڑک کا نام رکھا گیا ہے یعنے لیمو کے درختوں کی سڑک۔ درختوں کے سایہ میں کرسیاں اور بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ اکثر لوگ آرام لینے یا سیر کرنے کی خاطر یہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ نگہبان کو کچھ فیس دینی پڑتی ہے۔ دوسرا شاندار بازار پوتس دامر پلاتز ہے۔ یہ ایک بارونق چوراہا ہے۔ جہاں ہر قسم کا مجمع رہتا ہے۔ سڑکیں چوڑی ہیں اس لئے ہجوم سے تکلیف نہیں ہوتی۔

ایک خاص انتظام

مجمع کو قابو میں رکھنے کیلئے برلن میں ایک خاص انتظام ہے۔ بڑے بڑے چوراستوں پر چوپہل قندیلیں تاروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ہر جانب تین رنگ کی روشنی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود بخود ہو جاتی ہے۔ لوگ اس روشنی کو دیکھکر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اگر روشنی زرد رنگ کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آہستہ چلو راستہ بند ہونیوالا ہے۔ اسکے بعد ہی روشنی سرخ ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ٹھیر جاؤ راستہ بند ہو گیا۔ چنانچہ تمام مجمع ٹھیر جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد زرد رنگ کی روشنی ہوتی ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ راستہ کھلنے والا ہے۔ چلنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اسکے بعد ہی سبز رنگ کی روشنی ہوتی ہے جس پر آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ اس انتظام میں خوبی یہ ہے کہ پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب راستہ بند ہونیوالا ہے یا کھلنے والا ہے۔

آٹو بفے بازاروں میں رات کو تین بجے تک چہل پہل اور رونق رہتی ہے لیکن دکانیں شام کو چھ بجے قانوناً بند ہو جاتی ہیں۔ اسکے بعد خرید و فروخت داخل جرم ہے۔ البتہ کھانے پینے کی دکانیں کھلی رہتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا رسٹوران جسکو آٹو بفے کہتے ہیں لائق تذکرہ ہے۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ ایک بڑی دکان ہے۔ اسمیں الماریاں لگی ہوئی ہیں جس میں مختلف قسم کی خورد و نوش کی چیزیں کاغذ کی تشتریوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی قیمت چھوٹی چھوٹی تختیوں پر لگی ہوئی ہے۔ الماری میں ایک طرف سوراخ ہے۔ اگر مقررہ قیمت اس سوراخ میں ڈال دی جائے تو مطلوبہ چیز خود بخود پھسلتی ہوئی ایک خاص راستہ سے باہر نکل آتی ہے۔ اسی طرح بیر، لیمونیڈ وغیرہ کے نل لگے ہوئے ہیں اور کانچ کے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ جو چیز پینی ہو اس نل کے قریب کے سوراخ میں مقررہ سکہ ڈال دو اور گلاس نل کے سامنے لگا دو۔ ایک گلاس بھر کر وہ چیز خود بخود آجائے گی۔ نہ کسی سے کچھ مانگنے کی حاجت ہے اور نہ کسی کو قیمت ادا کرنے کی ضرورت۔ اس قسم کا رسٹوران ہم نے پہلی دفعہ بوداپسٹ میں دیکھا تھا۔ اس انتظام میں خوبی یہ ہے کہ وقت ضایع نہیں ہوتا۔ ورنہ عام طور پر دکانوں میں پندرہ منٹ ضرور لگ جاتے ہیں۔

رسٹوران برلن میں کھانے پینے کی دکانیں کثرت سے ہیں اور اچھی ہیں۔ اکثر دکانوں میں اخبار اور رسالہ رکھے رہتے ہیں۔ نشست کا انتظام بھی اچھا ہے۔ اعلیٰ قسم کی گدے دار کرسیاں اور صوفے ایک عام بات ہے۔ بعض دکانوں میں گانا بھی ہوتا رہتا ہے۔ لوگ عام طور پر فرصت کا وقت ان دکانوں میں گذارتے ہیں۔ تفریح بھی ہوتی ہے اور تبادلہ خیالات بھی۔ انگلستان میں یہ بات نہیں ہے کیونکہ وہاں کے لوگ اکثر خاموش رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ موسم گرما

میں کرسیاں باہر سائبان کے نیچے ڈالدی جاتی ہیں تاکہ گرمی سے تکلیف نہ ہو۔ بعض رسٹوران ایسے ہیں کہ جہاں شام کے وقت آسمان کے نیچے کھلی ہوا میں بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کرال گارڈن میں ایک رسٹوران اس قسم کا ہے۔ شام کے وقت وہاں بہت مجمع رہتا ہے۔ بینڈ بھی بجتا ہے اور رقص و سرود بھی ہوتا ہے۔ یورپ میں اپنی قسم کا یہ بہترین رسٹوران ہے۔ کھانا عام طور پر اچھا ہوتا ہے۔ بڑی دکانوں میں انگریزی داں خادم ملجاتے ہیں۔ ورنہ اجنبیوں کو زبان کیوجہ سے کھانا مانگنے میں دقت ضرور ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مانگو کچھ اور ملتا کچھ ہے۔

ہوٹل

برلن کے ہوٹل بحیثیت مجموعی کم خرچ اور آرام دہ ہیں۔ اگر زیادہ دن قیام کرنا ہو تو پن سیون میں ٹھیرنا مناسب ہے جس پن سیون میں ہم ٹھیرے تھے اسکی عمارت میں متعدد کاروباری لوگ بھی کرایہ سے رہتے تھے۔ چنانچہ ہمارے ہوٹل کے دروازہ کے پہلو میں ایک دوسرا کمرہ تھا جس میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ ایک دفعہ رات کے وقت غلطی سے میں نے ڈاکٹر کے دروازہ پر گھنٹی بجائی۔ نصف شب گذر چکی تھی ڈاکٹر کی میم پریشان ہوکر بستر سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اس خیال کے ساتھ دروازہ کھولا ہوگا کہ کوئی بیمار ہاتھ لگا۔ میم کو دیکھکر میں اپنی غلطی کو سمجھ گیا اور ہوٹل کا دروازہ پوچھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتی تھی لیکن بہت مایوسی کے ساتھ اس نے اشارہ سے پہلو کا دروازہ بتایا اور اپنا دروازہ بند کرلیا۔ ہر مسافر کو تین کنجیاں دیجاتی ہیں۔ ایک کنجی بیرونی پھاٹک کی ہوتی ہے۔ دوسری کنجی ہوٹل کے اندرونی دروازہ اور تیسری کنجی مسافر کے کمرے کی۔ کمرہ کی کنجی حسب دستور چیمبر میڈ کو دینا چاہیئے۔ یا آفس میں چھوڑ دینی چاہیئے تاکہ تمہارے

عیاب میں کمرہ کی صفائی ہوسکے۔ بقیہ دونوں کنجیاں اپنے پاس رکھنی چاہیں بیرونی پھاٹک کو کھولنے کی ہمارے ہوٹل میں خاص ترکیب تھی۔ ہم کو خادمہ نے عملی طور پر دروازہ بند کرکے یہ ترکیب بتلادی تھی۔ اگر یاد نہ رہے تو بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہے کواڑوں میں دو سوراخ تھے ایک اوپر اور دوسرا نیچے۔ پھاٹک کھولنے کی ترکیب یہ تھی کہ پہلے نیچے کے سوراخ میں کنجی دو دفعہ پھرائی جاتی تھی اور پھر اوپر کے سوراخ میں ایک دفعہ۔ اگر اس طریقہ پر عمل نہ کیا جائے تو پھاٹک کسی طرح نہ کھلتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں تنہا اور رات کو بارہ بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا پھاٹک کھولنے کی کوشش کی لیکن ترکیب یاد نہ رہی۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ سڑک پر سے دو ایک آدمیوں کو امداد کیلئے بلایا۔ مگر ان کو بھی ترکیب معلوم نہ تھی۔ بالآخر مایوس ہوکر میں کسی دوسرے ہوٹل میں رات بسر کرنے کا ارادہ کررہا تھا کہ ایک میم صاحبہ جو اس عمارت کے کسی حصہ میں کرایہ سے رہتی تھیں آگئیں۔ ان کے پاس کنجی بھی تھی اور ترکیب تو ان کو معلوم تھی۔ انہوں نے پھاٹک کھولا اور ان کے ساتھ میں بھی داخل ہوگیا۔ زینوں پر روشنی کا انتظام اچھا ہے۔ پھاٹک کے قریب روشنی کا بٹن ہے۔ اگر اسکو دبادیا جائے تو پہلی منزل پر روشنی ہو جاتی ہے۔ دوسری منزل پر پہونچنے پر یہ روشنی خود بخود خاموش ہو جاتی ہے۔ وہاں دوسرا بٹن لگا ہوا ہے جسکو دبادو تو دوسری منزل پر روشنی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ آخری منزل تک جاسکتے ہیں۔ یہ سہولت دوسرے شہروں میں کم دیکھی گئی۔

عجائب خانے

برلن میں دلچسپی اور سیر و تفریح کے بہت سے سامان ہیں۔ اسکے علاوہ علمی معلومات اور تحقیقات کا بھی یہ مرکز ہے۔ غیر ممالک کے طالب علم کثرت سے تکمیل تعلیم کے واسطے یہاں آتے ہیں۔ جرمن لوگ عام طور پر ذہین اور تحصیل علم کے شوقین ہوتے ہیں چنانچہ

علم موسیقی کو جس درجہ کمال پر انہوں نے پہونچا دیا ہے اسکی نظیر یورپ میں نہیں۔ ایک عجائبخانہ ایسا ہے کہ اس میں قدیم زمانے کے طرح طرح کے آلات موسیقی جمع کئے گئے ہیں۔ قدر دانان موسیقی کے واسطے یہ ایک دلچسپ مقام ہے یہ میوزیم فیسانن اسٹرلسے میں واقع ہے اسکے علاوہ متعدد عجائبخانے ایسے ہیں جن میں اہل کمال کی نقاشی کے نمونے اور دوسری اشیاء جمع کی گئیں ہیں۔ ایک عجیب چیز دیکھنے کے لایق پلانی ٹیریم ہے۔ یہ ایک مکان ہے جس میں مشین کے ذریعہ سے اور آئینوں کی مدد سے آسمان کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔

تھیٹر شب کی تفریح کیلئے تھیٹر سینما اور ناچ گھر بکثرت ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی ملک کی زبان سے واقفیت نہ ہو وہاں کے تھیٹر مسافر کے لئے چنداں دلکش نہیں ہوتے اور نہ کوئی لطف آسکتا ہے۔ تاہم بعض تھیٹر ایسے ہیں جن سے مسافر باوجود ناواقفیت زبان لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس قسم کے دو بڑے تھیٹر برلن میں ہیں۔ ہر سیاح کو چاہئے کہ ایک دفعہ ان تھیٹروں کو ضرور دیکھے۔ ایک کو اسکالا اور دوسرے کو ونٹر گارٹن کہتے ہیں۔ ان میں علاوہ موسیقی اور ڈرامہ کے بہت سے کرتب اعلیٰ درجہ کے ایسے دکھائے جاتے ہیں جن کا تعلق محض دیکھنے سے ہے۔ مثلاً ایک شخص کو دیکھا کہ وہ فڈل پچاسوں ترکیبوں سے بجاتا تھا۔ مشکل سے مشکل پوزیشن اختیار کرکے فڈل نوازی کی داد لیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کرلئے اور اسی حالت میں فڈل کو کچھ اس طرح بجایا کہ ناظرین وسامعین محو حیرت رہ گئے۔ چار شلنگ میں آرام کی نشست ملسکتی ہے۔ ہر مہینہ پروگرام تبدیل ہوتا ہے۔ کھانے پینے کا انتظام جس قدر برلن کے تھیٹروں میں دیکھا گیا ویسا دوسرے تھیٹروں میں نہیں ہے۔ یہ لوگ کھاتے بھی زیادہ ہیں۔ تھیٹر شروع ہونیکے قبل ہی کھانیکا

سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ پھر انٹرول میں بھوکوں کی طرح رفرشمنٹ کی دکان پہ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تھیٹر کے اندر بھی کھانے پینے کی کچھ چیزیں ساتھ لاتے ہیں۔ اور تماشہ دیکھتے وقت کھاتے میں کوئی تکلف نہیں کرتے۔ البتہ اعلیٰ درجہ کے لوگ اس بات کو کسی قدر معیوب سمجھتے ہیں لیکن متوسط درجہ کے لوگ کسی قاعدہ کے پابند نہیں چنانچہ ریلوں میں بھی کھانا ساتھ رکھتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ انگلستان میں اس طریقہ کو برا سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور اندرونی انتظام و ترتیب کے لحاظ سے برلن کے تھیٹر یورپ بھر میں بہترین سمجھے جاتے ہیں۔

سینما

سینما بھی عام طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ جرمن فلموں کے علاوہ امریکہ کے فلم بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جرمنی کا بنا ہوا فلم خوبیوں میں امریکہ کے فلموں سے کسی طرح کم نہیں۔ یورپ میں سینما کا پروگرام ہندوستان سے مختلف ہوتا ہے۔ اکثر دوپہر سے ہی تماشہ شروع ہو جاتا ہے اور مسلسل بلا وقفہ کے ہوتا رہتا ہے۔ جس وقت جی چاہے چلے جاؤ۔ جس مقام پر شروع کیا تھا وہاں ختم کر کے چلے آؤ۔ نوجوان عورتیں تھیٹر اور سینما میں سگریٹ اور چاکلیٹ بیچتی پھرتی ہیں۔ جرمنی زبان میں سگریٹ کو زگرتین اور چاکلیٹ کو شکولادے کہتے ہیں

ناچ گھر

برلن میں ناچ گھر کثرت سے ہیں۔ سرشام سے رات کے تین بجے تک ان ناچ گھروں میں چہل پہل رہتی ہے برہنہ اور نیم برہنہ عورتیں مختلف قسم کے ناچوں سے حاضرین کو محظوظ کرتی ہیں۔ برہنہ ناچ روز بروز مقبول ہوتا جاتا ہے۔ نیم برہنگی تو ایک عام بات ہے لیکن بعض تھیٹروں اور ناچ گھروں میں کم سے کم ایک پروگرام ایسا بھی ہوتا ہے جس میں نوجوان عورتیں بالکل برہنہ ہو کر ناچتی ہیں۔ بعض ستر پوشی کے خیال سے شرمگاہ کے پر یا اسی قسم کی کوئی اور چیز استعمال کرتی ہیں ۔

فیشن نیا خیال نیا کچھ ضرر نہیں　　عریانی اک لباس ہے جو پردہ در نہیں

ان پیشہ ور عورتوں کے علاوہ حاضرین کی دلچسپی کے واسطے بہت سی ایسی نوجوان عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا خاص کام یہی ہوتا ہے کہ مہمانوں کو اپنی طرف مائل کر کے شراب بکوائیں۔ ہر بوتل پر جو اسطرح بکوائی جائے ان کو کمیشن ملتا ہے۔ یہ ناچ گھر مہنگے بھی ہیں اور سستے بھی۔ عام طور پر چار شلنگ میں کافی تفریح ہو سکتی ہے۔ ناچ گھروں میں فرنیچر و فرش اچھا ہوتا ہے۔ اکثر مکان آراستہ ہیں۔ بعض میں کھانے پینے کا بھی انتظام ہے لیکن مہنگا ہوتا ہے۔ ایک ناچ گھر ایسا دیکھنے میں آیا کہ مکان کے ایک طرف بہت سی میزیں لگی ہوئی ہیں اور ہر میز کے مقابلہ میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ ہر میز پر ایک ٹیلیفون معہ نمبر لگا ہوا ہے۔ اسی طرح مسافر کی میز پر بھی ٹیلیفون لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی لڑکی پسند ہو تو ٹیلیفون ملا کر اسکو بلا سکتے ہیں مگر ایسی عورتوں سے ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ یہ سب پیسے لوٹنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس ناچ گھر میں سب سے پہلی دفعہ ہمنے ایک حبشی کو یوروپین لڑکی کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خوب ناچتا تھا۔ لیکن کالے اور گورے کا جوڑ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا ؎

شبے بود زنگی سیہ تر ز زاغ　　نہ نوچو در دست زنگی چراغ

البتہ اس بات سے خوشی ضرور ہوئی کہ ان ناچ گھروں میں رنگ کا تعصب نہیں ہے یہاں اکثر دولتمند سیاح تفریح کیلئے آیا کرتے ہیں۔ ان لڑکیوں کی خوب بن آتی ہے۔ قدر دانان حسن دل کھولکر روپیہ اٹھاتے ہیں۔ یہ عصمت فروش عورتیں ایک رات میں جس قدر کما لیتی ہیں بہت سی باکمال لوگ دنوں میں بھی اتنا نہیں کما سکتے۔ فردوسی نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

آسماں درد ہر دو ناں را کند دائم مدد — زاں سبب انگشت کوچک صاحب انگشتری ست

ہم نے بہت سے اہل ہنر اور صاحب علم وفضل کو دیکھا کہ تلاش روزگار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں مگر کوئی جھوٹوں بھی نہیں پوچھتا۔ چند ہی روز ہوئے جو ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ کوئی بی۔ اے پاس بنگالی نان شبینہ سے محتاج ہو کر بازار میں ایکطرف جوتے صاف کرنے کی پالش لئے بیٹھا تھا۔ آیندورروند سے کہتا تھا کہ بی۔ اے پاس سے جوتے صاف کروالو۔ مگر شومی قسمت نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا پولس کو شبہ ہوا کہ اس حیثیت کے آدمی نے ایسا ذلیل پیشہ کیوں اختیار کیا ہے فوراً اسکو گرفتار کر لیا۔ پھر خدا معلوم بیچارے پر کیا گذری۔ زمانہ کی کجرفتاری کو دیکھو کہ بدکردار اور ناہنجار ہستیوں کو آرام سے رکھتا ہے اور اہل ہنر کو یوں ذلیل وخوار کرتا ہے۔ ایران کے مشہور شاعر رشید الدین وطواط نے دنیا کے اس نشیب وفراز کی شکایت یوں کی ہے۔

فریاد ازیں جہاں کہ خردمند را درو
بہرہ بجز نوائب وحرماں نمی رسد
جہاں در تنعم وارباب فضل را
بے صد ہزار غصہ یکے ناں نمی رسد
جاہل بمجلس اندرو عالم بردلتا در
جویدبہ حیلہ راہ و بدان نمی رسد

سب سے بہتر اور مہذب ناچ گھر واٹرلینڈ ہے جو برلن کے مشہور محلہ پوٹسدامر پلاٹز میں ہے۔ اس ناچ گھر میں کوئی چیز خلاف تہذیب نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر سیاح اپنی عورتوں کو ساتھ لیجایا کرتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس شان کا کوئی ناچ گھر یورپ بھر میں نہیں ہے۔ یہ ایک عالیشان عمارت ہے اور بہت

آراستہ ہے داخلہ کیلئے ایک مارک دینا پڑتا ہے۔ نیچے کی منزل میں کوئی خاص بات نہیں ہے جو کچھ تماشا ہے وہ اوپر ہے۔ اوپر جانے کے لئے زینہ بھی ہے اور جھولا بھی۔ اس گھر میں آٹھ مختلف قہوہ خانے ہیں۔ تعریف یہ ہے کہ جس ملک کے نام سے جو قہوہ خانہ منسوب ہے اسمیں اسی ملک کے موسیقی۔ تمدن اور لباس وغیرہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایک قہوہ خانہ ایسا ہے کہ اس میں یوریا کے کوہ الپس کا منظر بہت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ مصنوعی پہاڑ اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کیلئے اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ اور مصنوعی طور پر بارش کا سماں پیدا کیا جاتا ہے۔ بجلی بھی چمکتی ہے۔ گرج بھی ہوتی ہے۔ اصل اور نقل میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ یوریا کی طرف کے نوجوان مرد اور لڑکیاں اپنے قومی لباس میں قہوہ خانہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ قومی ناچ اور گانا بہت دل آویز طریقہ پر ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترکی قہوہ خانہ بھی ہے جو مشرقی وضع کے فرش فروش سے آراستہ ہے۔ قدیم زمانہ کا ترکی لباس پہنے ہوئے شاگرد پیشہ قہوہ اور شربت تقسیم کرتے پھرتے ہیں قسطنطنیہ کا بہترین منظر شاخ زریں اس قہوہ خانہ میں بہت خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے۔ سب سے اچھا قہوہ خانہ ویانہ کا ہے جس میں ویانا کا خوبصورت منظر بہت کمال کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ دریائے ڈینوب کا نظارہ اور چلتی ہوئی ٹریم گاڑیاں اور بازاروں کی روشنی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تمام چیزیں جرمن کاریگری اور صناعی کا ثبوت ہیں ایک قہوہ خانہ ہسپانیہ کا ہے جہاں نوجوان لڑکیاں اپنے قومی لباس میں مہمانوں کی آؤ بھگت کرتی ہیں۔ الغرض یہ ناچ گھر ایک عجیب وغریب مقام ہے لطیفہ یہ ہے کہ یہ سارا تماشا پانچ چھ مارک میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سب سے پر لطف تماشہ تو یہ دیکھا کہ ایک پستہ قد آدمی دراز قد عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ سب کی

نظریں اس جوڑے کی طرف لگی ہوئیں تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عورت کے پیٹ میں سر دیئے ہوئے ہیں۔ بعض دفعہ سینما میں اس قسم کی تصویریں بتائی جاتی ہیں۔ سبحان اللہ! کیا خوب نشیب و فراز ہے ان حضرت کو چاہیئے کہ ہر وقت اپنی بغل میں ایک "فولڈنگ" یعنی تہہ ہونے والی سیڑھی رکھا کریں کیونکہ

یار باید سرو قد اما نہ چنداں سرو قد
کز برائے بوسہ او نرد باں باید نہاد

لونا پارک

برلن میں عیش و عشرت کے بہت کچھ سامان موجود ہیں اسی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں غیر ملک کے لوگ اس شہر میں روزانہ آتے ہیں۔ شام کے وقت تفریح کے واسطے لونا پارک ایک بہت اچھا مقام ہے۔ موسم گرما میں یہاں بہت رونق رہتی ہے۔ متعدد دکانیں۔ رسٹوران اور جوئے خانے کھلے رہتے ہیں۔ ناچ گھر بھی ہے اور تیرنے کے واسطے ایک بڑا حوض بھی ہے۔

مس برلن کا انتخاب

جس روز ہم لوگ اس باغ کی سیر کو گئے وہاں حسن کی قدردانی کا ایک خاص میلہ تھا اور مس برلن کا انتخاب ہونیوالا تھا۔ بہت سی خوبصورت نوعمر لڑکیاں جن کو اپنے حسن پر ناز تھا یہاں جمع تھیں۔ ایک اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا تھا جس پر لڑکیاں قطار باندھکر چکر لگاتی تھیں۔ ہر ایک کے ہات میں نمبر کی تختی تھی۔ جو لوگ جمع تھے انکو مطبوعہ فارم دیدیئے گئے تھے تاکہ وہ اپنی رائے کے مطابق خوبصورت لڑکی کا انتخاب کریں۔ ہم لوگوں کو بھی ایک ایک فارم ملا تھا لیکن سچ پوچھو تو اس کام کیلئے بھی مہارت کی ضرورت ہے بہت گھور گھور کر ان پریوں کو دیکھا۔ دوسرے لوگ بھی ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے۔

ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں　　　اب دیکھئے ٹھیرتی ہے جا کر نظر کہاں

نظر کمبخت کہیں بھی نہ ٹھیری۔ یا ٹھیری تو سب پر ٹھیری۔ ہر لڑکی اپنی جگہ حسُن کی مورت نظر آئی۔ حیران تھے کہ کس کو شہزادی قرار دیں۔ نظر کی نارسائی سے جب عاجز ہوئے تو الل ٹپّو ایک لڑکی کے نام پر دستخط کر دیئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نتیجہ کیا نکلا۔ کاش کہ ہماری منتخب کردہ لڑکی کامیاب نکلتی اور ہمکو اسکا علم بھی ہو جاتا تو آج ہم اپنے کو اس فن کا ماہر خیال کرتے۔

حکومت اٹلی نے خوبصورتی کے اس مقابلہ کو اپنے ملک میں مسدود کر دیا ہے۔ یہ طریقہ اخلاق عامہ کیلئے مضرت بخش ثابت ہوا۔ جو نوجوان لڑکیاں اس مقابلہ میں شریک ہوتی ہیں۔ اُن کو اپنے حسُن کے متعلق بڑا مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے اور خودستائی کے بیہودہ مرض میں اس درجہ مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کا دماغ ہر وقت ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ جو لڑکی کامیاب نکلتی ہے اسکی مسرت کے تو کیا کہنے لیکن بعض ناکامیاب لڑکیوں کی دل شکنی ان کو ہر وقت مغموم رکھتی ہے۔ ایک دوسرا بدنما پہلو اس مقابلہ کا یہ بھی ہے کہ اکثر دل پھینک عاشق مزاج نوجوان اس سند یافتہ حسن کی ملکہ کے فراق میں اپنا قیمتی وقت اور روپیہ ضایع کر دیتے ہیں۔ اسکے ماسوا اکثر ہوش و حواس کو بھی اپنے ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔ یورُپ کے دارالمجانین ایسے پاگلوں سے بھرے ہوئے ہیں جنھوں نے محض عشق کے پیچھے عقل سلیم کو خیرباد کہدیا۔ خدا محفوظ رکھے۔ عشق بھی کیا برُی بلا ہے ؎

راؤں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے　　　گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ　　　جو گنج تونے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

فرہاد کوہ کن کی لی جان تونے شیریں　　　اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی　　　عقل و خرد کا تونے خاکہ اڑا کے چھوڑا

ٹیر گارٹن

اُس رات کو آتش بازی بھی چھوٹی تھی۔ برلن کا سب سے بڑا باغ ٹیر گارٹن ہے۔ یہاں لوگ تفریح کے واسطے بکثرت جاتے ہیں۔ اسی باغ کے ایک گوشہ میں چڑیا گھر ہے جسکو انگریزی میں زو کہتے ہیں ایک طرف اکیورم ہے جس میں سمندر کی عجیب وغریب مچھلیاں اور دوسرے زندہ جانور رکھے گئے ہیں۔ اسکی سیر بھی ضرور کرنی چاہئے۔ عجیب شان کبریائی نظر آتی ہے سمندر کے اندر ہماری نظروں سے پوشیدہ کیسی حیرت ناک مخلوق موجود ہے۔

کھیل کود اور تفریح کے مقامات

کھیل کود کے مقامات بھی خاص طور پر دیکھنے کے لایق ہیں۔ برلن سے کچھ فاصلہ پر ایک مقام ہے جسکو گرونی والڈ کہتے ہیں اس نواح میں ایک جگہ ہے جو استادین کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جگہ کھیل کود کا مرکز ہے۔ ایک بہت بڑا حوض بنا ہوا ہے جس کے چاروں طرف ساٹھ ہزار آدمی کے واسطے نشست کا انتظام ہے۔ یہاں ہر قسم کے کھیل کود کا بندوبست ہے۔ نہانیکے واسطے بھی حوض بنے ہوئے ہیں۔ انمیں عورت مرد سب ایک ہی جگہ پر نہاتے ہیں۔ ساتھ نہانے کا رواج یورپ میں عام ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے برلن میں لب دریا جاکر یہ تماشا دیکھا۔ دریا کے کنارہ پر ریت میں ہزارہا مرد اور عورت دھوپ میں پڑے تھے۔ یہ سب لوگ نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھے جس میں تقریباً آدھا جسم ننگا رہتا ہے۔ لب دریا نہانیکے مقام پر کھانے پینے کی دکانیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں بکثرت کرایہ پر ملتی ہیں۔ اتوار کے دن مجمع کثیر ہوتا ہے اور بڑی رونق رہتی ہے۔

ننگوں کا کلب

سائنس کی ترقی اور جسمانی صحت کا خیال جرمنی میں ننگے پن تک پہونچ گیا ہے۔ شہر سے تقریباً

تین میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا باغ ہے۔ جس میں داخل ہونیکے واسطے کچھ فیس لیجاتی ہے۔ اس باغ کا مالک ایک ماہر فن ڈاکٹر ہے۔ باغ کے ایک جانب دریا ہے۔ جو درختوں کی آڑ کیوجہ سے داخلہ کے مقام پر سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس دریا کے کنارہ پر مرد اور عورت بالکل برہنہ دھوپ میں پڑے سینکتے ہیں اور نہاتے ہیں ہم لوگ داخلہ کے مقام پر ڈاکٹر سے ملے۔ یہ شخص مادرزاد برہنہ تھا اور اس کے ساتھ اسکی نوجوان لڑکی بھی تھی جسکے جسم پر مطلق کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیٹی سے ہمارا تعارف کرایا۔ آپس میں کسی قسم کا حجاب نہ تھا۔ ڈاکٹر نے ہم سے کہا کہ آپ لوگ کپڑے اُتار کر لب دریا جا سکتے ہیں۔ ہم نے کہا ہم کو ایسی عادت نہیں۔ ہم محض تماشا دیکھنے کو آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ قاعدہ کی رو سے آپکو لباس پہنے ہوئے اندر جانے کی اجازت نہیں دیجا سکتی۔ سب کو ایک حالت میں ہونا چاہیئے۔ اس موقع پر ہماری پارٹی میں اختلاف آرا ہوا۔ ہم چار آدمی تھے دو کی رائے یہ تھی کہ جب اتنی دور آئے ہو تو اس تماشہ کو بھی دیکھ لو۔ باقی دو کپڑے اُتارنے پر رضامند نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا میں ایک چھولداری دیتا ہوں جو لوگ دریا پر جانا نہیں چاہتے وہ اسمیں ٹھیر سکتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دو آدمی چھولداری میں ٹھیرے رہے اور دو آدمی کپڑے اتار کر دریا کے کنارہ پر گئے جب کھانے کا وقت قریب آیا تو آرڈر دینے پر دو نوجوان برہنہ عورتیں کشتیوں میں کھانے کی چیزیں لگا کر چھولداری میں لائیں مطلق ان کو حجاب نہ تھا۔ حجاب کی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ ان کا اعتقاد تو یہ ہو گیا ہے۔

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

کھانے کا آڈر جس طرح دیا گیا وہ قصہ بھی لائق تذکرہ ہے۔ ایک نبجے کے

قریب بھوک کا زور ہوا۔ ہمارے جو ساتھی سیر کرنے کیلئے دریا کے کنارے پر گئے ہوئے تھے کچھ ایسے بے خود رہے کہ واپسی کا نام بھی انہوں نے نہ لیا۔ ہم دونوں نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میرے شریک حال نے کہا بہتر تو یہ ہوگا کہ تم پتلون اتار دو۔ مگر قمیص پہنے رہو۔ اور رسٹوراں تک جاکر کھانے کا آرڈر دیدو۔ میں اس وضع کو اختیار نہ کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ مشورہ دینے والا خود ہی اپنے مشورہ پر کاربند ہو۔ مگر وہ حضرت مجھ سے بھی زیادہ قدامت پسند نکلے۔ پتلون تو ایک طرف وہ کوٹ اتارنے پر بھی رضامند نہ تھے۔ بالآخر ع۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند کا حساب ہوا۔ اسکی بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ضعف معدہ کی بیماری مجھ کو خالی پیٹ میں تکلیف دیتی تھی۔ میرے ساتھی کو بھوک کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ بلکہ وہ سونے کی تیاری کرنے لگے بدرجہ مجبوری پتلون کو الگ کیا۔ خالی قمیص سے باہر نکلا۔ اور بادل ناخواستہ دریا کی طرف چلا۔ چند قدم گیا تھا کہ ایک نگہبان نے جو لباس کے جھگڑے سے آزاد تھا آکر روکدیا۔ اشاروں میں جو کچھ گفتگو ہوئی اس کا منشاء یہ تھا کہ تہذیب کے آثار قدیمہ یعنی قمیص و بنیان کو جسم سے الگ کرو۔ اور نئی وضع اختیار کرکے اس دنیوی بہشت میں داخل ہو۔ ورنہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔ میں نے اپنی نبض پر ہاتھ رکھکر یہ عذر کیا کہ بخار کی وجہ سے لباس نہیں اتار سکتا۔ لیکن اسکی تشفی نہ ہوئی۔ تب میں نے کہا کہ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھارہے ہیں۔ اس نے کہا میں تمہارے کھانے کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ تم اپنی جگہ واپس جاؤ۔ یہ انتظام جس شان کیساتھ ہوا اسکا ذکر میں نے اوپر کردیا ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ماں باپ معہ اپنی نوجوان بیٹیوں کے بلا تکلف ننگے پھر رہے تھے۔ جو لوگ دریا پر گئے تھے انہوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارہ پر کثرت سے مرد اور عورت برہنہ حالت میں سیر و تفریح میں مصروف تھے۔ دریا کی دوسری جانب

ایک اور کلب اسی قسم کا تھا۔ ہمارے دونوں ساتھی کشتی کے ذریعہ اس کلب میں بھی گئے۔ وہاں کے ڈاکٹر نے بڑی آؤ بھگت کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہمارے کلب میں چالیس سال سے زیادہ عمر والے کو نہیں لیتے۔ آپ ناحق دوسرے کلب میں گئے۔ القصہ شام کو سر مغرب وہاں سے واپس ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے ایک انگریزی اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کلب کے بعض ممبر برہنہ حالت میں قریب کی آبادی میں چلے گئے تھے۔ پولس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تعجب کا مقام ہے کہ جو قوم مہذب اور شائستہ ہونیکی دعوی دار ہے وہ اس معاملہ میں ترقی معکوس کر رہی ہے۔ سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔ جب دنیا شروع ہوئی تو اس وقت بھی لوگ ننگے ہی رہتے ہونگے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ننگا رہنا تندرستی کیلئے بے حد مفید ہے۔

سنا جاتا ہے کہ فرانس والے بحر روم کے ایک جزیرہ میں بالکل اسی نمونہ پر ایک شہر آباد کرنے والے ہیں۔ لباس کا جھگڑا اٹھا دیا جائے گا۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ خیال کس حد تک کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ برہنہ کلب سے واپس ہوتے وقت راستہ میں ایک رسٹوران ملا۔ وہاں چائے پینے کی خاطر کچھ دیر ٹھیرے۔ جو تماشا دیکھتے ہوئے آئے تھے اسکے متعلق بہت کچھ رد و قدح ہوئی۔ مختلف خیالات نے مختلف نتائج پر پہونچایا۔ جب دیر زیادہ ہوئی تو ایک صاحب نے کہا اب اس قصہ کو ختم بھی کرو۔ ننگے رہتے ہیں تو رہنے دو۔ نقصان اٹھانے کے بعد خود ہی راستہ پر آجائیں گے ؎

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

خود ہم لوگوں کی پچاسوں باتیں اصلاح طلب ہیں۔ دوسروں پر اعتراض

کرنے سے کیا حاصل۔ واپسی کے وقت ہم برلن کے ایک ایسے محلہ میں سے گذرے
جہاں امریکن وضع کی سربفلک عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ شوق حال میں پیدا ہوا ہے

پوسدام

برلن کے باہر دو ایک مقامات خاص طور پر دیکھنے کے لایق ہیں۔ ہر سیاح کو چاہیئے کہ ان مقامات کی سیر کرے

انکے منجملہ سب سے اہم مقام پوسدام ہے جو برلن سے تقریباً سولہ میل کے فاصلہ پر دریائے ہیون کے کنارہ آباد ہے۔ قصبہ تو چھوٹا ہے لیکن کئی باتوں سے خاص حالت رکھتا ہے اول تو یہ کہ اس کا موقع بہت خوبصورت ہے۔ دریا کی متعدد شاخیں تالاب کی شکل میں آبادی کی رونق کو بڑھاتی ہیں۔ دوسرے سرسبز اور خوشنما باغ ہیں۔ قدرتی مناظر نہایت دلکش ہیں۔ یہاں کے شاہی محلات بھی قابل دید ہیں۔ ان میں سنو لی پیلیس ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۱۶۶۰ء عیسوی میں فریڈرک اعظم نے یہ محل بنوایا تھا۔ اس محل کے صحن میں جو پارک ہے اس میں ایک فوارہ عجیب و غریب ہے۔ ہمارے رہبر نے ہم سے کہا کہ اس فوارہ میں اس قدر قوت ہے کہ اس کا پانی سوا سو فیٹ بلندی تک جاتا ہے۔ لیکن یہ روزانہ پوری قوت کے ساتھ نہیں چھوڑا جاتا۔ اسقدر قوت کا فوارہ شاید تمام یورپ میں نہیں ہے۔ ہماری موجودگی میں بھی فوارہ چل رہا تھا اور اچھی بلندی تک پانی جارہا تھا۔ شاہی محل میں داخلہ کچھ فیس ادا کرنے پر ملتا ہے روزانہ سینکڑوں آدمی دیکھنے کیلئے آتے ہیں۔ محل کے اندر داخل ہونیکے قبل بہت بڑی اور ڈھیلی سلیپر پہننی پڑتی ہیں جن سے پاؤں ہاتھی کے سے معلوم ہونے لگتے ہیں اور چلنے میں تکلف ہوتا ہے۔ اس موقع پر آپس میں بڑی ہنسی اور مذاق رہتا ہے محل کی سیر ایک رہبر کراتا ہے جو مختلف زبانوں سے واقف ہوا کرتا ہے۔ متعدد کمرے ہیں اور سارے محل کی آرایش کا ساز و سامان قابل دید ہے۔ بعض مقامات خاص دلچسپی کے ہیں۔ مثلاً قیصر کی خوابگاہ اور کھانے کا کمرہ وغیرہ۔ اس محل میں

ایک بہت بڑا ہال ایسا ہے کہ جسکی دیواروں میں قیمتی اور کمیاب پتھر جڑے ہوئے ہیں
برلن سے پوسدام جانیکے کئی راستے ہیں۔ قریب ترین راستہ ریل سے ہے جو
پوسدام بان ہاف سے جاتی ہے (جرمنی میں اسٹیشن کو بان ہاف کہتے ہیں)
لیکن ہم لوگ موٹر کوچ میں گئے تھے۔ یہ طریقہ زیادہ دلچسپ ہے۔ برلن کی مشہور
سڑک امنٹر ڈن لنڈن سے موٹر کوچ روانہ ہوتی ہے۔ ہم نے کک کمپنی سے ٹکٹ
خرید لئے تھے۔ موٹر میں متعدد مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ مخملی بانات کے گدے تھے
غرض بڑی آسایش کی سواری تھی۔ مشہور مقامات جو راستہ میں ملتے ہیں رہبر اُن کو
بتلاتا جاتا تھا۔ کچھ دور موٹر میں جانیکے بعد دریا ملتا ہے۔ یہاں موٹر چھوڑ کر اسٹیمر میں
سوار ہوتے ہیں جس کا کرایہ ٹکٹ میں شامل ہے۔ دوسرے کنارہ پر موٹر میں تیار
ملتی ہیں۔ شاہی محل جانے سے قبل ایک بڑے رسٹوران میں گئے۔ وہاں کچھ کھایا۔
رونق کی جگہ تھی۔ سیر سے فارغ ہوکر شام کو ایک دوسرے راستہ سے واپس ہوئے۔
لب دریا عورت اور مرد کثرت سے نہا رہے تھے اُس روز ہوا کسی قدر سرد تھی ہم
گرمی کے خیال سے اپنے اُورکوٹ ہوٹل میں چھوڑ آئے تھے۔ مجھکو سردی کی وجہ سے
کسیقدر تکلیف ہوئی۔ واپس آنیکے بعد سلیم بھائی کو بخار آگیا۔ ہمارے ساتھ کونین

ضروری ادویات

کی گولیاں تھیں اور ملین معدہ دوا بھی تھی۔ انکا
استعمال کیا گیا۔ دو روز بعد آرام ہوگیا۔ ہر مسافر
کو چند ضروری ادویات پاس رکھنا ضروری ہے کیونکہ زبان کی ناواقفیت ایسے
موقعوں پر بہت پریشان کرتی ہے۔ اول تو طبیب کے پاس رجوع ہونا مشکل
دوسرے بازار میں دوا خریدنا مشکل دوا فروش عام طور پر انگریزی سے ناواقف
ہیں۔ اور انگریزی ساخت کی ادویات بہت گراں ہیں۔ مجھکو ایک دفعہ مگنیشیا
خریدنے کی ضرورت تھی۔ متعدد دکانوں پر دریافت کیا کوئی انگریزی داں نہ ملا

بالآخر ایک دوکان پر بہت دیر تک اشاروں میں مطلب کو سمجھایا۔ بڑی مشکل کے بعد مگنیشیا بمدست ہوا۔ اسی طرح ایک دفعہ ایسی دوا کی ضرورت تھی جس سے پاؤں کے گٹے جاتے رہیں۔ گٹوں کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بدرجہ مجبوری جوتا اور جراب اتار کر دوکاندار کو پاؤں بتلایا تب کہیں مقصد برآری ہوئی۔ دوکاندار نے اشاروں کے ذریعہ ترکیب استعمال بتلائی جس میں بہت کچھ وقت ضایع ہوا۔

راستہ بھولنا

اکثر اوقات راستہ معلوم نہیں ہوتا اور انگریزی داں آدمی ہر موقع پر ملنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایکدفعہ میں تنہا ہوٹل سے دور نکل گیا۔ واپسی کے وقت راستہ بھول گیا۔ قریب نہ تو ٹریم تھی نہ موٹر بس۔ مجھکو یہ معلوم کرنا تھا کہ کس مقام سے ہوٹل جانے کیلئے موٹر بس مل سکتی ہے۔ پریشان پھرتا رہا مگر انگریزی داں آدمی نہ ملا۔ بہت دیر کے بعد ایک عورت ملی جو کچھ انگریزی جانتی تھی۔ اس سے میں نے راستہ دریافت کیا۔ اس نے کہا یہ کام میرا نہیں ہے۔ کسی پولس کے جوان سے دریافت کرو۔ میں نے کہا یہاں کی پولس انگریزی سے واقف نہیں ہے اسلئے مجھکو پولس سے کچھ امداد نہیں مل سکتی۔ تم انگریزی جانتی ہو۔ تم کو چاہئے کہ میری مدد کرو۔ اس نے کہا کہ مجھکو افسوس ہے کہ میں راستہ سے واقف نہیں ہوں۔ اسلئے تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا میں تمکو چھوڑونگا نہیں اور جہاں جہاں تم جاؤ گی تمہارے ساتھ میں جاؤں گا۔ اس نے جواب دیا کہ آخر میں کس طرح تمہاری مدد کروں۔ میں نے کہا تم میرے ساتھ پولس کے جوان کے پاس چلو اور اس سے دریافت کر کے مجھے راستہ بتلاؤ۔ اس پر وہ راضی ہو گئی چنانچہ میرے ساتھ وہ پولس کے جوان کے پاس گئی اور اس سے راستہ دریافت کر کے بتلایا کہ فلاں نمبر کی موٹر بس ملیگی اور فلاں مقام سے

اس پر سوار ہوجاؤ۔ اس طرح یہ مشکل آسان ہوئی۔ برلن کے پولس کی ایک بات جو سب سے اچھی معلوم ہوئی یہ ہے کہ بات کرنے سے پہلے پولس کانسٹبل باقاعدہ سلام ضرور کرتا تھا اور مجھکو فوراً اپنا مجسٹریٹ ہونا یاد آجاتا تھا۔ موٹر بس میں سوار ہوکر میں ہوٹل کی طرف روانہ ہوا لیکن غلط فہمی کیوجہ سے پوٹسدامر پلاٹز پر اتر گیا حالانکہ وہاں سے میرا ہوٹل کوئی نصف میل کے فاصلہ پر تھا۔ مجھکو یہ بھی خوف تھا کہ کہیں ہوٹل سے بہت آگے نہ نکل جاؤں۔ غرض یہ کہ ایک غلط جگہ اُتر گیا۔ مغرب کا وقت تھا اور تمام دن کی گردش کی وجہ سے تکان غالب تھی۔ کسی قدر حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔

ایک عورت کی امداد

موٹر بس سے اُترتے ہی ایک دوسری مشکل کا سامنا ہوا یعنے ایک عورت نے بلاتکلف میرا ہاتھ پکڑلیا اور اپنی زبان میں اس نے کچھ کہا۔ میں نے انگریزی میں اس سے بات کی مگر وہ انگریزی سے کوری نکلی۔ اس نے اشارہ سے مجھکو پٹری کے ایک طرف بلایا جہاں ایک بڑا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ عورت نے اشارہ سے کہا کہ اس تھیلے کو اٹھانے میں میری مدد کرو۔ میں سمجھا یہ کسی قریب مقام پر جاتی ہوگی۔ اخلاقی طور پر بھی امداد کرنا مناسب معلوم ہوا۔ کچھ فاصلہ تک ہم دونوں اس تھیلے کو اٹھا کر لیگئے۔ عورت تھک گئی اور اس کا سانس چڑھنے لگا۔ اس نے تھیلا زمین پر چھوڑ دیا اور میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے اشارہ سے روکا اور کہا کہ ٹھیر جاؤ ابھی اور آگے جانا ہے۔ چنانچہ کچھ دور تک پھر تھیلا اٹھا کر لیگئے۔ عورت دوبارہ تھک گئی۔ اور آرام لینے لگی۔ میں نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ اس نے اشارہ سے بتایا کہ سڑک کی دوسری جانب جو مقام ٹریم کے کھڑے ہونیکا ہے۔ وہاں مجھے جانا ہے۔

وہاں تک یہ تھیلا لے چلو۔ میں نے کہا سڑک بہت چوڑی ہے اور ٹرافک کی کثرت ہے یہ کام مشکل اور خطرناک ہے مگر اس نے اصرار کیا کہ وہاں تک جانا ضروری ہے بالآخر موٹروں سے بچتے ہوئے بڑی مشکل سے اس تھیلے کو میں دوسری جانب لیگیا۔ اس مقام پر پہونچنے کے بعد میں رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن عورت نے مجھے روکا اور جلدی سے اپنا بٹوا نکالکر کچھ معاوضہ مجھکو دینا چاہا۔ میں نے شکریہ کیسا تھ اس کو روک دیا مگر وہ مانتی نہیں تھی اسلیئے میں نے اس کا بٹوا بند کر کے تھیلے میں رکھدیا اور وہاں سے جانے لگا۔ اس نے کہا کہ کم سے کم ہاتھ تو ملاتے جاؤ چنانچہ اس سے مصافحہ کر کے میں مقابل کی پٹری پر چلا گیا۔ جہاں سے مجھ کو توقع تھی کہ میرے ہوٹل کو ٹریم جاتی ہے۔ اس مقام سے میں نے دیکھا کہ ایک ٹریم آئی اور اسمیں سوار ہونیکی کوشش اس عورت نے کی لیکن اس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ٹریم اسکے مقام کو نہیں جاتی اور وہ غلط جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔ اسکو دراصل وہاں آنا چاہیے تھا جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ معلوم کر کے اس عورت کو بڑی پریشانی ہوئی اور اس نے امداد کے واسطے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی مدد نہ ملی کچھ دور تک اس نے تنہا تھیلے کو گھسیٹا لیکن تھیلا بہت وزنی تھا اسلیئے بیچاری کو اس کا گھسیٹنا مشکل ہوگیا۔ آخر میں دوبارہ اسکی مدد کو گیا اور ہم دونوں نے ملکر اس تھیلے کو دوسری جانب منتقل کیا۔ اس عورت سے مجھکو یہ معلوم ہوا کہ میں خود غلط جگہ پر کھڑا ہوں۔ میری ٹریم اس جگہ نہیں آئے گی۔ اس نے اشارہ سے دوسری جانب وہ مقام بتایا جہاں میری ٹریم آتی تھی۔ میں نے کہا اس دفعہ میں تم کو ٹریم میں سوار کرا کر جاؤنگا۔ تھوڑی دیر میں اسکی ٹریم آگئی اور میں نے اس کو سوار کرا دیا۔

برلن کے بازار میں گاندھی کی جے

ایک اور واقعہ برلن کے بازار کا قابل ذکر ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ میں خط ڈالنے کی واسطے لیٹر بکس کی تلاش میں تھا۔ بازار کے ایک جانب ایک اخبار فروش کھڑا تھا اس سے میں نے لیٹر بکس دریافت کیا۔ وہ انگریزی جانتا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ (بندے ماترم گاندھی جی کی جے) کا نعرہ مارا۔ مجھکو یہ معلوم کرکے بہت تعجب ہوا کہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا مگر امریکہ میں رہ چکا ہے اسلئے انگریزی جانتا ہے۔ وہ مجھ سے ہندوستان کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر مجھے ایک ضروری کام تھا اور بازار میں اجنبی آدمی سے اس قسم کی گفتگو مناسب بھی نہ تھی۔ اسلئے میں نے اسکو ٹال دیا۔ برلن میں اکثر لوگ ہندوستان کے سیاسی معاملات پر گفتگو کرنیکی کوشش کرتے ہیں مگر انگریزی میں کافی مہارت نہ ہونیکی وجہ سے مجبور رہتے ہیں۔

ہوائی جہاز

ایک مقام (ٹیمپل ہاف) ہے جو برلن کے ہوائی جہازوں کا مرکز ہے اس جگہ بڑی رونق رہتی ہے مختلف مقامات سے ہوائی جہاز مسافرونکو لئے ہوئے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ ہم نے دو دفعہ شہر برلن پر ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ پہلی دفعہ ہم ایک رسٹوران میں لب سڑک بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ آوازسی آئی اور دیکھا کہ لوگ سڑک کیطرف جارہے ہیں اور بہت شوق کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ بھی باہر نکلے ایک ہوائی جہاز آسمان پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اسکی دُم میں سے ایک باریک لکیر دھوئیں کی نکلتی تھی۔ کمال اس میں یہ تھا کہ قلابازی کی گردش سے دھوئیں کے حروف بنتے جاتے تھے جو چند منٹ تک قایم رہے پھر معدوم ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ

کسی دکان کا اشتہار ہے۔ کیا خوب طریقہ نکالا ہے لیکن یہ اشتہار قیمتی ضرور ہوتا ہوگا۔ انسان کی یہ بلند پروازی آجکل سائنس کا ایک ادنی کرشمہ ہے لیکن موجودات عالم سے فائدہ اٹھانا بھی عقل انسانی کا کام ہے۔

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور
فرش سے لے عرش تلک کر رہا ہے اپنا زور

البتہ عقل انسانی چونکہ کسی حال میں خطا سے خالی نہیں ہے اسلئے انسان کی اس ایجاد میں بھی نقائص موجود ہیں۔ دوسری دفعہ میں تنہا ایک دکان میں کچھ خرید رہا تھا۔ دفعتاً دکان دار کاروبار چھوڑ کر کچھ کہتا ہوا سڑک کی طرف بھاگا میں پریشان ہوا کہ یا الٰہی کیا مصیبت آنیوالی ہے ممکن ہے کہ زلزلہ آرہا ہو مصلحت وقت کو مناسب خیال کرکے میں دکاندار کے پیچھے دوڑا۔ باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک زیلین اُڑ رہا ہے اور اسکو دیکھنے کیلئے سینکڑوں آدمی مرد عورت جمع ہوگئے ہیں۔ راستہ چلنے والے اپنی اپنی جگہ رکے ہوئے تھے اور مکانات کی کھڑکیوں سے لوگ باہر لٹکے ہوئے آسمان کیطرف دیکھ رہے تھے۔ مجھکو بہت تعجب ہوا کہ یہ لوگ بھی ہوائی جہاز کو اب تک اسطرح دیکھتے ہیں جیسے ہندوستان کے لوگ لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس زپلن میں کوئی خاص بات ہوگی شاید گراف زپلن ہو جسکی پرواز کی ابھی تک دھوم مچی ہوئی ہے۔

آب وہوا

برلن کی آب وہوا اچھی اور صحت بخش ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی نسبت یہاں جاڑوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ ہم کو گرمی کا تجربہ ہے جون کا مہینہ تھا۔ گرمی خاصی تھی۔ یہاں موسم گرما میں مقیاس الحرارت بالعموم (۷۰) ستر ڈگری سے اوپر نہیں جاتا بعد میں بارش ہونیکی وجہ سے سردی بھی ہوگئی۔ مکانوں میں پنکھے

نہیں ہوتے اسلئے گرمی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگ محض قمیص سے بازاروں میں پھرتے دکھائی دیئے۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ رسٹوران میں کوٹ اتار کر کھانا کھاتے تھے۔ ایک روز ہم کو بھی گرمی سے تکلیف ہوئی۔ ہوٹل میں کھانے کی میز پر ایک امریکن سیاح تھے۔ ان کو بھی گرمی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے لحاظ سے کوٹ نہیں اتارتے تھے۔ میرے قریب ان صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سے میں نے کہا آج گرمی بہت ہے اگر اجازت دو۔ تو کوٹ اتار دیں۔ انہوں نے کہا بہت خوشی کے ساتھ۔ یہ بھی کہا کہ میرے خاوند کو بھی گرمی معلوم ہوتی ہے لیکن تم لوگوں کی وجہ سے وہ کوٹ نہیں اتارتے۔ بالآخر ہم سب نے کوٹ اتار دیئے۔ گرمیوں میں آئس کریم اور آبشورہ کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے آئس کریم کی اچھی اچھی دکانیں بازاروں میں ہر جگہ دکھائی دینگی۔

زمین دوز ریل

برلن میں انڈر گرونڈ یعنے زمین دوز ریلوے بھی ہے گاڑیاں نفیس اور صاف ستھری ہیں۔ اسٹیشن بھی اچھے بنے ہوئے ہیں۔ ہم کو کئی دفعہ اس میں بیٹھنے کا موقع ہوا مگر یہاں بھی زبان کیوجہ سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کس پلیٹ فارم سے کونسی ٹرین پر سوار ہونا چاہئے۔ یہی مشکل موٹر بس اور ٹریم کی سواری میں پیش آتی ہے ہم لوگ زیادہ تر پیدل چلتے تھے۔ یا ٹیکسی میں سوار ہوتے تھے۔ پیدل چلنا زیادہ مفید ہے کیونکہ سیر کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔

دوکانیں

بالخصوص دکانوں کی رونق اور سجاوٹ خوب دیکھنے میں آتی ہیں۔ برلن کی دکانیں بہت دل آویز طریقہ پر سجائی جاتی ہیں۔ ریشمی پاتابے اور چمڑے کا سامان اچھا وارزاں ہے۔ یہاں کے بنے ہوئے سگریٹ اچھے نہیں ہوتے اور انگریزی سگریٹ مہنگا ملتا ہے البتہ

سگار یہاں کا اچھا ہوتا ہے۔ قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ ایک آنہ میں اچھا سگار ملجائیگا۔

پبلک ٹلیفون

پبلک ٹلیفون جا بجا لگے ہوئے ہیں۔ اگر زبان آئے تو بات کر لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ لندن کی نسبت فیس بھی کم ہے مگر خوبی یہ ہے کہ اگر بات نہ ہو سکے تو پیسے واپس نہیں ملتے۔ اسکے خلاف لندن میں پیسے واپس ملجاتے ہیں۔

جرمنی کے لوگ

جرمن لوگ عام طور پر خلیق ہوتے ہیں۔ مصافحہ کرنے کی رسم بہت مقبول ہے علی الصبح ایک دوسرے سے ہاتھ ضرور ملاتے ہیں۔ مجھکو ان لوگوں کی جو چیز ناپسند ہے وہ انکا منڈا ہوا سر ہے۔ سر کے بال اس درجہ خشخشی ہوتے ہیں کہ دور سے منڈا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور خصوصیت ان لوگوں کی تذکرہ کے لایق ہے۔ وہ یہ کہ انکار کے موقع پر شانے اونچے کر دیتے ہیں مثلاً اگر ان سے کوئی سوال کیا جائے اور جواب میں وہ آدمی شانہ اونچا کرے تو اسکے یہ معنے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم۔ اٹلی اور فرانس میں بھی یہ شانے چڑھانے کی رسم عام ہے۔

اس ملک کی عورتیں بھی مضبوط اور دوہرے جسم کی ہوتی ہیں۔ انکو بچپن ہی سے امور خانہ داری سکھائے جاتے ہیں اسلئے گھریلو کاموں میں یہ بہت سلیقہ شعار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر اپنے گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتوں کی طرح حد سے زاید آزاد خیال نہیں ہوتیں۔ سنا ہیکہ جنگ کے بعد سے عورتوں کے طرز تمدن اور خیالات میں بھی بہت کچھ انقلاب پیدا ہو گیا ہے

برلن سے لندن کو روانگی

۲۴ جون کو دن کے ایک بجے میں برلن سے لندن روانہ ہو گیا۔ درجہ دوم کا کرایہ پانچ پونڈ کے قریب ہوتا ہے۔ اسمیں اسٹیمر کا کرایہ

بھی شریک ہے۔ لنڈن کی ریل فریڈرش بان ہاف سے روانہ ہوتی ہے سلیم بیگ
اور رفیق بیگ کو برلن میں کام تھا اسلئے وہ وہیں ٹھیر گئے۔ یہ دونوں مجھکو اسٹیشن پر
پہونچانے آئے تھے۔ میں نے اپنا ٹکٹ امریکن اکسپرس کے ذریعہ سے خرید لیا تھا۔
اسٹیشن پر پلیٹ فارم ٹکٹ کی ضرورت ہوئی۔ ہر چند خریدنے کی کوشش کی مگر کسی
کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بدرجہ مجبوری یہ دونوں مایوس ہوکر واپس جانیوالے تھے کہ
ایک انگریزی داں نے ہم سے کہا کہ تمہارے پیچھے مشین لگی ہوئی ہے۔ اس میں
پیسے ڈالکر ٹکٹ نکال لو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس اسٹیشن پر ریل بہت کم ٹھیرتی ہے
جلدی میں یہ ہوا کہ جو درجہ ہمارے سامنے آیا اس میں ہم نے سامان رکھدیا اور ریل
روانہ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ٹکٹ کلکٹر آیا۔ اس نے ٹکٹ دیکھ کر جرمنی زبان میں کچھ
کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اتفاق سے ایک جرمن مسافر کچھ انگریزی جانتا تھا
اس نے مجھکو سمجھایا کہ یہ درجہ راستہ میں ایک مقام پر کٹ کر سیدھا امسٹرڈم
جائے گا۔ تم غلط گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تم کو چاہئے کہ اس گاڑی میں بیٹھو جو
ہوک آف ہالینڈ کو جاتی ہے۔ اب بھی سامان منتقل کرنے کا بہت موقع ہے۔ نیچے
اترنے کی ضرورت نہیں ہے چلتی ریل میں سامان منتقل کرسکتے ہو۔ تمہارا درجہ
انجن کے قریب ہے۔ یہ معلوم کرکے کسی قدر تشویش پیدا ہوگئی۔ ٹکٹ کلکٹر تو چلا گیا
میں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ دل چاہتا تھا کہ امسٹرڈم چلا جاؤں۔ سیر ہو جائیگی
مگر خیال آتا تھا کہ تنہا ہوں اور اس ملک کی زبان نہیں جانتا۔ زبان کی مشکلات
کا تلخ تجربہ بہت کچھ ہوچکا تھا اسلئے پس و پیش تھا۔ ٹکٹ کلکٹر دوبارہ آیا اور
تقاضا کرنے لگا کہ یا تو سامان منتقل کرو یا امسٹرڈم کا ٹکٹ خرید لو بالآخر میں نے
لنڈن جانے کا ارادہ مصمم کرلیا اور درجہ میں سامان چھوڑکر جگہ کی تلاش میں روانہ
ہوا۔ لنڈن کے مسافروں کی گاڑی بہت دور انجن کے قریب تھی۔ راستہ میں

مجھکو معلوم ہوا کہ اکثر مسافر میری طرح غلط درجہ میں سوار ہوگئے ہیں یہ لوگ بھی جگہ کی تلاش میں تھے۔ لندن کی گاڑی کے ایک درجہ میں مجھکو جگہ ملگئی۔ وہاں میں نے اپنا ہینڈ بیگ رکھدیا اور اس فکر میں تھا کہ سامان کیسے منتقل کروں اتنے میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دوسروں کا سامان منتقل کرتا پھرتا ہے۔ اس سے میں نے اشاروں میں اپنا مطلب سمجھایا۔ اس نے آمادگی ظاہر کی تو میں اسکو اپنے ساتھ لے گیا اور اپنا سامان اٹھوالایا۔

یورپ کی ریل

براعظم کی ریلوں میں تین درجے۔ اول۔ دوم اور سوم ہوا کرتے ہیں۔ اول اور دوم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا البتہ اتنا ضرور ہے کہ درجہ اول میں مسافر کم ہوتے ہیں اسلئے پاؤں پھیلانے کیلئے اکثر موقع ملجاتا ہے۔ تیسرے درجہ میں مسافروں کی کثرت ہوتی ہے اور بنچوں پر گدہ نہیں ہوتا۔ کسی درجہ میں آٹھ مسافر سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک پسندیدہ طریقہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جگہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اول تو مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر ایک درجہ میں بیٹھ نہیں سکتے دوسرے یہ کہ جگہ خالی ہو تو آنیوالے مسافر کو نہ تو روکتے ہیں اور نہ مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ہمارے ملک میں ایک عام طریقہ یہ پڑگیا ہے کہ نئے مسافر کو حتی الامکان درجہ میں سوار ہونے سے روکتے ہیں۔ غلط ہو یا صحیح اتنا ضرور کہدیتے ہیں کہ حضرت آگے تشریف لیجائیے۔ دوسرا درجہ خالی پڑا ہے۔ بعض لوگ اندر سے کھٹکا لگا لیتے ہیں۔ کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جن کو ریل کی کنجی کہیں سے دستیاب ہوگئی ہے سفر کے وقت اسکو ضرور اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیٹ کی خاطر بڑے بڑے ہنگامے بھی ہمارے ہاں ہوتے رہتے ہیں۔ یورپ میں یہ سب باتیں مفقود ہیں۔ مسافر ایک دوسرے کے ساتھ نہایت درجہ

اخلاق اور راست بازی سے کام لیتے ہیں۔ نیا مسافر کسی درجہ میں سیٹ خالی بھی دیکھے تو بیٹھنے والوں سے اول دریافت کریگا کہ سیٹ خالی ہے یا نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی مسافر تھوڑی دیر کیلئے کسی ضرورت سے باہر گیا ہو۔ بیٹھے ہوئے مسافر اس معاملہ میں کبھی دھوکا نہیں دینگے۔ بعض دفعہ مسافروں کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ گیلری میں بھر جاتے ہیں اور بلا مبالغہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے مگر کیا مجال کہ کوئی لڑائی جھگڑا ہو۔ کھانے کی گاڑی تک جانے کیلئے مجھکو اکثر مجمع میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ عورت اور مرد سب گتھم گتھا ہوتے ہیں۔ لیکن راستہ چلنے والے کی مدد بہت خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے ہیں ہمارے ہاں ان حالات میں ہاتا پائی ہو جانا ایک معمولی بات ہے۔ یہانکی ریلوں کے باتھ روم میں کاغذ کے تولے اور صابن کا بھی انتظام ہے۔ باریک کاغذ کے تولے ہوتے ہیں۔ ایک مسافر ایک ہی دفعہ اسکو استعمال کر سکتا ہے۔ صابن سیّال ہوتا ہے شیشہ کا ایک گولہ ایک طرف اس طرح لگا ہوتا ہے کہ اسکو جکر دینے سے ایک قطرہ وقتِ واحد میں ٹپکتا ہے۔ ہمارے درجہ میں چار مسافر اور تھے۔ تین عورتیں اور ایک مرد۔ یہ سب انگریز تھے اور لندن جا رہے تھے۔ میرے مقابل کی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے مجھکو یہ خیال ہوا کہ وہ امریکن ہوگی لیکن اُن کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ لندن کی رہنے والی ہے۔ مجھکو یہ معلوم کرنا تھا کہ لندن کے کس اسٹیشن پر ہم لوگ اتریں گے اور وہاں سے فارسٹ ہل جانے کا کونسا راستہ ہوگا کیونکہ مجھکو فارسٹ ہل میں ایک فیملی کے ساتھ ٹھیرنا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہم لیورپول اسٹریٹ کے اسٹیشن پر پہونچیں گے جہاں سے فارسٹ ہل بہت دور ہے۔ میم صاحبہ نے کہا کہ راست ٹیکسی میں مت جانا۔ کرایہ بہت زیادہ ہو جائے گا بلکہ اسٹیشن سے ایک ٹیکسی لیکر لندن برج اسٹیشن تک جانا۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل جاتی ہے

چھ سات منٹ کا راستہ ہے۔

اسٹیمر کا سفر

کھانے کیلئے کچھ سامان برلن سے چلتے وقت میں نے خرید لیا تھا۔ جرمنی میں یہ بات معیوب نہیں ہے۔ اکثر لوگ ریل میں کھاتے پیتے ہیں۔ نصف شب کے قریب ہم ہک آف ہالینڈ پہونچے۔ یہ مقام ملک ہالینڈ میں لب سمندر واقع ہے۔ یہاں سے انگلستان کو اسٹیمر جاتے ہیں۔ برلن سے لندن کو یہی راستہ سب سے پاس کا ہے۔ اسٹیمر میں سوار ہونیکے قبل پاسپورٹ وغیرہ کا معائنہ ہوتا ہے۔ زیادہ وقت ضائع نہیں ہوتا البتہ اسٹیمر پر مسافروں کی کثرت کیوجہ سے جگہ ملنے میں دیر ہوتی ہے۔ اسٹیمر کے منتظم کو پرسر کہتے ہیں جو ہر مسافر کا پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد کیبن کا تعین کر دیتا ہے۔ اس وقت مسافر اپنا سامان اپنے کیبن میں لیجا سکتا ہے۔ ہر کیبن میں دو برتھ ہوتے ہیں۔ ایک نیچے اور دوسرا اوپر۔ مجھکو نیچے والا برتھ ملا۔ دوسرا مسافر ایک انگریز تھا جو چین کے کسی شہر سے اپنے وطن اسکاٹ لینڈ کو جارہا تھا کسی قدر پریشان حال تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ برلن سے لندن تک جو ٹکٹ اسکے پاس تھا وہ کہیں گم ہوگیا مجھ سے مشورہ لیا کہ کیا کروں۔ یہ ٹکٹ اس نے کک کمپنی سے خریدا تھا۔ میں نے کہا بہتر ہے کہ لندن پہونچنے پر تم کک کمپنی کو مطلع کردو۔ انگلش چینل (آبنائے انگلستان) میں اکثر تموّج رہتا ہے۔ ہمارا اسٹیمر کسی قدر ہلتا رہا اسلئے خاطر خواہ نیند نہیں آئی۔ علی الصبح اترنیکی گڑبڑ ہوئی۔ اسٹیمر پر ناشتہ کا بندوبست ہے لیکن اسکی قیمت علیحدہ دینی پڑتی ہے۔ انگلستان کے جس بندرگاہ پر ہم اترے اس کا نام ہارچ ہے۔ یہاں محکمۂ کروڑگیری کا عملہ مسافروں کا اسباب دیکھتا ہے۔ زیادہ تر تمباکو کی تلاش ہوتی ہے۔ میرے پاس کوئی چیز محصول طلب نہیں تھی اسلئے آسانی کے ساتھ چھٹکارا ہوگیا۔ چین کا مسافر جو میرے کیبن میں تھا مجھ سے قبل اپنا سامان لیکر اسٹیمر سے

اتر گیا تھا۔ اسکی ایک لکڑی کیبن میں رہگئی تھی۔ میں اسکو اپنے ساتھ لیجانے کا قصد کر رہا تھا کہ اس کا قلی آیا اور کہنے لگا کہ صاحب اپنی کتاب یہاں بھول گئے ہیں۔ میں نے لکڑی دیکر کہا کہ یہ انکی کتاب ہے لیجاؤ۔ صاحب بہادر اسٹیشن پر دکھائی دیئے تو میں نے اُن سے کہا کہ تمہاری ایک لکڑی نما کتاب کیبن میں رہگئی تھی۔ وہ میں نے قلی کے ساتھ بھجوادی تھی۔ صاحب بہادر نے کسیقدر شرمندہ ہو کر کہا کہ مجھ کو یہ خیال ہوا کہ کتاب بھول گیا ہوں۔ میں نے مذاق کے طور پر کہا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے کوئی اور چیز کھودی ہے اور خیال یہ ہے کہ ٹکٹ کھو گیا۔ اس پر وہ ہنسنے لگا

کانٹینٹل اکسپرس

پلیٹ فارم پر لندن کی ریل تیار رہتی ہے اسکو کانٹینٹل اکسپرس کہتے ہیں۔ انگلستانکی ریلوں میں عام طور سے صرف دو درجے ہوا کرتے ہیں۔ درجہ اول اور درجہ سوم لیکن کانٹینٹل اکسپرس میں درجہ دوم بھی ہوتا ہے تاکہ امتیاز رہے۔ مسافروںکی کثرت تھی مشکل سے ایک جگہ ملی۔ جن لوگوں نے اسٹیمر پر ناشتہ نہیں کیا تھا وہ ریل کی ڈائننگ کار میں جمع ہوگئے اور جائے تنگ است مرداں بسیار کا مضمون پیش آیا۔ مسلسل تین مرتبہ کھانا کھلایا گیا مگر پھر بھی کئی مسافر محروم رہے اور لندن کا اسٹیشن آگیا۔

برلن سے لندن تک بذریعہ ریل ائیس گھنٹے کا راستہ ہے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ آٹھ گھنٹے لگتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ریل سے بہت زیادہ ہے۔ آجکل نو پونڈ دس شلنگ ہے۔ دس بجے کے قریب ہماری ریل لندن کے لیورپول اسٹریٹ اسٹیشن پر پہونچی۔ وہاں سے ایک ٹیکسی لیکر میں لندن برج اسٹیشن گیا یہاں سے متعدد ریلیں فارسٹ ہل جاتی ہیں۔ یہ مقام لندن کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ چھوٹی جگہ ہونیکی وجہ سے اسٹیشن پر ٹیکسی نہیں ملتی البتہ

ایک گھوڑے کی لینڈو گاڑی مجھکو ملگئی اس میں اسباب رکھکر میں اس مقام پر گیا جہاں مجھکو ٹھیرنا تھا۔

آنزاوک روڈ نمبر ۶۸ فارسٹ ہل

یہ مکان آنزاوک روڈ پر ہے اور اس کا نمبر (۶۸) ہے۔ اس کا پتہ ہم کو مسٹر اور مسز لیشائی سے معلوم ہوا تھا۔ انہوں نے لندن سے بذریعہ خط ہم کو برلن میں اطلاع دی تھی اور اس مکان میں ٹھیرنے کی سفارش کی تھی۔ اس مکان کی مالکہ ایک شریف عورت مسز ویب نامی ہے۔ یہ ایک سن رسیدہ عورت ہے۔ مسٹر ویب بھی اس مکان میں رہتے ہیں۔ انکی ایک لڑکی مس ویب ہے۔ بقیہ لوگ مسافرانہ ٹھیرے ہوئے ہیں مکان سہ منزلہ اور ہوادار ہے۔ میں نے خط کے ذریعہ مسز ویب کو اطلاع دی تھی کہ میں تمہارے مکان میں ٹھیرونگا لیکن پہونچنے کی تاریخ نہیں لکھی تھی۔ اندر کارڈ بھجوانے پر مسز ویب باہر نکل آئیں۔ ملازم کے ذریعہ اسباب اندر منگوا لیا۔ متعدد کمرے خالی تھے میں نے ایک کمرہ پسند کرلیا۔ فی ہفتہ ڈھائی اشرفی کرایہ مقرر ہوا جسمیں کھانا پینا وغیرہ شامل تھا۔ تین اور مسافر اس میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ دو مقامی انگریز تھے۔ ایک کسی مدرسہ میں ملازم تھا اور دوسرا کسی جہاز کی کمپنی میں۔ مس پالک نامی ایک لڑکی لیٹویا کے طرف کی رہنے والی بھی مقیم تھی۔ لٹویا ایک چھوٹا سا ملک روس کے علاقہ سے ملحق ہے۔ وہاں سے یہ لڑکی انگریزی پڑھنے کے واسطے یہاں آئی ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں برادر عزیز غلام یزدانی صاحب (ناظم آثار قدیمہ ملک سرکار عالی) ایک سرکاری کام کیلئے لندن آئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی یہ مکان پسند آیا۔ پہلے وہ کسی اور جگہ لندن میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ پھر اسی مکان میں منتقل ہو گئے۔

اس مکان کی پشت پر ایک باغیچہ ہے جسمیں دن کے وقت کرسیاں ڈالکر بغرض تفریح بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک کھانیکا کمرہ اور ایک ملاقاتی یہ دونوں ساز و سامان سے آراستہ ہیں۔ مکان کا موقع اچھا ہے۔ تازہ ہوا خوب آتی ہے۔ اگرچہ اصل لندن سے یہ مقام کسی قدر دور ہے لیکن حفظان صحت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لندن کے ہوٹلوں میں عام طور پر تازہ ہوا مشکل سے میسر آتی ہے۔ ماسوا اسکے کثرت ٹرافک کیوجہ سے غل و شور بھی رہتا ہے۔ ہوٹل کے جو کمرے لب سڑک ہوتے ہیں اُن میں رات کو نیند آنا مشکل ہے۔ نسبتاً کرایہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ فی الجملہ مجھ کو فارسٹ ہل میں قیام پسند آیا۔ ڈھائی اشرفی کے تقریباً چالیس روپیہ سکہ عثمانیہ ہوتے ہیں۔ اس حساب سے مکان کا کرایہ روزانہ چھ روپیہ سے کچھ کم پڑا۔ لندن کے کسی متوسط درجے کے ہوٹل میں اگر ٹھیرو تو کھانا پینا شامل کرکے کسی طرح دس روپیہ روز سے کم خرچ نہ ہوگا اور مجھکو یقین ہیکہ دس روپیہ خرچ کرنے پر بھی کھانا اس قدر افراط کے ساتھ نہیں ملے گا جیسے ہم کو اس مکان میں ملتا تھا۔ صبح کو ناشتہ میں پارچ۔ انڈے مکھن روٹی۔ جام اور پنیر وغیرہ ملتا تھا۔ ایک بجے کے قریب لنچ میں سوپ کے علاوہ گوشت اور ترکاری اور میٹھا۔ مکھن۔ روٹی۔ پنیر اور میوہ تو میز پر ہمیشہ رکھا ہی رہتا تھا۔ شام کو چائے کے وقت میز پر بہت سی چیزیں خانہ ساز ہوتی تھیں رات کا کھانا ویسا ہی ہوتا تھا جیسا دن کا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ مالک مکان ہندوستانی وضع کا کھانا پکا دیتی تھیں۔ مقررہ کرایہ میں گرم غسل بھی شریک تھا۔ اکثر ہوٹلوں میں گرم غسل کیلئے ایک شلنگ علیحدہ چارج کرتے ہیں۔ مشکل اگر تھی تو صرف اتنی کہ لندن سے یہ مقام فاصلہ پر تھا۔ موٹر بس یا ٹریم کے ذریعہ اگر جاؤ۔ پون گھنٹہ ضرور لگتا تھا۔ فارسٹ ہل سے ایک موٹر بس سیدھی پکاڈیلی سرکس کو جاتی ہے۔ ٹریم وکٹوریہ اسٹیشن تک جاتی ہے۔ صبح دس بجے سے قبل لندن تک

کرایہ پانچ پنس ہوتا ہے۔ دس بجے سے چار بجے تک دو پنس۔ اسکے بعد پھر پانچ پنس ہوجاتا ہے (ایک پنس ایک آنہ کے برابر ہوتا ہے) لنڈن کے دوسرے مقامات کو بھی یہاں سے موٹر لبیں جاتی ہیں۔ ریل کے ذریعہ اگر لنڈن برج جاؤ تو کرایہ نو پنس ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی ایک مقام پر ہر قسم کا آرام میسر آنا بہت مشکل ہے اسلئے میں نے آب وہوا کے فائدہ کو ترجیح دیکر فارسٹ ہل میں قیام مناسب پایا گھر والے بھی خلیق اور شریف لوگ ہیں۔ ملاقاتی کمرہ میں ایک پیانو بھی ہے۔ شب کے وقت اکثر رقص وسرود رہتا ہے۔ اس خاندان کے چند ملاقاتی آجایا کرتے ہیں اور بعض دفعہ رات کو ایک بجے تک گانا بجانا ہوتا رہتا ہے۔

لنڈن آبادی اور وسعت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اور ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے بادشاہ سلامت بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ علاوہ اسکے زبان کی دقت نہیں کیونکہ سب انگریزی بولتے ہیں۔ اب تک تو ہم نے اشاروں سے کام چلایا تھا مگر اب وہ مصیبت باقی نہیں رہی۔ لنڈن میں میرا قیام کم وبیش دو مہینے رہا۔ یہاں کی سیر کچھ تو بطور خود کی اور کچھ دوستوں کے ساتھ۔ تمام دن سیر کرنے میں گذرتا تھا۔ مولوی غلام یزدانی صاحب سے لنڈن کے حالات معلوم کرنے میں مجھکو بہت بڑی امداد ملی۔ صاحب موصوف اس سے قبل دو دفعہ یورپ آچکے تھے۔

لنڈن اس قدر وسیع شہر ہے کہ اس کو تفصیل سے دیکھنا اور پورے حالات سے واقف ہونا کسی سیاح کیلئے تقریبًا ناممکن ہے۔ سینکڑوں چیزیں نظر کے سامنے آتی ہیں اور سینکڑوں نظر سے مخفی رہتی ہیں۔ آبادی کا ایک وسیع سمندر ہے جس میں انواع واقسام کی دلچسپیاں اور قابل دید چیزیں موجود ہیں

ٹیمز دریائے ٹیمز کے دونوں جانب یہ شہر آباد ہے یہ دریا اپنے

منبع سے دو سو میل بہکر بحر شمالی میں گرتا ہے۔ نقشہ دیکھنے سے واضح ہوگا کہ شہر میں اس دریا کا گذر بہت ہی پیچدار واقع ہوا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہیکہ کوئی سانپ بل کھاتا ہوا چلا جارہا ہے۔ لندن کی روز افزوں تجارت اور رونق کا دارومدار بہت کچھ اسی دریا پر ہے ٹیمز کی برکت سے یہ شہر آج تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے کثرت سے جہاز اور اسٹیمر اس میں چلتے رہتے ہیں۔ لندن برج کے قریب اس کا پاٹ (۲۳۵) گز ہے لیکن آگے بڑھکر چوڑا ہوتا گیا ہے۔

لندن کے پل

تقریبًا چوبیس پل اس دریا پر صرف لندن میں ہیں جنکے منجملہ چند کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ٹاور برج

انتہائی مشرقی حصہ میں ٹاور آف لندن کے متصل ٹاور برج ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے یہ پل خاص طور پر دیکھنے کے لایق ہے۔ اسکے دونوں جانب گوتھک وضع کے دو بُرج بنے ہوئے ہیں۔ اوپر کے حصہ میں دریا کی سطح سے (۱۴۲) فیٹ کی بلندی پر ایک راستہ پیدل چلنے والوں کے واسطے بنایا گیا ہے مگر کسی وجہ سے یہ اکثر بند رہتا ہے۔ عام راستہ ایک لوہے کی کمان پر سے ہے جو (۲۰۰) فیٹ طویل ہے۔ اسمیں خوبی یہ ہے کہ ضرورت کے وقت بیچ میں سے اسکے دو ٹکڑے ہوکر الگ اُٹھ آتے ہیں۔ جب کبھی کوئی جہاز ایسا آتا ہے جو اونچائی کی وجہ سے پل کے نیچے سے نہیں گذر سکتا تو مشین کی مدد سے اس راستہ کے دونوں ٹکڑے اونچے کردیئے جاتے ہیں ایسے موقع پر پہلے ایک گھنٹی بجتی ہے تاکہ عوام کو اطلاع ہوجائے کہ راستہ بند ہونیوالا ہے۔ بُرجوں کے دونوں جانب دو سو ستر (۲۷۰) فیٹ لمبی ایک کمان ہے یہ عظیم الشان پل (۱۵۰۰۰۰۰) پندرہ لاکھ پونڈ کی لاگت سے سنہ ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوا۔ اندازہ یہ کیا گیا ہے کہ دن بھر میں اس پل پر سے

پانچ ہزار کے قریب گاڑیاں اور بیس ہزار سے زیادہ پیدل آدمی گذرتے ہیں۔
اسی پل کے متصل جہازوں کی گودی اور گودام وغیرہ ہیں۔

لنڈن برج

اس پل کے بعد جانب مغرب سب سے پہلے لنڈن برج واقع ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک یہی ایک پل لنڈن میں ٹیمز پر سے عبور و مرور کا ذریعہ تھا۔ وہ قدیم پل اب باقی نہیں رہا لیکن اس جگہ موجودہ پل ۱۸۳۱ء میں بنایا گیا۔ یہ سنگین پل (۹۲۸) فیٹ طویل اور (۶۵) فیٹ عریض ہے۔

اسکے دونوں جانب پندرہ فیٹ چوڑے راستے پیدل چلنے والوں کے واسطے بنے ہوئے ہیں۔ اسکی پانچ کمانوں میں سے درمیانی کمان کی چوڑائی (۱۵۲) ایک سو باون فیٹ ہے۔ مجھکو اکثر اس پل پر سے جانیکا اتفاق ہوا ہے کیونکہ فارسٹ ہل سے اگر ریل کے ذریعہ لنڈن جاؤ تو لنڈن برج اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے جو اس پل سے قریب ہے۔ موٹر بس کی چھت پر سے یہاں منظر نہایت دلکش ہوتا ہے۔ ٹرافک کا یہ حال ہے کہ ایک لاکھ سے اوپر راہ رو دن بھر میں اس پل پر سے گذرتے ہیں۔ سواری گاڑیوں کا اندازہ بیس ہزار سے اوپر کیا جاتا ہے

بلیک فرائرس برج

تیسرا لائق تذکرہ پل بلیک فرائرس برج (BLACK FRIAR'S BRIDGE) ہے جو شہر لنڈن کو جنوبی حصہ سے ملا دیتا ہے۔

یہ لنڈن کا سب سے چوڑا پل ہے مگر یورپ معبر میں سب سے بہتر جو پل سمجھا جاتا ہے وہ واٹرلو برج ہے۔ شمالی جانب وکٹوریہ امبیانکمنٹ (VICTORIA EMBANKMENT) کے درمیانی حصہ سے یہ پل شروع ہوتا ہے۔ اسکی لنبائی (۱۲۸۰) فیٹ ہے۔ دس لاکھ پونڈ سے اوپر اسکی لاگت شمار کیجاتی ہے

ویسٹ منسٹر برج

فارسٹ ہل سے موٹر بس کے ذریعہ لنڈن جاتے وقت اکثر میرا گذر ویسٹ منسٹر پر سے ہوا ہے اس کا شمار بھی یورپ کے بہترین اور وسیع پلوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ پل (۱۱۶۰) فیٹ لنبا اور (۸۵) فیٹ چوڑا ہے۔ پل پر سے شہر کی جانب کا منظر بہت دلفریب ہے۔ عین پل کے کنارہ پر پارلیمنٹ کے ایوان اور اچھے اچھے ہوٹل ہیں۔ ایک اور پل جس پر سے گذرنے کا مجھکو بہت موقع ملا وکس ہال برج ہے فارسٹ ہل سے جو ٹرام وکٹوریہ کو جاتی ہے وہ اس پر سے گذرتی ہے۔

سٹی آف لنڈن

لنڈن کی وسعت کا اندازہ کرنے کیلئے اسکو تین حصوں میں منقسم کرنا چاہیئے۔ سب سے چھوٹا حصہ سٹی یعنے شہر کہلاتا ہے۔ جیسے حیدرآباد کے دو حصہ ہیں ایک بیرون بلدہ اور دوسرا اندرون بلدہ۔ شہر لنڈن کو اندرون بلدہ سمجھو۔ یہی اصلی اور قدیم شہر ہے۔ کسی زمانہ میں یہ حصہ ایک فصیل سے محصور تھا۔ جس کے آثار دو ایک جگہ معمولی سے باقی ہیں۔ رفتہ رفتہ آبادی مغرب کی طرف بڑہتی چلی گئی۔ شہر لنڈن کا موجودہ رقبہ (۶۷۵) ایکڑ سے زیادہ نہیں ہے یا ایک میل مربع سمجھو۔ دریائے ٹیمز کے شمالی کنارہ پر یہ آبادی ہے۔ مشرق میں اسکی سرحد ٹاور آف لنڈن تک اور مغرب میں ٹمپل بار تک ہے۔ چنانچہ جب کبھی بادشاہ سلامت جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو رواج قدیم کے مطابق لارڈ میئر ٹمپل بار تک پیشوائی کیلئے آتے ہیں یہاں جلوس رک جاتا ہے اور بادشاہ کے سامنے تلوار پیش کیجاتی ہے۔ شہر کا رقبہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن تجارت اور کاروبار کے لحاظ سے یہی ایک میل مربع حصہ آج دنیا میں قوت رکھتا ہے۔ انگلستان کا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا بینک اسی محدود رقبہ میں ہے۔

سینکڑوں تجارتی کوٹھیاں جن میں کروڑوں روپیہ کا لین دین ہوتا رہتا ہے یہیں واقع ہیں۔ البتہ رہنے کے مکانات اس حصہ میں نہیں ہیں۔ چھ بجے کے بعد کاروبار بند ہونے پر شہر میں سناٹا ہو جاتا ہے چنانچہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ رات کے وقت اس رقبہ کی آبادی (۱۵۰۰۰) پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن دن کے وقت ساڑھے تین لاکھ سے زاید مرد اور عورت شہر کے حدود میں کام کرتے ہیں اور آمد و رفت رکھنے والوں کی تعداد روزانہ دس لاکھ سے اوپر ہے۔ ان اعداد سے یہ واضح ہوگا کہ اس چھوٹے سے شہر میں کاروبار کی اہمیت کس قدر ہے۔

شہر کے حدود میں صفائی۔ پولس اور عدالت وغیرہ کا انتظام لندن کے دوسرے حصے سے بالکل علیحدہ ہے۔ لارڈ میئر حاکم اعلیٰ ہوتا ہے۔ اسکے مددگار دو افسر ہوتے ہیں جن کو شریف کہتے ہیں۔

شہر کا انتظام

لارڈ میئر کا انتخاب سالانہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ یہی افسر عدالت کا بھی حاکم اعلیٰ ہوا کرتا ہے۔ اسلئے ہر نومبر کی نویں تاریخ کو قدیم رسم کے مطابق بڑی شان و شوکت کیساتھ جلوس کے ہمراہ یہ ملکی اعلیٰ ترین عدالت میں چیف جسٹس کے سلام کو جاتا ہے۔ جملہ اراکین عدالت کے سامنے یہ پیش ہوتا ہے اور ان کو رات کے وقت کھانے پر دعوت دیتا ہے۔ سنتے ہیں کہ ان مراسم میں ساٹھ ہزار روپیہ کے قریب اخراجات لاحق ہوتے ہیں جس کا بار لارڈ میئر اور اسکے مددگاروں کو اٹھانا پڑتا ہے لارڈ میئر کی تنخواہ سالانہ دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ اس خدمت کے ساتھ اخراجات کثیر وابستہ ہیں۔ سنا ہے کہ ختم ملازمت پر لارڈ صاحب مفلس ہو جایا کرتے ہیں۔ شہر کے حدود میں پولس کی تعداد گیارہ سو آدمیوں کے قریب ہے پورا انتظام لارڈ میئر

اور ایک کونسل کے ہاتھ میں ہے۔ شہر کی آمدنی بھی ان ہی کے اختیار سے شہر ہی کے اغراض کیلئے خرچ ہوتی ہے۔

ہجوم کی سیر

اس حدود رقبہ میں دیکھنے کے لائق بہت کچھ ہے۔ اگر یہاں کے ہجوم کو دیکھنا ہے تو ایک بجے دن کے جاؤ۔ وہ وقت لنچ کا ہوا کرتا ہے۔ جب ملازمین کھانے کے واسطے رسٹوراں میں آتے ہیں۔ اگر کچھ دیر پہلے نہ جاؤ تو رسٹوراں میں جگہ ملنی دشوار ہو جاتی ہے۔ دوسرا وقت ہجوم کو دیکھنے کا شام کو چھ بجے ہے۔ اس وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو کر سب باہر نکلتے ہیں۔ موٹر بسیں اس قدر لدی ہوئی جاتی ہیں کہ اکثر انتظار میں بہت دیر تک کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ یہاں کے ہجوم کو دیکھکر یہ اندازہ کرنے کا موقع ملیگا کہ کس قدر کثرت سے نوجوان لڑکیاں دفاتر اور دکانوں میں ملازم ہیں۔ جب زمانہ میں شہر فصیل سے محصور تھا اس میں متعدد دروازے تھے جو اب محلوں کے نام سے شہر میں مثلاً مورگیٹ۔ نیوگیٹ اور لڈگیٹ وغیرہ۔

انگلستان کا بینک

شہر کے تقریباً وسط میں دنیا کا مشہور بینک۔ بینک آف انگلینڈ ہے۔ اس مقام پر متعدد بڑی بڑی سڑکیں ملتی ہیں۔ ٹرافک کی کثرت کا یہ حال ہے کہ دن بھر میں چھ سو زمین کے نیچے چلنے والی ریلیں اس نواح میں آتی جاتی ہیں۔ زمین کے اوپر موٹروں کی کثرت راستہ چلنے والوں کیلئے باعث حیرت ہے۔ لندن کی پولیس قابل تعریف ہے کہ ایسے بازاروں میں انتظام کی خوبی کیوجہ سے حادثات بہت کم ہوتے ہیں۔ بینک کی یک منزلہ عمارت چار ایکڑ زمین پر واقع ہے۔ اس تمام عمارت میں کوئی دریچہ نہیں ہے۔ اندرونی حصہ میں صحن بنا دیئے ہیں جہاں سے روشنی

آتی رہتی ہے۔ یہ ترکیب حفاظت بینک کی خاطر کیگئی ہے۔ شب کے وقت پہرہ کا انتظام بہت سخت ہے۔

رائل اکسچینج ایچینج بینک کے متصل جنوب مشرقی گوشہ میں رائل اکسچینج (ROYAL EXCHANGE.) کی خوشنما عمارت ہے۔ موجودہ عمارت سے قبل اس جگہ دو دفعہ عمارتیں بنیں لیکن اِن میں آگ لگ گئی۔ حالیہ عمارت ۱۸۴۴ء میں ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں تیار ہوئی یہ انگلستان کی کاروباری دنیا کا مرکز ہے۔ بینک کے جنوب مغربی گوشہ میں مینشن ہاوز ہے جو لارڈ میئر کے رہنے کیلئے مخصوص ہے۔

گلڈہال بینک کے شمال میں کچھ فاصلہ پر وہ تاریخی مکان ہے۔ جس کو گلڈہال کہتے ہیں۔ جس روز لارڈ میئر کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس رات مکان میں بڑی دھوم کی ضیافت ہوتی ہے۔ اسی مکان میں فریڈم آف دی سٹی (FREEDOM OF THE CITY) کا اعزاز ملکی اور غیر ملکی اکابر کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لارڈ میئر اور اس کے مددگاروں کا انتخاب بھی اسی مکان میں ہوتا ہے۔ مکان کے اندر بہت سی چیزیں دیکھنے کے لایق ہیں۔ ایک کتب خانہ اور میوزیم بھی اس میں ہے۔

لندن کا بڑا گرجا ایک اور مشہور عمارت شہر میں سینٹ پال (ST. PAUL CATHEDRAL) ہے

یہ ایک زبردست گرجا ہے جسکی تعمیر میں پینتیس (۳۵) سال کا عرصہ لگا۔ ۱۷۱۰ء میں یہ مکمل ہوا۔ اس سے قبل جو عمارت تھی وہ آتش زنی سے زائل ہوگئی۔ گرجا کا اندرونی حصہ بہت آراستہ ہے۔ بعض اکابر قوم کی قبریں بھی اس میں ہیں مثلاً نلسن اور ڈیوک آف ویلنگٹن یہیں مدفون ہیں۔ رہبر کے ذریعہ تمام عمارت کی

سیر ہوسکتی ہے۔ گرجا کے میناروں سے لندن کا منظر دیکھنے کے لائق ہے۔

عدالت فوجداری

شہر کی اعلیٰ عدالت جس مکان میں ہے اسکو اولڈ بیلی کہتے ہیں۔ یہ عدالت فوجداری ہے۔ میں دو ایک دفعہ اجلاس کے کمرے میں جا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اجلاس پر زیادہ ہجوم نہیں ہونے دیتے کیونکہ دو جگہ پولس کا پہرہ تھا مجھ سے دریافت کیا گیا کہ کس کام سے اندر جانا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ ہندوستان سے سیر کی غرض سے آیا ہوں اور خود بھی مجسٹریٹ ہوں۔ یہاں کی عدالت دیکھنا چاہتا ہوں۔ پولس افسر نے ایک کانسٹبل کو میرے ساتھ کر دیا کہ کمرۂ عدالت پر جو پہرہ ہے اس سے کہدو کہ یہ مجسٹریٹ ہیں۔ ان کو اندر جانے دو اس طرح میں کمرۂ عدالت میں پہونچا۔ مقدمہ پیش تھا۔ ایک جانب میں بھی بیٹھ گیا مگر فاصلہ ہونیکی وجہ سے کچھ سنائی نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کے اندر متعدد بازار ہیں جنکے منجملہ کینن اسٹریٹ۔ پرنس اسٹریٹ۔ تھریڈ نیڈل اسٹریٹ کارن ہل۔ چیپ سائڈ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

لندن بزرگ

یہ تو شہر لندن ہوا۔ اب لندن کی کاونٹی یا ضلع کا حال سنئے۔ انتظامات اندرونی کے لحاظ سے شہر لندن کاونٹی کے ماتحت نہیں ہے۔ کاونٹی کا رقبہ ایک سو سترہ (۱۱۷) مربع میل کے قریب ہے جسکو اٹھائیس حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے ہر حصہ کو برو کہتے ہیں لندن کی کاونٹی کے علاقہ میں (۴۵۰۰۰۰۰) پینتالیس لاکھ سے زاید آدمی بستے ہیں لیکن ایک لندن اور ہے جس کو (GREATER LONDON) یا لندن عظیم (بزرگ) کہتے ہیں۔ اس میں لندن کی کاونٹی کے علاوہ اطراف کے اضلاع کا بھی کچھ حصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ حدود اس کے یہ ہیں کہ چیرنگ کراس

محلہ کو قلب لندن قرار دیکر اسکے اطراف پندرہ پندرہ میل تک کے فاصلہ کو شامل کر لیا ہے۔ اس لندن بزرگ کا رقبہ (۷۰۰) سات سو مربع میل کے قریب ہے اور مردم شماری ستر لاکھ (۷۰۰۰۰۰۰) سے زاید ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس رقبہ کے اندر محلوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں ہے جنکو اگر ایک قطار میں کر دیا جائے تو اسکی لنبائی سات ہزار میل ہوگی۔ یا یوں سمجھو کہ ہندوستان سے لیکر انگلستان یا اور آگے تک سلسلہ قائم رہے گا۔

گوشہ مغربی

شہر لندن کے حدود جانب مغربی ٹمپل بار پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں سے ایک دوسرا شہر شروع ہوتا ہے جو ضلع لندن کے علاقہ میں ہے۔ اسکو سٹی آف ویسٹمنسٹر (CITY OF WESTMINISTER) کہتے ہیں۔ مشرق میں ٹمپل بار اور مغرب میں کینسنگٹن۔ شمال میں اکسفورڈ اسٹریٹ اور جنوب میں دریائے ٹیمز ان حدود کے اندر لندن کا یہ بہترین حصہ ہے جسکو ویسٹ اینڈ (یعنی گوشہ مغربی) کہتے ہیں۔ عالیشان عمارتیں۔ فیشن ایبل دکانیں۔ رسٹوران اور ہوٹل وغیرہ اسی حصہ میں ہیں۔

وکٹوریہ امبنکمنٹ

ٹمپل بار کے قریب بلیک فرائرز برج ہے۔ یہاں سے جانب مغرب ہلالی وضع کی ایک مشہور سڑک ملیگی جسکو وکٹوریہ امینکمنٹ کہتے ہیں۔ یہ خوبصورت سڑک دریا کے کنارہ ڈیڑھ میل لنبی چلی گئی ہے۔ دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں۔ تفریح کیلئے اکثر لوگ موٹر میں اسطرف آتے ہیں۔ یہاں بعض سرکاری دفاتر اور ایک باغ بھی ہے۔ یہ سڑک ویسٹ منسٹر برج پر ختم ہو جاتی ہے۔

ایوان پارلیمنٹ

دریا کے کنارے ویسٹمنسٹر برج پر عالیشان عمارت پارلیمنٹ کی ہے خاص مقررہ دنوں میں مقررہ اوقات کے اندر اس محل کی سیر ہو سکتی ہے۔ اندر جاکر ضرور دیکھنا چاہئے۔ ساری عمارت آٹھ ایکڑ زمین پر تیس لاکھ پونڈ کی لاگت سے تیار ہوئی ہے۔ ہاؤز آف لارڈ کا کمرہ بہت آراستہ اور لائق دید ہے (۹۰) نوے فیٹ لمبا اور (۴۵) پینتالیس فیٹ چوڑا ہے۔ صدر میں بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کا تخت ہے۔ جس پر ایک سنہری شاندار چھتری مکان کی عظمت کو دوبالا کر رہی ہے۔ تخت کے دونوں جانب ممبران عالی مرتبت کے بیٹھنے کے لئے سرخ چمڑے کے صوفے ترتیب وار بچھے ہوئے ہیں۔ سامنے کی بنچیں خاندان شاہی کے افراد کیلئے محفوظ ہیں۔ ہاؤز آف کامنس کا کمرہ آرائش اور زینت میں اس کمرے سے بہت پیچھے ہے۔

بگ بن

عمارت کے ایک گوشہ پر زبردست گھنٹہ گھر ہے جسکو بگ بن (BIG BEN.) کہتے ہیں۔ آجکل اس نام کا ایک ٹائم پیس بھی بازاروں میں بکتا ہے۔ یہ گھنٹہ وقت کی صحت کے لحاظ سے دنیا میں بہترین شمار کیا جاتا ہے۔ گھنٹہ کا مینار چالیس فیٹ مربع اور تین سو سولہ فیٹ بلند ہے۔ گھنٹہ کے حلقہ کا قطر ہر جانب ساڑھے بائیس فیٹ ہے۔ بڑی سوئی کی لنبان چودہ فیٹ اور چھوٹی سوئی کی نو فیٹ ہے لیکن جنوب مغربی

وکٹوریہ ٹاور

گوشہ میں اس سے بھی بڑا ایک گھنٹہ ہے جسکو گریٹ وکٹوریہ ٹاور کہتے ہیں۔ یہ تین سو چھتیس فیٹ بلند اور پچھتر فیٹ مربع ہے اس گھنٹہ کے نیچے جو کمان ہے اس میں سے بادشاہ سلامت پارلیمنٹ میں داخل ہوا کرتے ہیں۔

ویسٹ منسٹر اے بی

ایوان پارلیمنٹ کے قریب ہی لندن کی مشہور اور قدیم عمارت ویسٹ منسٹر اے بی ہے

ایک قلیل فیس دیکر رہبر کے ذریعہ اس مکان کی سیر ہوا کرتی ہے۔ تنہا آدمی کو سیر نہیں کراتے بلکہ کچھ لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ انگلستان کے بادشاہوں کی تاج پوشی اسی عمارت میں ہوتی ہے۔ اور یہیں دفن بھی کیئے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے علاوہ بعض مشہور افراد قوم بھی یہاں دفن ہیں۔ اس تاریخی اور قدیم عمارت میں دیکھنے کے لائق متعدد چیزیں ہیں۔ وقت واحد میں پوری سیر ممکن نہیں۔ چنانچہ میں تین دفعہ یہاں آیا۔ سب سے اچھا حصہ اس عمارت کا ایک چیپل (عبادت گاہ) ہے جس کو شاہ ہنری ہفتم نے بنوایا تھا۔ مگر اسکی تکمیل شاہ موصوف کے انتقال کے دس سال بعد ہوئی۔ یہ عبادت گاہ نہایت پر تکلف اور آراستہ ہے۔ اس بادشاہ اور اسکی ملکہ کی قبریں بھی اسی حصہ عمارت میں ہیں۔ ایک کمرہ بیت المقدس کے نام پر ہے۔ شاہ ایڈورڈ سوم کے زمانہ میں یہ تیار ہوا۔ اسکے متعلق ایک عجیب روایت بیان کیجاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ ہنری چہارم نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اسکی موت بیت المقدس میں واقع ہوگی۔ اگرچہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہوا۔ لیکن بیت المقدس کو روانگی کے روز اسی کمرہ میں اس کا انتقال ہوا۔ ایک اور دلچسپ کمرہ وہ ہے جس میں موم کی مورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک رسم یہ تھی کہ جنازہ کے ساتھ مرنیوالے کی ہمشکل موم کی مورت بناکر لیجایا کرتے تھے اس عمارت میں جو لوگ دفن ہیں ان میں سے بعض کی مورتیں اس کمرہ میں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ ایک مورت ڈچس آف بکنگھم کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جارج دوم کی تاج پوشی کے وقت جو لباس اس خاتون نے پہنا تھا وہی اس مورت کو پہنایا گیا ہے۔

بکنگھیم پیلیس

کچھ دور آگے جاؤ تو مال کی کشادہ سڑک پر سینٹ جیمس پیلس دکھائی دیگا۔ یہ اگرچہ شاہی محل ہے لیکن اب اس میں بادشاہ نہیں رہتے۔ شاہ ہنری ہشتم نے یہ محل بنوایا تھا۔ اسی نواح میں کسی قدر جنوب و مغرب کے طرف بکنگھیم پیلیس ہے اس میں بادشاہ سلامت رہتے ہیں۔ اصل میں یہ مکان ڈیوک آف بکنگھم نے بنوایا تھا۔ جن سے بادشاہ جارج سوم نے خرید لیا۔ بعد میں شاہی ضروریات کے لحاظ سے اس میں بہت کچھ ترمیم کی گئی۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم اس محل میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ جس زمانہ میں بادشاہ اس میں ہوتے ہیں صبح ساڑھے دس بجے پہرہ کا تبدیل ہونا ایک لایق دید تماشا ہے۔ محل کے سامنے جو سڑک ایڈمرلٹی آرچ تک جاتی ہے۔ اس کو مال روڈ کہتے ہیں۔ یہ (۶۵) فٹ چوڑی ہے اور دونوں جانب (۳۵) فٹ وسیع روشیں چھوڑکر سایہ دار درخت لگائے ہیں۔ پوری سڑک لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔

ملکہ وکٹوریہ کی یادگار

محل کے روبرو ملکہ وکٹوریہ کی خوبصورت یادگار ہے جس کا افتتاح بادشاہ سلامت نے ۱۶؍ مئی ۱۹۱۱ء کو کیا تھا۔ خالص سنگ مرمر کا مجسمہ ایک وسیع چبوترہ پر قایم کیا گیا ہے۔ اطراف میں انصاف اور استقلال وغیرہ کی خیالی مورتیں بنائی گئیں ہیں۔ یہ شاندار یادگار (۸۲) فٹ بلند ہے۔ جس مقام پر مال کی سڑک وائٹ ہال کی سڑک سے ملتی ہے۔ وہاں ایک عالیشان کمان ہے۔ جس کو ایڈمرلٹی آرچ کہتے ہیں بکنگھیم پیلس سے جو شاہی جلوس وائٹ ہال کو جاتا ہے وہ اس کمان کے نیچے سے گذرتا ہے وائٹ ہال کی سڑک پر متعدد مشہور دفاتر مثلاً انڈیا آفس دفتر خارجہ اور ہوم آفس وغیرہ ہیں

سینوٹاف

جنگ عظیم کی مشہور یادگار سینوٹاف جسے غیر معلوم سپاہی کی۔

قبر بھی کہتے ہیں اسی محلہ میں ہے ۔ ہر سال ۱۱ نومبر کو یہاں ایک کثیر مجمع صلح کی یادگار میں ہوتا ہے ۔ اس میں بادشاہ سلامت بھی بہ نفس نفیس شریک ہوتے ہیں دومنٹ کے لئے سب لوگ ٹوپی اتار لیتے ہیں ۔ اس ملک میں یہ تعظیم کی نشانی ہے لیکن ہمارے ہاں طریقہ برعکس ہے ۔ چڑھاوے کے پھولوں کا انبار یہاں ہمیشہ رہتا ہی

ٹریفلگر اسکوئر

وائٹ ہال سے اگر سیدھے جانب شمال چلے جاؤ تو ایک وسیع چوراہے پر نکلو گے جسے ٹرافلگر اسکوائر کہتے ہیں ۔ لندن جیسی بند آبادی میں اس قدر وسیع اور کھلا ہوا چوراہا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ ۱۸۰۵ء میں نلسن نے جو فتح ٹرافلگر کی بحری جنگ میں فرانسیسوں کے مقابلہ میں حاصل کی تھی اس کی یادگار میں اس چوراہے کا نام رکھا گیا ہے ۔ چنانچہ ایک جانب (۱۴۵) فٹ بلند مینار پر اس بہادر جنگجو کا مجسمہ (۱۶) فٹ طویل قائم ہے مینار کے نیچے کی طرف چاروں کونوں پر زبردست شیر ببر بنے ہوئے ہیں ۔ مقابل میں ایک خوبصورت فوارہ ہے ۔ اطراف میں بعض دوسرے مشہور جنرلوں کے مجسمے ہیں ۔

نیشنل گیلری

چوراہے کے شمالی رخ پر نیشنل گیلری کی عظیم الشان عمارت ہے ۔ افسوس ہے کہ اس کی کرسی زیادہ اونچی نہیں ہے ورنہ عمارت کی شان کچھ اور ہوتی ۔ اس میں دنیا کی بہترین قلمی تصاویر جمع ہیں ۔ اس کی سیر ضرور کرنی چاہیئے ۔ اس عمارت کے ورانڈہ میں کھڑے ہوکر دیکھو تو چوراہے کا منظر بہت اچھا معلوم ہوگا ۔

شاہ چارلس اول کا مجسمہ

ٹرافلگر اسکوئر کے قریب ہی میں ایک سڑک پر شاہ چارلس اول کا ایک پتلا گھوڑے پر سوار دکھائی دیگا اس کے متعلق ایک روایت بیان کیجاتی ہے کہتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں یہ جب تیار ہوا تو ملک میں

لڑائی یعنی سیول وار شروع ہوگئی۔ پارلیمنٹ نے جو اس پتلے کی مخالف تھی اس کو ایک برتن جھالنے والے کے ہاتھ فروخت کردیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر بادشاہ قید کرلیا گیا اور اس پر مقدمہ قایم ہوا۔ بالآخر وہ قتل کیا گیا۔ آخری شب زندگی کی اس نے سینٹ جمیس پیلیس میں گزاری ۔ وہاں سے اپنی قتل گاہ پر وہ نہایت اطمینان کے ساتھ پیدل آیا جس مردانہ وار طریقہ پر وہ اپنی قسمت سے دوچار ہوا اس کا گہرا اثر عوام پر اس درجہ ہوا کہ لوگ اس کی چیزوں کو یادگار اور تبرک کی طرح رکھنے لگے قلعی گر کو اس موقع پر خوب سوجھی۔ پتلے کو اس نے محفوظ کرکے رکھدیا لیکن جو تیلی دستے اس میں لگے ہوئے تھے ان کو توڑ کر چاقو اور قینچی وغیرہ بناڈالے اور مشہور یہ کیا کہ اصل صورت سے یہ اشیار بنائی گئی ہیں۔ لوگوں نے خوب خریدا مگر کچھ عرصہ بعد اس کے باغ میں سے پتلا محفوظ حالت میں برآمد ہوا جو اب تک قایم ہے۔ سنتے ہیں کہ صنعت کے لحاظ سے لندن میں اس سے بہتر کوئی مجسمہ نہیں ہے۔

چورا ہے کے مغرب کی طرف مشہور سڑک پال مال ہے۔ شاہ چارلس دوم کو ایک کھیل کا بہت شوق تھا جسے پیل میل کہتے ہیں اسی نواح میں یہ کھیل ہوتا تھا۔ اسی لئے سڑک کا نام اس پر رکھدیا گیا۔ اس محلہ میں لندن کے بڑے بڑے کلب واقع ہیں۔ یہاں سے دو راستے شمال کی جانب سیدھے پکاڈلی سرکس کو جاتے ہیں ایک کا نام (ہے مارکٹ) اور دوسرے کو واٹرلو پلیس کہتے ہیں۔ ہے مارکٹ میں امریکن اکسپریس کا دفتر ہے جس کی معرفت ہماری ڈاک آتی تھی۔ اکثر یہاں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ واٹرلو پلیس میں بعض مشہور اکابر قوم کے خوشنما مجسمے ہیں کسی زمانہ میں یہاں کارلٹن ہاوز تھا جس میں جارج چہارم ولی عہدی کے زمانہ میں رہا کرتے تھے۔ یہ سڑک آگے چلکر لویر ریجنٹ اسٹریٹ کہلاتی ہے اور پکاڈلی سرکس پر نکلتی ہے۔ جارج چہارم نائب بادشاہ ہونے کی وجہ سے پرنس ریجنٹ کہلاتے تھے ان ہی

نام پر یہ سڑک ریجنٹ اسٹریٹ کہلانے لگی۔

پکاڈلی سرکس

پیکڈلی سرکس بھی لندن کا مشہور اور پر رونق چوراہا ہے درمیان میں ایک خوشنما فوارہ ساتویں ارل آف شیفٹسبری کی یادگار میں بنا ہوا ہے یہ نامی گرامی شخص انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیدا ہوا اور پچاسی عیسوی میں فوت ہوا کسنی میں اس کے ماں باپ مرگئے ایک نرس یعنی دایہ کی نگرانی میں اس نے پرورش پائی۔ غربا اور مصیبت زدہ لوگوں کی فلاح و بہبودی کا اس کو بہت خیال تھا بلکہ اس نے اپنی زندگی ان ہی کے کاموں میں وقف کردی تھی۔ فخریہ طور پر کہا کرتا تھا کہ اپنی دایہ کی بدولت میں انسان بنا ہوں۔ اسی چوراہے پر دو مشہور تھیٹر لندن پویلین اور کرائی ٹیرین واقع ہیں۔ رات کے وقت اس نواح میں حسن فروش عورتوں کی گرم بازاری رہتی ہے پولس کی نظروں سے اپنے کو بچاتی ہوئی۔ راستہ چلنے والوں کو سو سو گھاتوں سے اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ عیسائی پادریوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ انگلستان میں پیشہ ور عورتیں نہیں ہیں بلکہ مشرقی ممالک اس بدکاری میں مبتلا ہیں۔ کاش کہ کوئی ان پادریوں کو رات کے وقت اس نواح میں لیجائے اور یہاں کا تماشا دکھائے۔ یہ مانا کہ قانوناً زناکاری بطور پیشہ اس ملک میں ممنوع ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون اس بارے میں بیکار ہے عملی طور پر سب کچھ ہوتا ہے۔ میں آگے چل کر مناسب موقع پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

پکاڈلی سرکس سے چار بڑی سڑکیں نکلتی ہیں۔ دو سڑکیں مشرق کی طرف جاتی ہیں ایک کو شیفٹسبری ایونیو کہتے ہیں دوسری سڑک لیسٹر اسکوائر کو جاتی ہے اس کو چیرنگ کراس روڈ بھی کہتے ہیں۔ مغرب کی طرف پکاڈلی اسٹریٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ ہیں۔ ریجنٹ اسٹریٹ شمال مغرب کو جاتی ہے اور پکاڈلی جنوب و مغرب کو۔ کوئی شبہ

نہیں کہ یہ دونوں بازار لندن کے بہترین بازاروں میں سے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے سجی ہوئی دکانیں اور اونچی عمارتیں اس نواح میں بہت ہیں اور یہی محلہ لندن کے فیشن کا مرکز ہے۔ پکاڈلی کی سڑک تقریباً ایک میل تک جانے کے بعد ہائیڈ پارک کارنر پر نکلتی ہے جو ایک بارونق چوراہا ہے۔ پکاڈلی کے شروع میں لندن کا مشہور پکاڈلی ہوٹل ہے۔ اس کا ایک رخ ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف بھی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک لایق تذکرہ رسٹوران لائنس پاپیولر کیفے ہے۔ جس میں دو ہزار آدمی وقت واحد میں کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس کمپنی کے متعدد رسٹوران لندن میں ہیں۔ مناسب موقع پر ان کا تذکرہ آئیگا۔

پکاڈلی کے دونوں جانب متعدد گلیاں ہیں جن کا ذکر خالی از طوالت نہیں مگر ایک گلی کے نکڑ پر کک کمپنی کا عالیشان صدر دفتر ہے۔ اگر بغیر کسی کام کے بھی اندر چلے جاؤ تو وقت ضایع نہ ہوگا۔ کئی منزل کی عمارت ہے۔ برقی جھولوں کے ذریعہ آمد و رفت ہوتی ہے۔ پیر کے دن ہندوستان کی ڈاک لینے کے لئے کثرت سے ہندوستانی طالب علم اور سیاح یہاں نظر آتے ہیں۔ اس کمپنی کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ کرنا اگر مقصود ہے تو ضرور ایک دفعہ اس دفتر کی سیر کرنا چاہیئے۔ اس کی متعدد شاخیں لندن میں ہیں بلکہ دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کا دفتر یا کوئی ایجنٹ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تجارت کو فروغ دینے کے لئے سلیقہ کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کمپنی کا بانی ایک شخص تھامس کک تھا۔ اس نے ۱۸۴۱ء میں ایک نیا خیال پیدا کیا جس میں اس کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ریل کے ذریعہ ایک چھوٹا سا قافلہ سیر کے واسطے اپنے زیر انتظام لے گیا۔ اگرچہ مسافت زیادہ نہیں تھی مگر اس خیال کو جب ترقی ہوئی تو رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان کاروبار کی صورت اس نے اختیار کرلی۔ چنانچہ سیر و سیاحت کے متعلق اس سے بڑی کوئی کمپنی

دنیا میں نہیں ہے۔ پانچ ہزار کے قریب تنخواہ یاب ملازم اس کمپنی میں کام کرتے ہیں
پکاڈلی میں اور بھی بعض دلچسپ چیزیں دیکھنے کی ہیں جو کسی گائڈ بک کے
دیکھنے سے معلوم ہو جائینگی۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ پکاڈلی ہائیڈ پارک کا زیر بر
ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ایک سڑک جانب مغرب جاتی ہے۔ جس کو نائٹس برج
کہتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی کسنگٹن کو چلی جاتی ہے۔ دوسری سڑک پارک لین شمال کی طرف
اکسفورڈ اسٹریٹ میں ملجاتی ہے۔ اس سڑک سے متصل جانب غرب ہائیڈ پارک ہے
جس کا ذکر باغوں کے سلسلہ میں کیا جائیگا۔ پارک لین جس مقام پر اکسفورڈ اسٹریٹ سے
ملجاتی ہے وہ ایک چوراہا ہے جس کو ماربل آرچ کہتے ہیں۔ یہ ہائیڈ پارک کا شمال مشرق
گوشہ ہے۔ یہاں ٹرافک کی بڑی کثرت رہتی ہے۔ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ دن کے
بارہ گھنٹوں میں کوئی تیس ہزار کے قریب موٹریں اس سڑک پر سے گذر جاتی ہیں۔ یہاں
سنگ مرمر کی ایک زبردست کمان ہے۔ شاہ جارج چہارم نے اسی ہزار پونڈ کے صرفہ سے
یہ کمان بنوائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ بکنگھم پیلیس کے لئے یہ کمان پھاٹک کا کام دے۔
یہاں سے مشرق کی جانب اکسفورڈ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک قدیم بازار لندن
کا ہے۔ جس کی لمبائی ایک میل کے قریب ہے۔ درمیان میں ایک چوراہا ہے جس کو اکسفورڈ
سرکس کہتے ہیں۔ یہ بڑے معرکہ کی جگہ ہے۔ یہاں بعض مشہور و معروف دکانیں ہیں سنتے
ہیں کہ اس طرف زمین کی قیمت پانچ سو روپیہ فی مربع فٹ ہے۔ اکسفورڈ سرکس کے جنوب
میں ریجنٹ اسٹریٹ ہے جو پکاڈلی سرکس کو جاتی ہے۔ یہ سڑک بھی اکسفورڈ سرکس سے گذر کر
شمال کو چلی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی تین میل کی ہے۔ جارج چہارم نے اپنی سہولت کے
واسطے یہ سڑک بنوائی تھی۔ ہندوستان میں محمد شاہ رنگیلا اور انگلستان میں جارج چہارم
رنگیلے پن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس بازار میں لندن کی بعض بہترین دکانیں
ہیں۔ اکسفورڈ سرکس سے سیدھے اگر مشرق کو چلے جاؤ تو کچھ دور جا کر ایک عظیم الشان

چوراہا ملیگا - جسے سینٹ گائلس سرکس کہتے ہیں - یہاں اکسفورڈ اسٹریٹ ختم ہوجاتی ہے اور نئی اکسفورڈ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے - چوراہے کے شمال میں ٹاٹن ہیم کورٹ روڈ اور جنوب میں چیرنگ کراس روڈ ہے - اگر اس راستہ پر چلے جاؤ تو آگے چلکر ایک اور چوراستہ کیمبرج سرکس ملیگا - یہاں چیرنگ کراس روڈ اور شیافٹ بری ایوے نیو کا جنکشن ہے - اگر داہنی جانب مڑجاؤ تو پکاڈلی سرکس پہونچوگے - بائیں جانب کا راستہ برٹش میوزیم کو جاتا ہے - سیدھے چلے جاؤ تو لیسٹر اسکوائر ملیگا - یہ حصہ شہر کا سینما اور تھیٹروں سے بھرا ہوا ہے - داہنی جانب کا راستہ پکاڈلی سرکس کو جاتا ہے لیکن سیدھی سڑک کچھ دور جانے کے بعد ٹرافلگر اسکوائر کو پہنچا دیگی - جس کے قریب جنوبی حصہ میں چیرنگ کراس کا ریلوے اسٹیشن ہے -

چیرنگ کراس ایک اہم مقام ہے - یہ قلب لندن سمجھا جاتا ہے - یہیں سے پندرہ میل کے دائرہ میں لندن کے حدود کا شمار ہوتا ہے - اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہ ایڈورڈ اول کی ملکہ الیانور کا جنازہ شہر لندن سے جب وسٹ منسٹر کی طرف لے گئے تو راستہ میں بارہ دفعہ آرام لینے کی خاطر قیام ہوا اور ہر مقام پر بادشاہ نے ایک صلیب استادہ کی - اس زمانہ میں اس جگہ ایک قصبہ چیرنگ نام سے تھا - چونکہ یہاں بھی آرام لینے کو ٹھیرے تھے قاعدہ کے مطابق ایک صلیب استادہ کردی گئی - اس طرح اس مقام کو چیرنگ کراس کہنے لگے - بعد میں پارلمینٹ کے حکم سے یہ صلیب یہاں سے اٹھا دیگئی -

یہاں سے مشرق کی طرف لندن کا ایک مشہور بازار اسٹرانڈ ہے - جس میں ہوٹل اور تھیٹر وغیرہ تفریح کے مقامات کثرت سے ہیں - یہ بازار ٹمپل بار پر ختم ہوجاتا ہے - اور یہاں سے شہر لندن کے حدود شروع ہوتے ہیں - قریب میں لندن کی عدالتوں کی عمارت ہے - جسے لاکورٹس کہتے ہیں - دس لاکھ پونڈ اس عمارت کی لاگت

بتلائی جاتی ہے۔ اسی نواح میں مشہور آفس آف کورٹس بھی ہیں۔ جہاں بیرسٹری کی تعلیم ہوتی ہے۔ کچھ اور آگے بڑھو تو فلیپ اسٹریٹ ہے جو لندن کے اخباروں اور رسالوں وغیرہ کا مرکز ہے۔ اسٹرانیڈ سے متصل شمالی حصہ میں ایک ہلالی وضع کا بازار آلڈوِچ ہے جس کے دونوں کونے اسٹرانیڈ میں نکلتے ہیں۔ آلڈوِچ سے دو سڑکیں شمال کی طرف جاتی ہیں۔ ایک کنگس وے ہے اور دوسری ڈروری لین کنگس وے اور آلڈوِچ دونوں جدید بازار ہیں۔ اول الذکر میں ایک عالیشان عمارت انڈیا ہاؤز حال میں ہی بنی ہے جس کا افتتاح بادشاہ سلامت نے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ ڈروری لین سے اگر شمال کی طرف جاؤ تو برٹش میوزیم پر نکلوگے اور کنگس وے اس سے کسی قدر آگے ہائی ہال برن پر پہنچائیگا۔ کنگس وے کے نیچے ایک ٹنل ہے جس میں سے ٹرام جنوبی لندن کو جاتی ہے۔ برٹش میوزیم کے قریب دو محلے قابل تذکرہ ہیں۔ ایک رسل اسکوائر اور دوسرا گاور اسٹریٹ۔ رسل اسکوائر ایک کھلا ہوا مقام ہے۔ جہاں متعدد ہوٹل ہیں۔ لندن کے آخری زمانہ قیام میں کچھ دنوں کے لئے میں اس محلہ میں ٹھیرا تھا۔ سستے اور مہنگے دونوں قسم کے ہوٹل ہیں لیکن گاور اسٹریٹ میں جو اس سے ملحق ہے سستے ہوٹل بہت ہیں۔ چنانچہ ہندوستانی طالب علم اس محلہ میں کثرت سے قیام کرتے ہیں۔ پانچ چھ شلنگ روزانہ میں ناشتہ کے ساتھ ایک کمرہ ان ہوٹلوں میں ملجاتا ہے۔ لیکن یہ سب ہوٹل ایسے ہیں کہ صحن نہ ہونے کی وجہ سے تازہ ہوا مفقود ہے گاور اسٹریٹ میں ہندوستانی طلباء کی ایک انجمن بھی ہے۔

اب تک جن مقامات اور بازاروں کا ذکر کیا گیا یہ سب دریا کے شمال میں ہیں جنوبی حصہ اس قدر فیشن ایبل اور آباد نہیں ہے۔ تاہم بعض محلے اور بازار جنوب میں بھی بارونق اور اچھے ہیں۔ چنانچہ ایک زبردست چوراہا ایلیفنٹ اینڈ کیسل ہے جہاں چھ بڑی بڑی سڑکیں آکر ملتی ہیں۔ ماسوا اس کے یہ مقام ٹریم اور موٹر بسوں

کا مرکز بھی ہے۔ زمین دوز ریل کے واسطے بھی یہ ایک سنٹر ہے۔ اس طرح ٹرلج اور برکش وغیرہ کے بازار بھی اچھے ہیں۔ لندن جیسے شہر کے تمام بازاروں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرنا باعث طوالت ہے میں نے ضروری اور مشہور بازاروں کا ذکر کر دیا ہے۔

لندن کا ایک مشہور حصہ ایسٹ اینڈ یعنی گوشہ مشرق ہے۔ جس کو ویسٹ اینڈ یعنی گوشہ مغربی سے کوئی مناسبت نہیں۔ نہ تو یہاں اچھی اچھی فیشن ایبل دکانیں ہیں۔ نہ کوئی آثار تمول اور امارت کے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ غریب اور کچھ متوسط درجہ کے لوگ اس حصہ میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ کے ناولوں اور کتابوں میں لندن کے اس حصہ کی بہت کچھ برائیاں پڑھی تھیں۔ چنانچہ اس توقع کے ساتھ میں وہاں گیا کہ کوئی غیر معمولی منظر دیکھنے میں آئیگا مگر مایوسی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدیم زمانہ کا ایسٹ اینڈ اب باقی نہیں رہا۔ زمانہ کی رفتار نے ان غریب اور مزدوری پیشہ لوگوں کی آنکھیں کھولدیں۔ ان کو اپنی ترقی کا احساس ہوا اور حکومت نے بھی ان کے اصلاح کی طرف توجہ کی۔ قدیم اور بوسیدہ عمارتیں گرا دیگئیں۔ ان کی جگہ جدید مکانات بنائے گئے۔ قانون کی گرفت روز بروز زیادہ ہوتی گئی اس لئے اب تو نہ ویسے جرائم پیشہ باقی ہیں اور نہ اتنے جرائم ہوتے ہیں جن کے لئے ایسٹ اینڈ مشہور تھا۔ تاہم لندن کے اس حصہ کی سیر ضرور کر لینی چاہیئے تاکہ تمول اور تہذیب کے مختلف مدارج کا معائنہ کر کے انسان عبرت حاصل کر سکے۔

اب چند دلچسپ مقامات اور عمارتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں اور میرے خیال میں ہر سیاح کو ان کا دیکھنا ضروری ہے۔

برٹش میوزیم۔ یہ عمارت گریٹ رسل اسٹریٹ میں واقع ہے۔ اس میں تمام دنیا کے انواع و اقسام کے عجائبات جمع کئے گئے ہیں غالباً اس نمونہ کا عجائب خانہ دنیا میں نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص مہینوں اس مکان کی موجودات کا مطالعہ کرتا رہے

تو بھی کماحقہ سیر نہیں کرسکتا ۔ داخلہ کے لئے کوئی فیس نہیں لیجاتی ۔ دروازہ پر موجودات عجائب خانہ کی چھوٹی اور بڑی فہرستیں ملتی ہیں ۔ ان کی امداد سے سیر اچھی طرح ہوسکتی ہے سالانہ آٹھ لاکھ کے قریب آدمی اس عمارت میں داخل ہوتے ہیں ۔

ہیمٹن کورٹ

لندن سے پندرہ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی جانب دریا کے قریب یہ محل واقع ہوا ہے ۔ ۱۵۱۵ء میں کارڈنیل اولس لے نے اپنے واسطے یہ مکان بنوایا تھا ۔ دس سال بعد شاہ ہنری ہشتم کو اس نے یہ عمارت نذر دیدی اس کے بعد کئی بادشاہ اس محل میں رہے ۔ ولیم سوم نے اس میں بہت کچھ ترمیم کروائی ۔ شاہ جارج دوم کے زمانہ سے اس کی حیثیت شاہی محل کی باقی نہیں رہی ۔ ایک حصہ میں اب کچھ وظیفہ خوار لوگ رہتے ہیں ۔ سرخ اینٹ کی زبردست عمارت ہے ۔ انگلستان کے شاہی محلات میں اس سے بڑی کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ بعض امور کے لحاظ سے یہ بہترین مانی جاتی ہے ۔ چھوٹے بڑے ایک ہزار کمرے اس محل میں ہیں ۔ قلمی تصاویر کا جو ذخیرہ اس میں ہے وہ انگلستان میں بہترین تسلیم کیا جاتا ہے ۔ داخلہ کے واسطے قلیل فیس لیجاتی ہے ۔ باغ میں ایک انگور کی بیل بہت قدیم ہے ۔ کہتے ہیں کہ ۱۷۶۸ء میں بیل لگائی گئی تھی ۔ محل کے بالمقابل چمن میں ایک بھول بھلیاں ہے اکثر لوگ تفریح طبع کے لئے اس میں جاتے ہیں ۔ واٹرلو اسٹیشن سے اس مقام تک ریل جاتی ہے ۔ دریا میں کشتیاں پڑی رہتی ہیں ۔ چاہو تو کرایہ پر کشتی لیکر دریا کی سیر کرو ۔ منظر بہت اچھا ہے ۔

کرسٹل پیلیس

یہ لندن کے جنوب میں ہے ۔ موٹریں اور ٹرام مختلف مقامات سے یہاں آتی جاتی ہیں ۔ لندن برج اور وکٹوریہ سے ریل بھی جاتی ہے ۔ "فارسٹ ہل سے" یہ مقام قریب ہے اس لئے مجھ کو اکثر جانے کا اتفاق ہوا ۔ زبردست عمارت ہے ۔ ۱۸۵۱ء میں ایک نمایش ہائیڈ پارک

میں ہوئی تھی۔ اس کے ختم پر جو سامان بچا اس سے یہ عمارت تیار کی گئی ہے۔ موسم گرما میں جمعرات کے روز یہاں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ بشرطیکہ موسم صاف ہو۔ میلے وغیرہ بھی یہاں ہوا کرتے ہیں۔ دونوں طرف ایک ایک برج (۲۸۲) فٹ بلند ہے اور درمیانی ہال جس کی چھت کانچ کی ہے۔ سولہ سو فٹ لمبا ہے۔ شمالی برج پر زینہ یا جھولے کے ذریعہ جا سکتے ہیں۔ وہاں سے لندن کا منظر دور تک دیکھنے کے لائق ہے۔ نمایش کے طور پر اس عمارت میں بعض اشیاء رکھی گئی ہیں یہاں ایک آرکسٹرا بہت بڑا ہے۔ اس کے مقابل پانچ ہزار آدمی کی نشست کا بندوبست ہے۔ عمارت کی پشت پر خوبصورت چمن ہے۔

ونڈسر کیسل یہ انگلستان کا مشہور اور قدیم شاہی محل لندن سے پچیس میل کے فاصلہ پر جانب غرب واقع ہے۔ اگر بادشاہ سلامت اس میں سکونت پذیر ہوں تو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ خالی ہونے کی حالت میں رہبر کے ساتھ اس کی سیر کرائی جاتی ہے۔ پیڈنگٹن یا واٹرلو اسٹیشن سے بذریعہ ریل جا سکتے ہیں۔ میں موٹر کوچ سے گیا تھا۔ ہائیڈ پارک کارنر سے متعدد کوچین جایا کرتی ہیں۔

میڈم ٹوساڈ کی نمایش یہ عجیب وغریب نمایش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے میڈم ٹوساڈ ایک عورت سوٹیزرلینڈ کی رہنے والی تھی۔ پیرس میں اس نے موم کے پتلے بنانے کی صنعت کو سیکھا۔ وہاں جب بغاوت سیاسی ہوئی تو وہ بھاگ کر لندن آئی اور یہاں اس نے موم کے پتلوں کی نمایش قائم کی۔ سینکڑوں پتلے موم کے بنے ہوئے قدآدم ایسے دکھائی دینگے کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ جس آدمی یا عورت کا مجسمہ ہے اس کو لباس بھی اصل کے مطابق پہنایا ہے۔ انگلستان کے تمام بادشاہ و مشہور و معروف اکابر کے پتلے یہاں موجود ہیں۔ ایک کمرہ ایسا ہی

جیسیں مشہور مجرمین کے پتلے ان کے متعلقہ واقعات کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ مشابہت ایسی پیدا کی گئی ہے کہ اصل سے ملا کر دیکھو تو کچھ فرق نہ ہوگا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ دھوکے میں آکر پتلون سے راستہ دریافت کرنے لگتے ہیں۔ مجھکو بھی اس قسم کی غلط فہمی ایک دفعہ ہوئی۔ یہ نمایش میریلی بون روڈ میں ہے

ٹیٹ گیلری

یہ نمایش دراصل نیشنل گیالری کی ایک شاخ ہے۔ اس میں بہترین ماہر فن کی تصاویر جمع کی گئی ہیں

ولیس کلکشن

اپنے قسم کے بہترین نمایش گاہ ہے۔ مختلف اقسام کی نادرالوجود تصاویر یہاں دیکھنے میں آئینگی۔ یہ نایاب ذخیرہ ایک امیر کبیر سر رچرڈ ولیس کا ذاتی تھا۔ جس نے ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ اس کی بیوہ لیڈی ولیس نے اس بیش بہا متروکہ کو گورنمنٹ کی نذر کردیا۔ نمایش کی عمارت بیکر اسٹریٹ میں ہے۔

لندن میوزم

یہ ڈوور اسٹریٹ کے قریب ہے۔ قدیم زمانہ کا تمدن اور معاشرتی پہلو کا اندازہ کرنا ہے تو اس نمایش کو ضرور دیکھو قدیم لندن کا ایک ماڈل یہاں دیکھنے کے لائق ہے۔ اس میں روشنی کرکے لندن کی اس تاریخی آتش زدگی کا منظر بتلایا جاتا ہے جو ۱۶۶۶ء میں پانچ روز تک لندن میں ہوتی رہی۔

ٹور آف لندن

جو شخص تاریخ انگلستان سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہو وہ اس مشہور اور قدیم عمارت کے نام سے ضرور آشنا ہوگا۔ لندن کے مشرقی گوشہ میں دریائے ٹیمز کے شمالی کنارہ پر اور ٹور برج کے متصل یہ عمارت واقع ہوئی ہے۔ یہ بات تحقیق نہ ہوسکی کہ سنگ بنیاد کس زمانہ میں کس نے رکھا لیکن یہ معلوم ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں ولیم فاتح نے

اس عمارت میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس نے نہ صرف قلعہ کا کام دیا بلکہ شاہی محل بھی رہا ہے۔ اور ایک حصہ میں سیاسی قیدیوں کو بھی رکھا جاتا تھا۔ اب یہاں فوج رہتی ہے۔ اطراف میں جو خندق ہے وہ خشک کر دی گئی۔ اس میں فوجی لوگ ڈرل کرتے ہیں۔ خندق کو شامل کر لیا جائے تو اٹھارہ ایکر رقبہ میں یہ عمارت واقع ہوتی ہے۔ رہبر کے زیر نگرانی مختلف حصوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کشت وخون کے بعض دلچسپ تاریخی واقعات اس عمارت میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ سب سے دردناک قتل شاہ ایڈورڈ پنجم اور اس کے بھائی کا تھا۔ شاہ مذکور ایک کم سن تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کا چچا رچرڈ سوم اس کو قید کر کے خود بادشاہ ہو گیا اور دونوں بھتیجوں کو اس نے قتل کروا دیا دوسرا دردناک واقعہ ملکہ این بولین کا ہے۔ یہ حسین عورت شاہ ہنری ہشتم کی پہلی ملکہ کیدھرین کی سہیلیوں میں داخل تھی۔ قسمت کی یاوری دیکھو کہ بادشاہ اس کے گندمی رنگ اور رسیلی آنکھوں پر بری طرح فریفتہ ہو گیا ؎

غلام نرگس مست تو تاجدارانند   خراب بعد لعل تو ہوشیارانند

دل کی لگی کو پورا کرنے کے لئے بادشاہ اپنی بیوی کیدھرین کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا بہانہ یہ نکالا کہ اس بیوی سے اولاد نرینہ نہیں ہوتی۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ آخر کار جون ۱۵۳۳ء میں این بولین سہیلی سے ملکہ بنی لیکن اس سے قبل ہی بادشاہ نے خفیہ طور پر اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ پہلے ہی سال ملکہ الیزبتھ پیدا ہوئی۔ جس طرح دنیا کی اکثر چیزیں زوال پذیر ہیں حسن کی دل آویزی بھی ایک عارضی کیفیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد اس حسن کی ملکہ سے بادشاہ کا دل بھر گیا۔ طلاق لینے کی خاطر بادشاہ نے اس معصوم صفت ملکہ پر دو الزام رکھے۔ ایک بدچلنی کا اور دوسرا سازش کا۔ بہر حال تین سال کی حکومت کے بعد یہ نیک نہاد اور ہر دل عزیز ملکہ ٹاور آف لندن میں قید کر دی گئی اور وہیں

قتل بھی ہوئی جیمس اول اور چارلس دوم کی اس قلعہ میں تاج پوشی ہوئی۔ اس عمارت میں ایک کمرہ بل ٹور کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں کچھ عرصہ تک ملکہ الیزبتھ اوائل عمری کے زمانہ میں قید رہی ہیں۔ متعدد مقامات تاریخی دلچسپیوں سے مملوک اس ٹور میں تبلائے جاتے ہیں۔ ہر ایک چیز کا تفصیل سے ذکر کرنا مشکل ہے۔ لیکن دو ایک مقامات اور لائق تذکرہ ہیں۔ ایک کمرہ وہ ہے جس میں مشہور و معروف سر والٹر ریلی اور گائیڈ فاکس وغیرہ قید رہے ہیں۔ اول الذکر ملکہ الیزبتھ کا بہت مقرب درباری امیر تھا۔ شاہ جیمس اول اس سے ناراض ہوگیا۔ ایک سازش کے الزام میں اس پر مقدمہ قایم کیا گیا۔ اگرچہ قتل کا حکم ہوگیا تھا لیکن عین وقت پر معافی استدعا ملی کہ بجائے قتل کرنے کے قید میں رکھا گیا۔ چودہ سال اس محبس میں وہ مقید رہا اور اس عرصہ میں دنیا کی ایک تاریخ اس نے تالیف کر دی۔ گائیڈ فاکس نے شاہ جیمس اول کے زمانہ میں ایک سازش میں حصہ لیا تھا۔ جس کا منصوبہ یہ تھا کہ پارلیمنٹ کا محل بارود کے ذریعہ اڑا دیا جائے۔ تاریخ انگلستان میں یہ واقعہ گن پوڈر پلاٹ یعنے بارود کی سازش کے نام سے مشہور ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ وہ کمرہ ہے جس میں شاہی جواہرات محفوظ ہیں۔ بادشاہ اور ملکہ کے تاج معہ بیش بہا ہیروں کے یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ اس کمرہ کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔

جن مقامات کا تذکرہ اوپر کیا گیا ان کے علاوہ لندن میں بیشمار عجائبات اور تاریخی عمارتیں ہیں۔ دیکھنے والے کے مذاق پر اس کا انحصار ہے کہ کونسی چیز دیکھے اور کونسی نہ دیکھے۔ میں نے مشہور اور عام پسند مقامات کا حوالہ دیدیا ہے اب میں چند ایسے باغ اور کھلے ہوئے مقامات کا تذکرہ کرتا ہوں جو لندن کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں ان ہی کے وجود سے لندن کو تازہ ہوا نصیب ہوتی ہے یہ مقامات بڑی سیر و تفریح کے ہیں۔ سب سے مشہور ہائیڈ پارک ہے۔ پکاڈلی کی

سڑک کا ایک حصہ اس باغ کے دروازہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس مقام کو ہائڈپارک
کارنر کہتے ہیں۔ شام کے وقت یہاں مجمع کثرت سے ہوتا ہے۔ اس باغ سے ملحق
مغرب کی طرف ایک ہی سلسلہ میں دوسرا باغ کنگسٹن گارڈن ہے۔ اگر ہائیڈ پارک
کارنر کے دروازہ سے باغ میں داخل ہوں تو سامنے ہی ایک سڑک ملیگی جو گھوڑوں
کی سواری کے لئے مخصوص ہے اس کو راٹن رو کہتے ہیں۔ حالانکہ اصل لفظ روٹ ڈی
رائے ہے۔ قاعدہ ہے کہ غیر زبان کا لفظ بعض دفعہ کثرت استعمال سے ایک دوسری
شکل میں رواج پا جاتا ہے۔ چنانچہ اس فرانسیسی لفظ کی انگریزوں نے پوری طرح
گت بنا دی ہے۔ یہاں تفریح کرنے والوں کے لئے آہنی کرسیاں سلیقہ کے ساتھ
کثرت سے رکھی ہوئی ہیں۔ ایک آنہ کا ٹکٹ لیکر ان پر بیٹھ سکتے ہو قریب ہی ہیں
ایک مصنوعی تالاب ہے۔ جس کو سرپنٹائن کہتے ہیں۔ صبح اور شام مقررہ اوقات
کے اندر کچھ فیس دینے پر اس میں نہانے کی اجازت ملجاتی ہے۔ اکثر شام کو
بینڈ نوازی بھی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ دوسرے باغوں میں بھی ہے۔ باغ کے ایک
جانب پھولوں کے تختے نہایت دلفریب اور فرحت بخش ہیں۔ باغ کا شمال مشرقی
دروازہ ماربل آرچ یعنی سنگ مرمر کی کمان کہلاتا ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے
یہ باغ اگرچہ تفریح کی جگہ ہے لیکن کسی قدر بدنام بھی ہے۔ اکثر شریف خیال
عورتیں اس طرف آنا پسند نہیں کرتیں۔ شمالی جانب جو وسیع میدان ہے اس
میں بڑا مجمع ہوا کرتا ہے۔ متعدد گروہ گروہ کھڑے ہوئے دکھائی دیں گے کہیں
سیاسی مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے اور کہیں مذہبی لکچر ہو رہا ہے۔ موسیقی کے
شوقین بھی اپنی جماعت کے ساتھ مصروف بہ تفریح ہیں۔ ایک روز میں نے
اس جگہ دلچسپ مظاہرہ دیکھا۔ دو ڈھائی سو آدمیوں کا مجمع تھا۔ درمیان میں
ایک منبر پر چند ہندوستانی کھڑے تھے۔ سوراج کا جھنڈا ہوا میں فر فر اڑ رہا تھا

ہندوستانی نمایندے باری باری سے آزادی وطن کے موضوع پر گفتگو کرتے تھے قریب میں دو ایک کانسٹبل بھی نگرانی کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ میں بہت دیر تک اس مجمع میں کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ افسوس ہے کہ یہ ہندوستانی نمایندے محدود قابلیت کے لوگ تھے۔ اپنا مافی الضمیر پوری طرح ادا کرنے پر ان کو قدرت حاصل نہ تھی۔ اور اکثر غیر متعلق امور پر گفتگو کرتے تھے۔ سامعین میں سے بعض لوگ ان پر معترض بھی ہوئے۔ جوابات کسی طرح معقول نہ ہوتے تھے۔ غل و شور بھی زیادہ ہو رہا تھا چنانچہ ایک معترض نے تنگ آکر کہا کہ تم سننے کو آئے ہو یا غل مچانے کو بلکہ ایک شخص نے تو یہ بھی کہا کہ اپنی زبان کو تم منہ کے اندر رکھو تاکہ بدشکل نہ معلوم ہونے لگے۔ سامعین میں سے دو ایک آدمیوں نے یہ بھی خواہش کی کہ ہم اسٹیج پر آتے ہیں اور اپنے اعتراضات خود بیان کریں گے۔ چنانچہ دو یوروپین یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آئے اور جتنا وقت ان کو دیا گیا تھا اس میں ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردانہ کارگزاریوں کا ذکر کرتے رہے عام طور پر مناظرہ کا جو حشر ہوا کرتا ہے وہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ ہر شخص اپنی اپنی کہتا تھا۔ جب غل زیادہ ہونے لگا تو میں وہاں سے چلا آیا خوبصورتی کے لحاظ سے کنگسٹن پارک اس سے بہتر ہے۔

ہائیڈ پارک کے شمال میں کسی قدر فاصلہ پر ریجنٹس پارک ہے۔ لندن کے بڑے باغوں میں اس کا بھی شمار ہے۔ پرم روز ہل کو شامل کر کے اس کا رقبہ (۴۷۳) ایکڑ ہوتا ہے۔ شاہ جارج چہارم نے یہ باغ بنوایا تھا۔ اس کے ایک گوشہ میں ذو یعنی چڑیا گھر۔ تمام دنیا کے چرند اور پرند یہاں جمع کیے گئے ہیں۔ کثرت سے لوگ تماشہ دیکھنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں بائیس ہزار سے اوپر آدمی اس میں داخل ہوئے۔ اس چڑیا گھر

کا افتتاح ۱۸۲۸ء میں جب ہوا تو صرف تین جانور تھے۔ ایک عقاب۔ ایک گدھ اور ایک ہرن۔ آج جاکر دیکھو تو ہر قسم کے جانور اور پرند سے اس کو بھرا ہوا پاؤگے۔ کچھ فیس لیکر کم سن بچوں کو اونٹ اور ہاتھی پر بھی بٹھاتے ہیں۔ قریب میں ایک مکان ہے جس میں سمندر کی مچھلیاں اور دوسرے جانور زندہ حالت میں رکھے گئے ہیں اسے اکیوریم کہتے ہیں۔

دریا کے جنوب میں ایک مشہور باغ بیٹرسی پارک ہے جس میں بچوں کی تفریح کے لئے خاص انتظام کیا گیا ہے۔ نواح لندن میں چھوٹے چھوٹے متعدد پارک ہیں۔ فارسٹ ہل میں ہمارے مکان سے قریب ایک باغ تھا کبھی کبھی ٹینس کھیلنے میں وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ متعدد لان کورٹ تھے غیر ممبر سے ایک شلنگ مقررہ وقت کے اندر کھیلنے کے واسطے لیتے ہیں باغ کے ایک حصہ میں چھوٹا سا تالاب ہے۔ یہاں اسکول کے بچے آکر کھیلتے رہتے ہیں۔ کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں چلاتے ہیں۔ مکان سے کسی قدر فاصلہ پر لندن کے راستہ میں دو ایک پارک ہم کو ملتے تھے۔ لندن جیسی گنجان آبادی کے لئے اس قسم کے کھلے ہوئے مقامات کی بہت ضرورت ہے

شاہی محل یعنی سینٹ جیمس پیلیس کے تین طرف باغ ہی باغ ہیں۔ ایک سینٹ جیمس پارک اور دوسرا گرین پارک۔ ان دونوں باغوں کی تازہ اور نفیس ہوا سے بکنگھم پیلیس میں بادشاہ سلامت بھی مستفید ہوتے ہیں۔ گرین پارک پیکاڈلی اور ہائیڈ پارک کارنر سے ملحق (۵۳) ایکر کے ایک تکونہ رقبہ میں واقع ہے۔ لندن کا ایک پر تکلف اور مشہور ہوٹل رٹز اس باغ سے ملحق ہے اور ایک گوشہ میں لندن میوزیم ہے جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

لندن کے جنوب و مغرب میں تین سو ایکڑ زمین پر ایک خوبصورت نباتاتی باغ ہے جس کو کیو گارڈن کہتے ہیں۔ یہاں خاص چیز دیکھنے کے لائق کانچ کے مکانات ہیں جن میں گرم ملک کے اکثر درخت ایسے پائے جائیں گے جو سرد آب و ہوا میں نشو و نما نہیں پا سکتے۔ ترکیب یہ کی گئی ہے کہ ان مکانوں میں مقیاس الحرارت (۸۰) ڈگری پر رہتا ہے۔ اسی باغ سے متصل قصبہ رچمنڈ ہے۔ لندن کے نواح میں اس مقام کا منظر بہت خوبصورت شمار کیا جاتا ہے۔ دریا میں کشتیاں کرایہ پر چلتی رہتی ہیں۔ تعطیل کے دن لوگ اس نواح میں تفریح کے لئے کثرت سے آتے ہیں۔

کھلے ہوئے مقامات میں سب سے بہتر اور مقبول جگہ ہیمپ اسٹڈ ہیتھ ہے اس کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ تفریح کے لئے بکثرت لوگ یہاں آتے ہیں۔ قریب میں ایک پہاڑی ہے۔ جس کو پالیمنٹری کہتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر سے لندن کا منظر دلکش اور بے نظیر ہے۔ سنتے ہیں کہ یورپ میں کوئی دارالسلطنت ایسا نہیں ہے جس میں اس قدر باغ اور تفریح کے مقامات ہوں چنانچہ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ لندن میں جو پارک ہیں ان کا مجموعی رقبہ آٹھ ہزار ایکڑ سے کم نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اطراف لندن میں متعدد پارک اور تفریح گاہیں ہیں مثلاً رچمنڈ پارک جس کا رقبہ دو ہزار ایکڑ سے زاید ہے۔ ایپنگ فارسٹ ایک خوشنما جنگل ہے جس کا ساڑھے پانچ ہزار سے زاید رقبہ ہے اور یہ پبلک کی تفریح کے واسطے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اگر ان تمام باغوں کا ذکر کیا جائے جو لندن کے اطراف و جوانب میں ہیں تو فہرست بہت طول طویل ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان باغوں کی بدولت لندن جیسے عظیم الشان شہر کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت بخش رہتی ہے۔ تفریح کے بہت کچھ سامان ان باغون میں ہوتے ہیں۔ کہیں ٹینس کورٹ

ہیں۔ کہیں کرکٹ کھیلا جاتا ہے۔ اور کہیں نہانے کا انتظام ہے۔ ایک روز شام کو میں ایک باغ میں چلا گیا۔ وہاں ایک سرسبز میدان میں ضعیف العمر لوگ جمع تھے۔ ان کے لئے ہلکی ورزش کا بندوبست تھا۔ مثلاً کچھ بڈھے قطار باندھ کر بالمقابل کھڑے ہو گئے اور ایک لوہے کا گولہ ادھر سے اُدھر لڑھکانے لگے۔ کمسن بچوں کے لئے بھی الگ جگہ محفوظ ہوتی ہے۔ پانی یا ریت میں یہ کھیلتے رہتے ہیں

محنت کے ساتھ ورزش اور تفریح کا بھی یہاں کے لوگوں کو بہت خیال ہے کرکٹ کھیلنے کے لئے ایک وسیع میدان ریجنٹ پارک کے قریب ہے جس کو لارڈس کرکٹ گراونڈ کہتے ہیں۔ موسم گرما میں یہاں بڑے بڑے میچ ہوتے ہیں۔ جنوبی لندن میں ایک دوسرا کرکٹ گراونڈ ہے جو اوول کے نام سے موسوم ہے۔ فارسٹ ہل سے لندن جاتے وقت اکثر یہ راستے میں ملتا تھا۔ اسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان کرکٹ میچ یہیں ہو رہا تھا۔ لندن سے سات میل کے فاصلہ پر جنوب ومغرب کی طرف ایک قصبہ ومبلڈن ہے۔ جہاں ٹینس کھیلنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے کورٹ بنے ہوئے ہیں اور دنیا بھر کی چیمپین شپ کے میچ یہاں موسم گرما میں ہوتے ہیں۔ تماشبین لوگوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ اگر بہت پہلے سے ٹکٹ نہ لئے جائیں تو جگہ نہیں ملتی۔

جسمانی ورزش اور کھیل کود کے علاوہ دوسری قسم کی تفریح کے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ تھیٹر وسینما وغیرہ بے شمار ہیں البتہ پیرس اور برلن میں جس نمونہ کے ناچ گھر ہیں وہ لندن میں مفقود ہیں۔ بارہ بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ ٹریم زمین دوز ریل اور موٹر بسیں یہ سب سواریاں نصف شب تک چلتی ہیں۔ الکٹرک ریل بھی نواح لندن میں بارہ بجے کے بعد نہیں چلتی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک تھیٹروں کا وقت ہے اس کے بعد لوگ اپنے اپنے

گھروں اور ہوٹلوں کو چلے جاتے ہیں۔ نصف شب کے بعد بازاروں میں وہ رونق اور چہل پہل نہیں رہتی جو پیرس اور برلن میں دیکھی گئی۔ سنا ہے کہ بعض کلب لندن میں ایسے ہیں جن میں صبح تک ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب تک ممبر نہ ہو جاؤ یا کسی ممبر سے ملاقات نہ پیدا کرو اجنبی آدمی کے لئے داخلہ بند ہے میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس قسم کے کلب کے قیام کی اجازت آسانی سے ملجاتی ہے۔ چند آدمی ملکر درخواست دیدیتے ہیں اور ایک مکان میں فرضی کلب قایم کرکے عیش و عشرت کے سب سامان مہیا کرلیتے ہیں۔ بعض خفیہ ذرایع ایسے ہیں جن کے توسل سے ہر اجنبی آدمی کچھ فیس دیکر کلب میں داخلہ کا ٹکٹ حاصل کرسکتا ہے مجھ کو چونکہ ایسے مقامات پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے میں وثوق کے ساتھ اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔

تھیٹر۔ سینما اور میوزک ہال اعلیٰ قسم کے ویسٹ اینڈ میں بکثرت ہیں۔ وسعت کے لحاظ سے سب میں بڑا تھیٹر لائیسیم ہے جس میں تین ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ یہ تھیٹر اسٹرانڈ میں ہے۔ دوسرا بڑا تھیٹر ٹاٹن ہم کورٹ روڈ میں ڈومینین کے نام سے موسوم ہے۔ اور بھی مشہور اور اچھے تھیٹر ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ ایک اشرفی سے لیکر دو شلنگ تک فی کس ٹکٹ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی نشست میں جانا ہو تو پہلے سے جگہ محفوظ کرانا بہتر ہے۔ کم قیمت کے درجوں میں جگہ محفوظ نہیں ہوتی۔ اکثر ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ تھیٹر کے باہر لوگ قطار باندھے دور تک فٹ پاتھ پر کھڑے رہتے ہیں۔ حسب موقع جگہ خالی ہونے پر ان کو ٹکٹ ملتا ہے۔ پہلی دفعہ جب میں نے اس قطار کو دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا واقعہ ہے۔ یہ خیال گزرا کہ یہاں بے روزگار آدمیوں کو شاید کھانا مفت دیا جاتا ہے اور یہ لوگ داخلہ کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں لیکن بعد کو اصلیت معلوم

ہوئی کہ کم قیمت والی نشست خالی ہونے کے انتظار میں ہیں۔ جیسے جیسے جگہ خالی ہوتی جاتی ہے اس قطار میں سلسلہ وار لوگوں کو ٹکٹ ملتا رہتا ہے۔ تماشہ کے شوقین جو زیادہ خرچ برداشت نہیں کر سکتے وہ گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی بات کا شوق انتہا سے زاید ہو جاتا ہے تو انسان اس کی تکمیل کے لئے انواع واقسام کے مصائب اٹھاتا ہے۔ تماشہ دیکھنے کی خاطر سر بازار قطار باندھکر کھڑا ہونا ایک بدنما طریقہ ہے۔ لندن کے نواح میں جو تھیٹر اور اور سینما ہیں ان میں کرایہ کم ہوتا ہے۔ سینما میں زیادہ تر بولنے والی تصویروں کا رواج ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ درمیان میں رقص وسرود کا پروگرام رکھدیتے ہیں مجھکو ان مکانات میں ایک تکلیف خاص طور پر محسوس ہوئی جس کی وجہ سے میں نے ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں اور سینما میں جانا ترک کر دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہاں پنکھوں کا رواج نہیں ہے۔ آدمیوں کی کثرت اور سگریٹ کے دھویں سے موسم گرما میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ نواح لندن میں چونکہ ہجوم کم ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف نہیں ہوتی۔ فارسٹ ہل میں ہمارے مکان سے قریب ایک بڑا سینما ہال تھا۔ میں اکثر وہیں چلا جاتا تھا۔ جو لوگ مطالعہ کتب سے اپنے دماغ کو تفریح دینا چاہتے ہیں ان کے لئے متعدد کتب خانہ اور ریڈنگ روم ایسے موجود ہیں۔ جہاں بلا کچھ خرچ کئے ہوئے کام نکلسکتا ہے۔ البتہ کوئی کتاب اپنے مکان نہیں لا سکتے۔ تاوقتیکہ ممبر نہ ہو جاؤ۔

کھانے پینے کی دکانیں جو رستوران۔ ٹی روم۔ اور کیفے وغیرہ کے مختلف ناموں سے مشہور ہیں بکثرت اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ بعض سستی ہیں اور بعض مہنگی۔ چند بڑے اور مشہور رستوراں ایسے بھی ہیں۔ جہاں ڈھائی یا تین شلنگ میں خاصا کھانا ملتا ہے۔ مثلاً سجے لائنس اینڈ کو کی متعدد دکانیں لندن میں

اس نرخ پر کھانا مہیا کرتی ہیں۔ اس کمپنی کے تین رسٹوراں جو بہت شاندار ہیں نہایت مقبول ہو گئے ہیں۔ ان کو لائنس کارنر ہاوز کہتے ہیں کیونکہ یہ ایسے موقع پر ہیں جہاں مشہور سڑکیں آکر ملتی ہیں۔ ایک ماربل آرچ کے قریب ہے۔ دوسرا اکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک گوشہ پر ہے اور تیسرا رسٹوراں پیکاڈلی سرکس کے قریب ہے۔ یہ تینوں عمارتیں کئی منزل کی عالیشان اور آراستہ ہیں۔ ان کے پیشاب خانہ اور منہ ہاتھ دھونے کے کمرے دیکھو تو خیال کسی شاہی عمارت کی طرف جاتا ہے وقت واحد میں ہزاروں آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ اکثر نشست خالی ملنی مشکل ہوتی ہے۔ اور جگہ ملنے کے بعد بھی حکم کی تعمیل میں بعض دفعہ بہت دیر ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کے حسن انتظام پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسے صبح سے لیکر شام کے بارہ بجے تک ہزارہا آدمیوں کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔ جب جاؤ رسٹوران کو معمور دیکھو گے نہ صرف کھانے کی غرض یہاں پوری ہوتی ہے۔ بلکہ سیر کا پہلو بھی مضمر رہتا ہے موسیقی کے دلدادہ بھی یہاں لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن موسیقی کے لئے کچھ اس رسٹوراں کی تخصیص نہیں جتنے بڑے رسٹوراں ہیں سب میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ عام طور پر رسٹوراں میں خوب صورت اور نوجوان لڑکیاں منتخب کرکے ملازم رکھی جاتی ہیں۔ کاروبار کو فروغ دینے کی یہ ایک ترکیب ہے۔

ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ میں چائے پینے کی غرض سے کسی رسٹوراں میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے پرانے دوست یعنی کولمبو والے شرابی صاحب بہادر اور میم صاحبہ ایک میز پر جلوہ افروز ہیں۔ مجھکو دیکھتے ہی بہت تپاک کے ساتھ دونوں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے او ہو پولس کمشنر تم یہاں کیسے آئے۔ مجھے بھی اس وقت خوب سوجھی۔ میں نے کہا کولمبو میں تم نے جو ہنگامہ برپا کیا تھا اس کے متعلق تمہارے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا ہے

اور میں کئی روز سے تمہاری تلاش میں پھر رہا ہوں ۔ وارنٹ کا نام سنکر صاحب بہادر کے ہوش اُڑ گئے ۔ لیکن میم تھی ذرا سمجھدار وہ فوراً تاڑ گئی کہ یہ مذاق کر رہے ہیں ۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی ۔ میز کے قریب ویٹر کھڑا ہوا تھا اور صاحب بہادر اس سے یہ کہنے ہی والے تھے کہ

لگا کے برف میں ساقی صراحی مئی لا جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

میں معذرت کرکے دوسری میز پر چلا گیا ۔ کثرت شراب خواری کی وجہ سے بلا مبالغہ ان دونوں کے منہ پر پھٹکار برس رہی تھی ۔ خدا اس بیماری سے محفوظ رکھے ۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر یہ لوگ جب جانے لگے تو صاحب کو دروازہ پر چھوڑ کر میم میرے قریب آئی اور نیچی آواز میں کہنے لگی "پولس کمشنر! یہ شخص لندن میں بھی مجھکو ستاتا رہتا ہے ۔ میرا روپیہ اب تک اس کے قبضہ میں ہے کیا تم مجھکو کوئی مشورہ نہیں دیسکتے"۔ میں نے کہا مجھکو بخشو ۔ کیونکہ تمہاری کیفیت تو یہ ہے کہ کانا مجھکو بھائے نہیں اور کانے بن سہائے نہیں ۔ تم کو مشورہ دینا بالکل بے سود ہے کیونکہ تجربہ سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ نصیحت کا اثر تم پر الٹا ہوتا ہے

سیکھ دیجئے واکو جاکو سیکھ سہائے سیکھ نہ دیجئے باندرا کہ بئے کا گھر جائے

یہ جواب سنکر کسی قدر مایوسی کے ساتھ وہ چلی گئی ۔ بڑی بے حیا اور بے شرم عورت ہے ۔ عالم شباب میں جو کچھ گلچھرے اس نے اڑائے ہوں گے اس کے آثار چہرہ سے نمایاں تھے ۔ لیکن ہوس ابھی تک باقی ہے ۔ خدا ایسی عورتوں سے بچاتا رہے ۔

ہندوستانی اور غیر ملک کے رسٹوران

لندن میں ہر قسم کا کھانا میسر آتا ہے ۔ شاید یورپ میں کوئی دوسرا شہر ایسا نہو گا جہاں اتنی کثرت سے مختلف مذاق کے کھانے ملسکتے ہیں ۔ ایک

محلہ سوہو اسکوائر کے نام سے ہے - وہاں غیر ملک کے باشندے بہت رہتے ہیں - اس محلہ میں چینی - فرانسیسی - اطالوی اور کئی اقسام کے رسٹوراں ہیں - جس ملک کا کھانا چاہو - یہاں ملجاتا ہے - تین ہندوستانی رسٹوراں مجھکو معلوم ہیں جہاں پلاؤ - کوفتہ اور دوسرے قسم کے ہندوستانی کھانے ملتے ہیں - ملازمین بھی ہندوستانی ہیں -

ریجنٹ اسٹریٹ اور پکاڈلی کے درمیان ایک گلی سوالو اسٹریٹ ہے - اس میں ویرا سوامی کا رسٹوراں ہے - یہ عمارت اچھی اور آراستہ ہے - البتہ کھانا انگریزی کھانوں سے کسی قدر مہنگا ہوتا ہے - سالنوں میں مرچ بھی زیادہ معلوم ہوئی - ایک رسٹوراں لیسٹر اسکوائر میں ہے - کھانا اگرچہ خاصا ہوتا ہے - لیکن مکان تنگ ہے - تیسرا رسٹوراں شفیع کا پکاڈلی کے قریب جیرالڈ اسٹریٹ میں ہے یہ اگرچہ بہت مقبول ہے لیکن جگہ کی تنگی کے ماسوا باورچی خانہ کی قربت بھی تکلیف دیتی ہے - شفیع جس نے رسٹوراں قایم کیا تھا اب زندہ نہیں ہے لیکن اس کی نوجوان بیوہ جو انگریزن ہے اس کام کو چلا رہی ہے مجھ کو کئی دفعہ یہاں کھانے کا اتفاق ہوا - ایک دفعہ رفیق بیگ اور سلیم بیگ نے اپنے جملہ احباب کو یہاں ڈنر دیا تھا - ایک کمرہ میں لمبی میز بچھادی گئی تھی اور ہمارے لئے مخصوص تھی لیکن اس کی وجہ سے بڑی تکلیف رہی - ایک دفعہ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی (محکمۂ دارالترجمہ حیدرآباد دکن) نے غلام یزدانی صاحب کی اور میری دعوت اسی رسٹوراں میں کی تھی - کھانا بحیثیت مجموعی اچھا ہوتا ہے - لیکن یہ لوگ ہندوستانی وضع کا میٹھا اچھا نہیں بنا سکتے - چنانچہ گلاب جامن جو یہاں کھانے میں آئی بالکل ناقص تھی - اس رسٹوراں میں ہندوستانی عورتیں ساڑھیاں پہنے ہوئے اکثر دکھائی دیتی ہیں - اور ایسے انگریز بھی آیا کرتے ہیں جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں - ایک روز کسی بازار میں مجھکو ایک شخص ملا جو بظاہر اینگلو انڈین معلوم ہوتا تھا

مجھکو ہندوستانی خیال کر کے اس نے روکا اور کہا کہ میں تین سال ہندوستان میں رہ چکا ہوں۔ خشکہ اور سالن کھانے کو بہت دل چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ لندن میں ہندوستانی رسٹوران بھی ہیں مگر مجھکو پتہ معلوم نہیں۔ میں نے اس کو تینوں رسٹوراں کے پتے بتادئے۔ بعض دکانیں ایسی ہیں جن میں ہلکا رفرشمنٹ ملتا ہے۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ اونچے سائز کی لمبی میز ہوتی ہے جس کو کاؤنٹر کہتے ہیں۔ یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میز پر کھانے کی چیز رکھ دیتے ہیں۔ کھڑے کھڑے کھاؤ اور چلے جاؤ۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے مناسب ہے جو جلدی میں ہوں اور ہلکی غذا کھانا چاہتے ہوں۔ جرمنی میں جو آٹو بفے ہم نے دیکھے تھے ان کا رواج یہاں ابھی نہیں ہوا ہے۔ مگر اس قسم کا ایک رسٹوراں بڑے پیمانہ پر اسٹرانیڈ کے محلہ میں تیار ہو رہا ہے۔ عنقریب جاری ہو جائے گا۔ یہ بات یاد رکھنے کے لایق ہے کہ رسٹوراں میں کھانے کے بعد چلتے وقت کچھ انعام ملازم یا ملازم کے واسطے چھوڑنا پڑتا ہے۔ عام طور پر ایک پنس فی شلنگ کافی ہوگی یا یوں سمجھو کہ بارہ آنہ کا اگر کھانا کھایا جائے تو ایک آنہ انعام کا ہوا۔ اس انعام کو یہاں کے محاورہ میں ٹپ کہتے ہیں۔ اس کا دستور عام ہے۔ ہوٹل کے ملازمین کو بھی ٹپ دینی پڑتی ہے۔ اس ٹپ کے ذریعہ سے رسٹوراں کے ملازمین کو اس قدر آمدنی ہوتی ہے کہ بعض مالکین اپنے ملازمین کو تنخواہ بھی نہیں دیتے بلکہ الٹا ان سے وصول کر لیتے ہیں۔

انگریزی کھانا

انگریزی کھانا سیدھا سادھا اور زود ہضم ہوتا ہے اصل پوچھو تو یہاں کا کھانا اُبلے ہوئے گوشت اُبلے ہوئے آلو اور انڈوں کے سوا نہیں ہے۔ سیاہ مرچ اور نمک حسب ضرورت کھانے کے وقت اوپر سے ڈال لیتے ہیں۔ کچے ٹماٹے بھی بہت شوق سے

کھاتے ہیں۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ انگریزوں نے فرانس اور اٹلی کے نفیس کھانوں
کو اپنے ہاں شامل کرلیا۔ عموماً وقت واحد میں دو قسم کے کھانوں سے زیادہ نہیں کھاتے
دو تین قسم کے گوشت زیادہ مروج ہیں۔ بکرے کا گوشت مٹن کہلاتا ہے۔ گائے کا
گوشت بیف اور سور کا گوشت کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ان لوگوں کو
جو سور کا گوشت نہیں کھاتے اس بات کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ اکثر ہوٹلوں میں
ناشتے کے ساتھ جو انڈا دیتے ہیں اس کے ساتھ ایک ٹکڑا بیکن یعنی سور کے گوشت کا
بھی رکھدیا جاتا ہے۔ ہوٹل والوں کو اگر منع کردیا جائے تو وہ اس کی جگہ کوئی دوسری
چیز بھی دے سکتے ہیں۔ گوشت کے متعلق اگر کسی وقت شبہ ہو تو دریافت کرلینے میں
کوئی ہرج نہیں ہے۔ دھوکے کا موقع بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ میز پر کھانے کی فہرست
لگی رہتی ہے۔ جو چیز مانگو گے وہی دیجائے گی۔ میٹھا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ فروٹ سلاد
زیادہ مقبول ہے۔ کئی قسم کے میوے شریک کرکے اسے تیار کرتے ہیں۔ مچھلی کثرت سے
ملتی ہے اور کئی قسم کی ہوتی ہے لیکن سول اور ہلیبس کا زیادہ رواج ہے۔ اکثر اسکو اُبال
کر کھاتے ہیں۔ روٹی کا استعمال برائے نام ہے۔ کھانے کے ساتھ محض دفع الوقتی کی
غرض سے ایک آدہ توس کھالیتے ہیں۔ یہاں کی روٹی وہی ہے جس کو ہم نان پاؤ یا
ڈبل روٹی کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک سفید اور دوسری بھوری۔ بھوری
روٹی زود ہضم ہے۔ کھانے کے ساتھ آئس کریم کھانے کا بھی رواج ہے۔ برلن اور پیرس
کی طرح یہاں شراب کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ کھانے کے ساتھ عام طور پر پانی پیتے ہیں
اصل یہ ہے کہ یہاں شراب مہنگی بہت ہے۔ یہاں کھانے پینے کی چیزیں اکثر غیر ملک
سے آتی ہیں۔ یہاں تک کہ گوشت اور انڈے وغیرہ بھی باہر سے آتے ہیں۔ ماکولات
کے لئے یہ ملک ممالک غیر کا اس قدر محتاج ہے کہ اگر ان چیزوں کی درآمد اس ملک میں
بند کردی جائے اور زندگی کا انحصار ملکی پیداوار پر رہے تو غالباً چھ مہینے سے زیادہ

یہ لوگ زندہ نہیں رہ سکتے

ایک تکلیف دہ طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے بعد کلی نہیں کرتے۔ جن کو عادت کلی کی ہے انہیں پہلے تو بے چینی رہے گی مگر بعد میں عادت پڑ جاتی ہے۔ اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے یہ کام نہیں کیا۔ لیکن یہ طریقہ دانتوں کے واسطے مضر ہے اس لئے اس ملک میں دندان سازی کا پیشہ فروغ پر رہتا ہے۔ غنیمت ہے کہ کھانا چکنا نہیں ہوتا ورنہ اور بھی مصیبت ہوتی۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں کھانے کے بعد خلال کرنے کا رواج ہے۔ اکثر رسٹوران والے خود خلال پیش کرتے ہیں مگر انگلستان میں یہ طریقہ معیوب ہے۔ صبح کے ناشتہ کو یہاں بریک فاسٹ کہتے ہیں دوپہر کے کھانے کو بعض لوگ ڈنر کہتے ہیں اور بعض لنچ کہتے ہیں۔ ہماری مالکہ مکان دن کے کھانے کو ڈنر اور رات کے کھانے کو سپر کہتی تھی۔ ہندوستان میں عام طور پر ڈنر رات کے کھانے کو کہتے ہیں۔

پبلک کی سہولت کا خیال

پبلک کی سہولت کا خیال اس ملک میں بہت زیادہ ہے اگر ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ضرور ہے کہ کاروباری لوگوں کا قیمتی وقت ضایع ہوا کریگا۔ وقت کی یہ لوگ بہت قدر کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے وقت کو بچانے کی ترکیب اختراع کرتے رہتے ہیں۔ اس موقع پر تمثیلاً چند چیزوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سگریٹ کی مشین

بعض چیزیں مشین کے ذریعہ سے ملجاتی ہیں مثلاً سگریٹ۔ چاکلیٹ کشمش۔ بادام۔ وغیرہ شام کو چھ بجے کے بعد دکانیں چونکہ عام طور پر بند ہو جاتی ہیں اس لئے اس قسم کی مشینیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں اس مشین کی شکل ایک لیٹر بکس کی سی ہوتی ہے اندر سگریٹ کی ڈبیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اور اوپر سگریٹ کی قسم لکھی ہوتی ہے۔ عام طور پر چھ آنے والے ڈبیہ ہوتی ہے۔ ایک جانب مشین میں

سوراخ ہوتا ہے۔ اس میں نصف شلنگ کا سکہ ڈالدو اور خانہ جو سامنے کی طرف ہے اسے کھینچ لو۔ اس خانہ میں ڈبیہ رکھی ہوگی۔ سگریٹ یہاں بہت اچھا ہوتا ہے۔ زیادہ تر گولڈ فلیک اور پلیرس وغیرہ پیتے ہیں۔ سیزر کوئی نہیں جانتا۔ یہاں کا گولڈ فلیک اچھا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جو مستعمل ہے وہ ادنیٰ قسم کا ہے۔ سگار بہت مہنگا ہوتا ہے۔ میں نے ایک مشین جوتہ پوچھنے والی لندن کے کسی اسٹیشن پر دیکھی ہے جس میں ایک برش چرخی نما لگا ہوا تھا۔ ایک پنس اس میں ڈالکر اگر پاؤں اندر کردو تو جوتہ پر برش ہوجاتا ہے۔

ٹیلیفون

جگہ بہ جگہ ٹیلیفون موجود ہے۔ کوئی ہوٹل۔ کوئی رسٹوران اور کوئی دکان اس سے خالی نہیں۔ یہ تو خانگی ٹیلیفون ہوئے مگر عوام کے استعمال کے لئے بکثرت پبلک ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں پر خواہ وہ زمین کے اوپر ہوں یا زمین کے نیچے یہ چیز موجود ہے۔ بازاروں میں جابجا ٹیلیفون کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ لکڑی کا ایک چھوٹا کمرہ بنا ہوا ہے۔ اکثر مقامات پر متعدد کمرے مسلسل بنے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں ایک ٹیلیفون لگا ہوا ہے۔ بات کرتے وقت کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا جاتا ہے تاکہ اطراف کے غل وشور کی وجہ سے ہرج واقع نہ ہو۔ تین منٹ کے لئے بات کرنے کی فیس دو پنس ہے۔ اجنبی آدمی کو چاہیئے کہ پہلے اس کی ترکیب بخوبی سمجھ لے ورنہ پریشانی ہوگی۔ مجھے ہمیشہ سے ٹیلیفون پر بات کرنی نہیں آتی۔ کچھ وحشت ہونے لگتی ہے اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ لندن میں اور بھی مشکل ہوئی۔ ٹیلیفون کے پہلو میں طریقہ استعمال بتانے کے لئے ایک نوٹس لگا ہوا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے۔ دو پنس لیکر سوراخ میں ڈالدو۔ پھر ریسیور اٹھاؤ اس وقت ٹیلیفون آفس سے ملا پاؤ گے۔ ملازم لڑکی دریافت کریگی کس نمبر سے

بات کرنا چاہتے ہو - نمبر کا یاد رکھنا لازمی ہے - اگر معلوم نہ ہو تو ڈائرکٹری دیکھ سکتے ہو جو وہیں لٹکی رہتی ہے - ہمارے ہاں تو کام یوں بھی نکل جاتا ہے کہ فلاں صاحب کے مکان سے ٹیلیفون ملا دو لیکن یہاں نمبر یاد نہ ہو تو کوشش بے سود ہے - ٹیلیفون کے اغراض کے لئے حلقے مقرر کر دئے ہیں - نمبر کے ساتھ حلقہ کا نام لینا ضروری ہے - مثلاً ہمارے مکان کے ٹیلیفون کا پتہ یہ تھا (سیڈن ہیم ۷۶۷۲) یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نمبر بتلاتے وقت ہر ہندسہ کو الگ الگ بولنا چاہیئے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ سات ہزار چھ سو بہتر یا چھتر بہتر بلکہ یوں کہنا پڑے گا - نمبر سات - چھ - سات - دو - یہ طریقہ اس لئے ہے کہ نمبر سمجھنے میں غلطی واقع نہ ہو - نمبر بتلا دینے پر دفتر والی لڑکی ٹیلیفون ملا دیگی

اگر وہاں وہ آدمی موجود ہے جس سے بات کرنی مطلوب ہے تو بات کرنے سے پہلے ایک اور کام کرنا پڑتا ہے - ٹیلیفون کے پہلو میں دو بٹن لگے ہوئے ہیں - ایک پر (A) اور دوسرے پر (B) لکھا ہوگا - ملازم لڑکی بات نہیں کرنے دیگی جب تک کہ بٹن (A) نہ دبا دیا جائے - اس بٹن کو دبا دینے سے وہ پیسے جو سوراخ میں ڈالے گئے تھے ٹیلیفون کے خزانے میں جمع ہو جائیں گے - پیسوں کے جانے کی آواز بھی آتی ہے - یہ عمل کر دینے کے بعد پیسے کسی حالت میں واپس نہیں ملسکتے - البتہ اگر بٹن (A) دبانے سے قبل یہ معلوم ہو جائے کہ بات کرنے والا جگہ پر نہیں ہے یا ٹیلیفون کی لائن مصروف ہے تو ایسی صورت میں بٹن (B) دبا دینا چاہیئے - دونوں پیسے کھٹ سے باہر نکل آئیں گے گویا تمہاری رقم تم کو واپس دیدی گئی - مجھ کو شروع شروع میں بڑی غلط فہمیاں ہوتی رہیں اکثر مجھ کو بازار سے اپنی مالکہ مکان کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہوتی تھی - ایک روز لندن کے کسی بازار سے مالکہ مکان کو میں اطلاع دینا چاہتا تھا کہ کھانا باہر کھاؤنگا - اس وقت تک مجھ کو ٹیلیفون سے

زیادہ واقفیت نہیں ہوئی تھی - پیسے تو میں نے ڈال دیے تھے لیکن بات کرتے وقت ملازم لڑکی نے مجھکو روک دیا - اصل میں وہ کہتی تھی کہ پہلے بٹن (A) دبا لو بعد کو بات کرنا - کسی وجہ سے یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی - میں بار بار اس سے مطلب پوچھتا تھا - بالاخر اس نے جھنجھلا کر کہا کہ میں سیدھی سادھی انگریزی بول رہی ہوں تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو مجبوری ہے - میں نے پریشانی میں بٹن (B) دبا دیا - پیسے واپس نکل آئے - بڑی کوفت ہوئی - میں پیسے لیکر واپس جانے والا ہی تھا کہ اس لڑکی نے گھنٹی بجائی - میں نے رسیور کان کو لگایا تو اس نے کہا تم واپس کیوں جاتے ہو - دوبارہ پیسے ڈالو اور بٹن (A) دباؤ میں ٹیلیفون ملائے دیتی ہوں - اس دفعہ بات سمجھ میں آگئی - پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہوئی -

پبلک بیت الخلاء

جس طرح ٹیلیفون کثرت سے لگے ہوئے ہیں - اسی طرح بیت الخلاء، اور پیشاب خانے بھی جا بجا موجود ہیں - عورتوں کے واسطے الگ اور مردوں کے لئے الگ - اکثر ان مکانات میں منہ ہاتھ دھونے کا سامان بھی ہوتا ہے - خوبی یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی تولیہ استعمال کر لیا جائے تو خادم اس کو وہاں سے اٹھا لیگا - اور اس کی جگہ دوسرا پاک ستھرا تولیہ رکھ دیگا - منہ ہاتھ دھونے کی فیس تین آنے کے قریب لیجاتی ہے - پیشاب خانہ کا استعمال بلا معاوضہ ہے - البتہ بیت الخلاء کے واسطے دو پنس کا سکہ دروازہ کے سوراخ میں ڈالنا پڑتا ہے - تا وقتیکہ یہ سکہ نہ ڈالا جائے دروازہ نہ کھلیگا - پبلک بیت الخلاء میں صرف ایک چیز تکلیف دہ ہے وہ یہ کہ پانی کا بندوبست نہیں ہوتا -

گم شدہ مال کی بازیافت

گم شدہ مال کی بازیافت کا انتظام بھی بہت معقول ہے - ٹیکسی - موٹر بس اور دوسری کرایہ کی سواریوں میں اگر

کوئی چیز بھول جاؤ تو اس کے متعلق وکٹوریہ امبینک منٹ پر نیو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دفتر میں دریافت کرو۔ اغلب ہے کہ چیز ملجائے گی۔ تین مہینے تک مالک کا انتظار کرکے چیز اس گاڑی والے کو دیدی جاتی ہے۔ جس نے داخل کی تھی۔ اس طریقہ میں خوبی یہ ہے کہ گاڑی والے آیندہ کی امید پر بھولی ہوئی چیزیں دفتر میں داخل کر دیتے ہیں۔ اگر بجائے اس عمل کے حکومت خود اس مال کو لے لیا کرے تو نتیجہ اتنا اچھا نہ ہوگا۔ چنانچہ یہ معلوم ہوا ہے کہ جس قدر مال سالانہ اس دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا تقریباً نصف مالکوں کو واپس ملتا ہے۔ بقیہ گاڑی والوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مالک کو چیز واپس کرتے وقت ایک قلیل رقم اس سے وصول کرکے مال داخل کرنے والے کو دیجاتی ہے۔

ذرایع آمد ورفت

آمد ورفت کے ذرایع بھی بہت وسیع ہیں۔ اتنے بڑے شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ زمین کے اوپر اور نیچے دن بھر سینکڑوں ریلیں آتی جاتی رہتی ہیں۔

زمین کے نیچے کی ریل

زمین کے نیچے چلنے والی ریل کو انڈر گراونڈ ریلوے کہتے ہیں۔ سارے لنڈن میں زمین کے نیچے ان ریلوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ بعض مقامات پر تو دریا کے نیچے سرنگ لگا کر ریل لے گئے ہیں۔ ہر جگہ اسٹیشن موجود ہے۔ جہاں گہرائی زیادہ ہے وہاں برقی جھولے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے علحدہ فیس نہیں لی جاتی بعض اسٹیشنوں پر ایک نئی ترکیب آمد ورفت کی دیکھی گئی۔ مثلاً پکاڈلی کے انڈر گراونڈ اسٹیشن میں دو جگہ چلتے ہوئے زینے ہیں جن کو موونگ اسٹیرس کہتے ہیں کثرت ٹرافک سے جو ہجوم ہو جاتا ہے اس کی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی ہے۔ یہ زینے بجلی کی قوت سے چلتے رہتے ہیں۔ ایک زینہ سے لوگ نیچے

اترتے ہیں - اور دوسرے سے اوپر جاتے ہیں - ہر وقت زینوں کو چلتا ہوا دیکھو گے اوپر کی سیڑھی پر آدمی کھڑا ہو جائے تو خود بخود نیچے پہونچ جائے گا - یہی طریقہ نیچے سے اوپر جانے کا ہے - مسلسل لوگوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے - جن کو جلدی ہوتی ہے وہ ان زینوں پر خود بھی چلتے جاتے ہیں - یہ زینے اس قدر چوڑے ہوتے ہیں کہ تین آدمی برابر پہلو بہ پہلو کھڑے ہو سکتے ہیں - یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک گھنٹہ میں تقریباً گیارہ ہزار آدمی ایک زینہ کو استعمال کر سکتے ہیں - انگلستان میں یہ زینے ۱۹۱۱ء میں جاری ہوئے لیکن ریل زمین کے نیچے ۱۸۶۳ء سے چلتی ہے - ان ریلوں کی صحیح رفتار مجھے معلوم نہیں - مگر احساس یہ ہوتا ہے کہ بہت تیز جاتی ہیں اسٹیشن بہت صاف ستھرے - روشن اور ہوادار ہیں - پکاڈلی کا اسٹیشن بالخصوص بہت اچھا ہے - میوے اور سگریٹ وغیرہ کی دکانیں بھی ان اسٹیشنوں پر ہوا کرتی ہیں - بعض اسٹیشنوں پر رستوراں بھی ہیں - کرایہ فاصلہ کے لحاظ سے لیا جاتا ہے - مگر ایک آنہ سے کم نہیں ہوتا - اسٹیشن پر ٹکٹ گھر تو ضرور ہوتا ہے لیکن بعض بڑے اسٹیشنوں پر مشین لگی ہوئی ہیں - ہر مشین پر ٹکٹ کی قیمت لکھی ہوتی ہے اور فہرست ان مقامات کی لگی رہتی ہے - جہاں اس ٹکٹ سے جا سکتے ہو - مقررہ قیمت ڈالنے پر ٹکٹ خود بخود نکل آتا ہے - نئے آدمی کو ان اسٹیشنوں پر کسی قدر پریشانی ضرور ہوتی ہے - لیکن اگر غور و سمجھ سے کام لیا جائے تو کوئی دشواری نہ ہوگی بڑے اسٹیشنوں میں راستے کسی قدر پیچیدہ اور متعدد پلیٹ فارم ہیں - دیواروں پر نقشے لگے رہتے ہیں - اور راستہ معلوم کرنے کے لئے ہدایتیں لگی ہوئی ہیں - ہر تیسرے منٹ پر ایک ریل آتی ہے - یہ ریل کس طرف جائے گی - ٹھیرے گی یا نہیں اس کے متعلق بجلی کی روشنی کے ذریعہ نوٹس دیتے رہتے ہیں - الغرض سہولت کا ہر طرح انتظام کیا گیا ہے - ان گاڑیوں میں بھی درجہ اول اور سوم ہوتا ہے -

بعض دفعہ ریل تبدیل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک گائڈ بک اگر خرید لو تو بڑی سہولت رہے گی۔ صبح کے دس بجے اور شام کو چھ بجے کے قریب مسافروں کی بڑی کثرت رہتی ہے۔

دانایاں فرنگ کو دیکھو زمین کے نیچے زمین کے اوپر و نیز عالم بالا میں انھوں نے کیا کچھ ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ عقل بھی کیسی نعمت خداداد ہے۔ اسی نے انسان کو اشرف المخلوقات کا رتبہ بخشا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان نہ صرف حیوانات کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے بلکہ آپس میں بھی انفرادی طور پر بھی یہ چیز ایک دوسرے پر برتری دیتی ہے اور بین الاقوامی دور میں ہار جیت کا دار و مدار بہت کچھ اسی کے طریقہ استعمال پر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوروپین اقوام میں عقل قدرتی طور پر ہم سے زیادہ ہوتی ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ خداوند کریم نے ہندوستانیوں کو بھی عقل کافی مقدار میں عطا کی ہے۔ یوروپین اقوام کو کچھ خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ یہ لوگ اپنی عقل کو مفید کاموں میں صرف کرتے رہتے ہیں ہماری کیفیت اس کے برعکس ہے۔

معمولی ریل زمین کے اوپر اطراف لندن میں بجلی کی قوت سے متعدد لوکل ٹرینیں چلتی ہیں۔ یہ سب ریلیں رات کے بارہ بجے بند ہو جاتی ہیں۔ لوگ عام طور پر تیسرے درجہ میں سفر کرتے ہیں۔ یہاں کا تیسرا درجہ ہمارے ہاں کے درجہ اول سے اچھا ہوتا ہے۔ سگریٹ پینے والوں کے لئے گاڑیاں الگ ہوتی ہیں۔ زنانہ اور مردانہ کی تخصیص نہیں ہے۔ عورت مرد سب ساتھ بیٹھتے ہیں

موٹر بس زمین دوز ریلوں کے علاوہ موٹر بس، ٹریم اور ٹیکسیوں کا کوئی حساب نہیں۔ موٹر بس لندن کے ہر حصہ میں چلتی ہے البتہ ٹریم صرف باہر کے حصوں میں جاری ہے۔ موٹر بس دو منزل کی زبردست گاڑی ہوتی ہے۔ ان کا بھی

ایک جال تمام شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ گائڈ بک ہر جگہ ملجاتی ہے۔ بعض موٹروں کی اوپر کی منزل کھلی ہوئی ہے اور بعض میں ڈھکی ہوئی۔ سگریٹ پینے والوں کے لئے یہی سہولت بخش ہے۔ کیونکہ نیچے کی منزل میں سگریٹ پینے کی ممانعت ہے اس میں شبہ نہیں کہ لندن کی سیر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ موٹربس ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اوپر کی منزل پر بیٹھو۔ بالخصوص موٹربس (E.11) جو وکٹوریہ اسٹریٹ سے لیورپول اسٹریٹ تک جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے نہایت مفید ہے۔ لندن کے بہترین حصہ میں سے یہ گذرتی ہے۔ کرایہ فاصلہ کے لحاظ سے لیتے ہیں لیکن ایک آنہ اقل ترین ہے۔ یہ سواری اتنی مقبول ہے کہ اکثر اوقات مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جگہ نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ معلوم ہوا ہے کہ سالانہ اسّی کروڑ آدمی ان میں سوار ہوتا ہے اور اب تک ایک روز میں زیادہ سے زیادہ پچیس لاکھ آدمی ان میں بیٹھتے ہیں۔ یہ گویا ایک روز میں ٹرافک کا ریکارڈ ہے۔ ہر گاڑی کی پیشانی پر تختی لگی ہوتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ کہاں جارہی ہے۔ اور راستہ میں کونسے مقامات پڑیں گے جابجا ان گاڑیوں کے ٹھیرنے کے لئے اسٹیشن بنے ہوئے ہیں وہاں ضرور ٹھیرتی ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اشارہ کرنے پر ٹھیرتی ہے۔ ہر گاڑی پر نمبر رہتا ہے مقررہ نمبر کی گاڑیاں مقررہ مقامات پر جاتی ہیں۔ یہی کیفیت ٹریم گاڑیوں کی ہے۔ ساڑھے دس اور ساڑھے چار بجے کے درمیان کرایہ دو آنہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ان اوقات کے بعد پانچ آنہ تک ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی ٹیکسیاں کثرت سے ہیں۔ ان کے کرایہ کی کیفیت یہ ہے کہ دس منٹ کے اندر ایک میل کے واسطے ایک شلنگ لیتے ہیں۔ اس کے اوپر ہر چوتھائی میل اور ڈھائی منٹ کے واسطے تین پنس لیں گے۔ اگر تیسرا آدمی بیٹھیگا تو اس کا کرایہ نو پنس علیحدہ لیا جائے گا اور اگر کوئی سامان موٹر کے باہر رکھو تو فی پیکٹ تین

پہن لیں گے - کرایہ کے علاوہ موٹر والے کو ٹپ دینے کا رواج بھی ہے - بہرحال یہ سواری مہنگی ضرور پڑتی ہے - ہر ٹیکسی میں کرایہ کا میٹر لگا ہوتا ہے - اس پر ایک جھنڈی ہوتی ہے - سواری کی حالت میں یہ جھنڈی نیچے کر دی جاتی ہے - اگر ایسا نہ کرے تو میٹر بند رہے گا - میٹر اگر خراب ہوگیا ہے تو موٹر والا عوام کی اطلاع کے لئے ایک دھجی اس پر باندھ دیگا - الغرض نقل وحرکت کے لئے ہر قسم کی سہولت موجود ہے -

ٹریفک کا انتظام

بازاروں میں اگرچہ ٹریفک کی کثرت رہتی ہے لیکن پولس کا انتظام اس قدر اچھا ہے کہ حادثات بہت کم ہوتے ہیں - علاوہ حسن انتظام کے یہ بات بھی ضرور ہے کہ یہاں کے لوگ قاعدہ اور قانون کے پابند ہوتے ہیں - بچپن ہی سے تربیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ ڈسپلن ان کی فطرت ثانی ہوگئی ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک پولس کانسٹیبل ہزار ہا آدمیوں اور موٹروں کو قابو میں رکھ سکتا ہے - راستہ چلنے اور سڑک عبور کرنے کے لئے جو کچھ قواعد اور ہدایات نافذ ہیں انکی پابندی سب لوگ کرتے ہیں - پولس کانسٹبل کا فرض صرف اشارہ کر دینا ہے - باقی سب کام خود بخود ہوتا رہتا ہے - سڑکوں پر جہاں ٹریفک زیادہ رہتا ہے - چھوٹے چھوٹے چبوترے بنے ہوئے ہیں - اور نوٹس لگا ہوا ہے کہ اس مقام پر سے سڑک کو عبور کرو - ماسوا اس کے اکثر مقامات پر زمین کے نیچے راستہ بنا دیا ہے - جس کے ذریعہ آدمی سڑک کی دوسری طرف باسانی نکل سکتا ہے - اجنبی آدمی کو احتیاط کی بہت ضرورت ہے - اول تو ہمیشہ فٹ پاتھ پر راستہ چلنا چاہیئے - نیچے اترنے میں خطرہ ہے - دوسرے یہ کہ سڑک کو عبور کرنے کے لئے بڑی احتیاط اور قواعد کی پابندی لازمی ہے - کیونکہ موٹریں بالکل خاموشی کے ساتھ دوڑتی رہتی ہیں - ہارن عام طور پر نہیں بجاتے بلکہ خاص موقعوں پر اس کا استعمال کرتے ہیں - ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے ورنہ بازار میں شور وغل کی وجہ سے کچھ پتہ نہ چلیگا کہ کس طرف سے آواز آئی - پہلو کی گلیوں میں سے موٹریں اکثر چپکے سے آجاتی ہیں

اس لئے اول دیکھ لینا چاہیئے کہ کوئی موٹر تو نہیں آرہی ہے

اسٹیشنوں پر ہجوم

اگر لندن کے ہجوم کا اندازہ کرنا ہو تو واٹرلو اور لیور پول اسٹریٹ اسٹیشنوں پر صبح یا شام کے وقت جاؤ اور دیکھو کس قدر مخلوق اطراف سے کاروبار کی خاطر لندن میں آتی ہے۔ اسٹیشن تو متعدد ہیں لیکن وہ اسٹیشن جن کا اوپر نام لیا گیا خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ اعداد و شمار سے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ واٹرلو اسٹیشن پر روزانہ بارہ سو اکسٹھ ریلیں اور ایک لاکھ چالیس ہزار مسافر آتے جاتے ہیں۔ بلحاظ وسعت بھی اسٹیشن سب سے بڑا ہے۔ متعدد پلیٹ فارم ہیں جن کی مجموعی لمبائی (۱۴۶۲۸) فٹ بتلائی جاتی ہے۔ لیور پول اسٹریٹ اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد کا اوسط دو لاکھ بیالیس ہزار روزانہ ہے البتہ ریلیں واٹرلو اسٹیشن کی نسبت کچھ کم ہیں۔ جو لوگ دوسرے اسٹیشنوں سے اور دیگر وسائل سے آتے ہیں وہ اسکے علاوہ ہیں۔

ریلوں کی سہولت

ریل کے سفر میں بھی بڑی سہولتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک خاص رعایت تذکرہ کے لائق یہ ہے کہ ہر اتوار کو اسپیشل ٹرینیں چھوڑی جاتی ہیں۔ ایک روز کی واپسی کا ٹکٹ کم نرخ پر ملتا ہے۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لندن کو واپس ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اتوار کے دن ہزارہا آدمی محض تفریح کی خاطر سمندر کے کنارہ کے مقامات پر جایا کرتے ہیں۔ یہاں کی ریلیں عام طور پر تیز رفتار ہوتی ہیں۔ چنانچہ انتہائی رفتار ساڑھے اکسٹھ میل فی گھنٹہ ہے۔ ایک مشہور ریل لندن سے ایڈنبرا تک ۳۹۲ میل کی مسافت بغیر کہیں ٹھیرے ہوئے طے کرتے ہے۔ سنا ہے کہ دنیا میں اس نوعیت کی کوئی ریل نہیں ہے۔

لندن کی دوکانیں

اجنبی آدمی کے لئے لندن کے بازاروں میں بہت کچھ تفریح کا سامان ہے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ۔ ریجنٹ اسٹریٹ

پیکاڈلی اوران کے گرد و نواح میں بڑی بڑی دکانیں آراستہ و پیراستہ دیکھنے کے لائق ہیں اس خوبی سے دکان کو سجاتے ہیں کہ گھنٹوں کھڑے دیکھا کرو اور دل نہ بھرے۔ دکانوں کے سامنے کانچ کے بڑے بڑے شوکیس ہوتے ہیں جن میں دکان کی اشیار بطور نمایش لگا دیتے ہیں اور ہر چیز کی قیمت بھی لگی رہتی ہے۔ یہ طریقہ لندن کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام یورپ میں دکانوں کی یہی کیفیت ہے۔ لندن چونکہ تجارت کے لحاظ سے تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے اس لئے دکانیں یہاں زیادہ ہیں اور اچھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گوشہ مغربی میں چیزیں کسی قدر گراں ہوتی ہیں۔ لیکن بہت سی دکانیں یہاں ایسی بھی ہیں جن میں معمولی قیمت پر اشیار فروخت ہوتی ہیں۔ وہ دکانیں جن کو اسٹور کہتے ہیں۔ بہت دلچسپ ہیں۔ مہنگی سستی۔ چھوٹی بڑی ہر قسم کی چیز اسٹور میں خرید سکتے ہو۔ اس نوعیت کے متعدد اسٹور ویسٹ اینڈ میں ہیں مثلاً اکسفورڈ اسٹریٹ میں سلف ریجز اور براپٹن روڈ میں ہیرڈس یہ دکانیں کئی منزل کی وسیع عمارتوں میں ہیں۔ برقی جھولے آمد رفت کے لئے لگے ہوئے ہیں دکان کیا ہے بہت بڑا مارکٹ ہے۔ جو چیز چاہو موجود ہے۔ سلف ریجز کے ہاں ایک منزل پر بہت بڑا رسٹوراں بھی ہے۔ تاکہ گاہکوں کو کھانے کے لئے بازار میں جانے کی ضرورت نہ ہو۔ کھانا اچھا اور واجبی دام پر ملتا ہے۔ اسی دکان میں ایک کمرہ ایسا ہے۔ جہاں بیٹھ کر کچھ آرام بھی لے سکتے ہو یا خطوط وغیرہ لکھ سکتے ہو۔ میزیں لگی ہوئی ہیں۔ قلم دوات اور کاغذ بھی مفت ہے۔ اس دکان کی آخری منزل پر سے لندن کا منظر چاروں طرف بہت اچھا ہے۔ وہیں ایک رفرشمنٹ دکان بھی ہے۔ یہاں اکثر مجمع رہتا ہے۔ برقی جھولوں پر نوجوان حسین لڑکیاں مقرر ہیں جن کو خوبصورت وردی مردانہ وضع کی پہنائی جاتی ہے دکان پر کام کرنے والوں میں بھی عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کسی کو کچھ خریدنا ہو یا نہ ہو لیکن ان دکانوں

ایسٹ بورن گیا تھا۔ بہت پرتکلف گاڑی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ مفصلات کی سیر اچھی طرح ہوتی ہے۔

موٹر چلانے کا لائیسنس

میں نے موٹر چلانے کا ایک لائیسنس لے لیا تھا۔ یہاں خود چلانے کے لئے کرایہ پر موٹریں ملجاتی ہیں۔ بالعموم ایک پونڈ روزآنہ پر دیتے ہیں۔ پٹرول اس سے خارج ہے لائیسنس بہت آسانی کے ساتھ ملجاتا ہے۔ ایک مطبوعہ فارم ہوتا ہے جو کسی ڈاکخانہ سے ملجائے گا اس میں چند سوالات ہوتے ہیں جن کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ موٹر چلانی آتی ہے یا نہیں۔ فارم کی خانہ پری کر کے متعلقہ دفتر میں پانچ شلنگ کے پوسٹل آرڈر یعنے منی آرڈر کے ساتھ بھجوا دو۔ اگر دفتر والوں کو اطمینان ہوجائے تو لائیسنس تمہارے پتہ پر وہ خود ہی بھجوادیں گے۔ میں نے بھی ایک درخواست ڈاک کے ذریعہ مقررہ فیس کے ساتھ بھجوادی تھی۔ غالباً چوتھے روز ڈاک کے ذریعہ لائیسنس مکان پر آگیا۔ نہ کسی نے کچھ پوچھا اور نہ کسی نے امتحان لیا۔

خود چلانے کے واسطے کرایہ کی موٹر

فارسٹ ہل کے قریب ہی دو ایک موٹر خانے ایسے تھے جہاں موٹر کرایہ پر مل سکتی تھی۔ ان کے پاس ایک مطبوعہ فارم ہوتا ہے جس کی خانہ پری کرنی پڑتی ہے۔ معمولی سوالات ہوتے ہیں ایک قلیل فیس گاڑی کو بیمہ کرنے کے واسطے بھی لیتے ہیں۔ مجھے کئی دفعہ موٹر کرایہ پر لینے کا اتفاق ہوا۔ ہر دفعہ مختلف موٹر خانوں سے لی۔ صرف ایک موٹر والے نے پوچھا کہ تم کو موٹر چلانی آتی ہے یا نہیں۔ میں امتحان لینا چاہتا ہوں محض لائیسنس سے میرا اطمینان نہیں ہوتا چنانچہ وہ میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا اور شہر کے کچھ حصہ میں ہم نے گشت لگایا۔ جب اس کو اطمینان ہوگیا تو موٹر دیدی۔ ایک موٹر والے نے اطمینان کے لئے صرف یہ سوال کیا کہ تمہارے ملک میں سیدھے ہاتھ پر چلنے کا طریقہ ہے یا بائیں ہاتھ پر۔ جب اس کو معلوم

ہوا کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی بائیں جانب کا قاعدہ ہے تو وہ مطمئن ہو گیا۔ چونکہ یورپ کے بعض ممالک میں سیدھے جانب چلنے کا طریقہ ہے اس لئے موٹر والے کو فکر تھی کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اس کی فکر حق بجانب تھی کیونکہ جرمنی وغیرہ ممالک میں مجھکو خود بعض دفعہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر میں یہاں موٹر چلاؤں تو باوجود احتیاط کے دن میں کئی دفعہ حادثہ ہو گا۔ بلکہ اکثر یہ بھی ہوا کہ جب ہماری ٹیکسی والے نے سیدھی جانب سے موٹر کو نکالا تو میرا قصد فوراً اس کو روک دینے کا ہوا مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہاں کا طریقہ یہی ہے۔ میں کرایہ کی موٹر ایک روز کے واسطے لیا کرتا تھا۔ رات کو بارہ بجے تک واپسی ہوتی تھی۔ موٹر کو دکان پر پہنچا دینا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ایک روز میں سو ڈیڑھ سو میل کا چکر بخوبی ہو جاتا ہے۔ لندن کے قریب سمندر کے کنارہ جو مقامات ہیں۔ اکثر میں اس طرف چلا جایا کرتا تھا۔

ایک بے لطف سیر

ایک روز بارش کی وجہ سے کسی قدر بے لطفی ہو گئی۔ صبح کو نو بجے کے قریب ہم لوگ فارسٹ ہل سے ہیسٹنگس کی طرف روانہ ہوئے۔ غلام یزدانی صاحب اور میرے ایک دوست سراج الحق ساتھ تھے۔ موٹر خانہ کا ایک لڑکا بھی ساتھ تھا۔ جو مجھکو موٹر خانہ میں ملا تھا۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے وہ بیکار تھا۔ مجھکو خیال ہوا کہ موٹر کی مشین سے واقف اگر کوئی آدمی ساتھ رہے تو اچھا ہے۔ میں نے اس لڑکے سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مجھکو آج چھٹی ہے۔ اس لئے بلا معاوضہ بھی تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوں۔ صرف اس قدر مہلت دو کہ مکان جا کر اپنی ماں کو اطلاع دیدوں اور کپڑے تبدیل کر لوں۔ اس کو میں نے مکان کا پتہ بتلا دیا۔ وہ نو بجے تیار ہو کر آ گیا۔ کارخانہ میں جب اس کو دیکھا تھا تو بہت معمولی حالت میں تھا۔ گھر جا کر کچھ اس طرح تبدیل ہو کر آیا کہ مجھکو پہچاننے میں تکلف ہونے لگا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی فیشن ایبل

آدمی کا لڑکا ہے ۔ لندن سے چلتے وقت کسی قدر ابر آگیا تھا اور خفیف بوندا باندی بھی تھی ۔ یہاں موسم کا چونکہ اعتبار نہیں ہوتا ۔ اس لئے ہم کو یہ بھی امید تھی کہ کچھ دیر میں مطلع صاف ہو جائے گا ۔ راستہ میں کہیں بارش زیادہ ملی اور کہیں کم لیکن اس قدر ضرور ہوا کہ موٹر زیادہ تیز نہ چلا سکے ۔ نصف راستہ سے کچھ زیادہ دور جانے کے بعد بارش زور دار ہونے لگی ۔ لندن میں اتنی زور کی بارش اس روز میں نے پہلی دفعہ دیکھی یہاں بالعموم ہلکی بارش ہوا کرتی ہے ۔ لب سڑک ایک رستوراں تھا ۔ بارش سے بچنے کی خاطر اور کچھ کھانے کے لئے بھی یہاں ٹھیر گئے ۔ بارش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی حتیٰ کہ مغرب کا وقت ہو گیا اور ہم لوگ اس سوچ میں پڑ گئے کہ لندن واپس ہوں یا سیدھے ہیسٹنگس جائیں ۔ اس مقام سے لندن تقریباً چالیس میل تھا ۔ بارش اور اندھیرے کی وجہ سے میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس وقت چالیس میل موٹر چلاتا ہوا جاؤں ۔ غلام یزدانی صاحب اور سراج الحق کو لندن میں ضروری کام تھا ۔ اس لئے یہ طے پایا کہ ہم لوگ سیدھے ہیسٹنگس جائیں جو نسبتاً قریب تھا ۔ وہاں سے ریل کے ذریعہ یہ دونوں حضرات لندن واپس ہو جائیں اور میں رات کو کسی ہوٹل میں قیام کر کے صبح کو لندن واپس آؤں ۔ اگرچہ تنہا شب باشی کے لئے دل نہیں چاہتا تھا لیکن صورت مجبوری کی تھی بالآخر آٹھ بجے رات کو ہم ہیسٹنگس پہونچے ۔ ایک ہوٹل میں ٹھیرنے کا بندوبست کیا قریب میں ایک موٹر خانہ تھا ۔ جہاں کرایہ دیکر رات کے لئے موٹر رکھی گئی اور ایک جگہ اس لڑکے کے قیام کا بندوبست کیا جو ساتھ تھا ۔ اس نے لندن اپنی ماں کو ٹیلیفون کے ذریعہ واقعات سے اطلاع دیدی ۔ اس اہتمام کے بعد ہم اسٹیشن گئے ۔ اتفاق سے لندن جانے والی ریل تیار تھی ۔ غلام یزدانی صاحب اور سراج الحق لندن چلے گئے ۔ بارش کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ میرے پاس چھتری بھی نہیں تھی ۔ لوگ بارش سے دکانوں پر پناہ لیتے پھر رہے تھے ۔ میں بھی اسی طرح بمشکل تمام اپنے ہوٹل کو پہونچا ۔ سیر کا کوئی موقع نہ تھا صبح کو اٹھا

تو بارش ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا۔ کہ تمام رات پانی پڑتا رہا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر میں لندن واپس ہو گیا۔ تمام راستے پانی پڑتا رہا۔ بڑی بے لطفی رہی۔

ایک ناخواندہ مہمان

لندن کے قریب راستہ میں ایک عورت بھیگی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے موٹر روکنے کے لئے اشارہ کیا میں نے موٹر روک لی تو اس نے کہا میں بالکل بھیگ گئی ہوں اور ابھی دور جانا ہے۔ کیا تم مجھ کو موٹر میں جگہ دے سکتے ہو۔ میں نے کہا بہت خوشی کے ساتھ چنانچہ وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں سے پانی بہتا تھا اس لئے میں نے اس سے کہا شاید تم کو اندر کی سیٹ پر آرام ملیگا لیکن وہ اندر بیٹھنے پر راضی نہ ہوئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ فارسٹ ہل سے آگے جو محلہ ڈیلچ ہے وہاں جائے گی۔ بڑی باتونی عورت تھی۔ کہنے لگی تم اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ تمہارا وطن کونسا ہے۔ میں نے کہا میں اجنبی نہیں ہوں بلکہ خاص لندن کا باشندہ ہوں۔ کہتی تھی یہ ناممکن ہے۔ تم مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے میں نے کہا اچھا تم ہی بتاؤ کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا یا تو اسپین کے ہو یا اٹلی کے۔ میں نے کہا غلط۔ اس پر اس نے کہا میں نہیں بتا سکتی۔ اب تم خود ہی بتاؤ۔ مجھ سے ہندوستان کا لفظ سنکر کہنے لگی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کیونکہ میں نے جن ہندوستانیوں کو دیکھا ہے وہ سب کالے ہیں۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ ہندوستان میں کالے اور گورے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پوچھتی تھی کہ تم کو یہاں آکر کتنا عرصہ ہوا اور کیا پہلی دفعہ آئے ہو۔ میں نے کہا ایک مہینہ سے یہاں ہوں۔ اور پہلی دفعہ آیا ہوں کہنے لگی تم نے پھر مجھ کو دھوکا دینے کی کوشش کی کیونکہ تمہاری انگریزی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس ملک میں عرصہ سے رہتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں تعلیم یافتہ سب لوگ انگریزی اچھی طرح جانتے ہیں۔ الغرض اس قسم کی گفتگو اس کے ساتھ ہوتی رہی۔ یہ عورت کسی تھیٹر میں ملازم تھی۔ کہتی تھی میرے تھیٹر میں ضرور آنا

راستہ میں ایک جگہ اس نے کہا مجھ کو سردی معلوم ہوتی ہے کسی دکان پر برانڈی پینا چاہتی ہوں مجھ کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ ایک دکان پر اس کو میں نے اتار دیا وہ سمجھتی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ شریک رہوں گا۔ لیکن میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا اور اس کو وہیں چھوڑ دیا

موٹر والے کا ناجایز مطالبہ

موٹر والے سے یہ وعدہ ہوا تھا کہ علی الصباح اس کی موٹر واپس کردی جائے گی۔ مگر میں گیارہ بجے لندن پہونچا موٹر والا باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے لڑکے کے حوالہ موٹر کردی اور گھر واپس آگیا۔ تین روز بعد موٹر والے نے ایک بل روانہ کیا کہ مقررہ اوقات سے زیادہ تمھارے پاس موٹر رہی۔ اس کی بابتہ ایک پونڈ مزید دینا پڑیگا۔ میں نے اس پر ایک قانونی اعتراض کر کے واپس کردیا۔ واقعہ یہ تھا کہ موٹر دیتے وقت موٹر والے نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس میں چار گیلن پٹرول بھرا ہوا ہے۔ میں نے اس کے کہنے پر اعتبار کیا۔ اس وقت ناپ کر نہیں دیکھا اور چار گیلن پٹرول کی قیمت اس کو دیدی۔ لیکن دس بارہ میل گئے ہوں گے کہ موٹر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ پٹرول نہیں ہے۔ نصف میل کے قریب پٹرول کے لئے لڑکے کو بھیجنا پڑا۔ اس میں وقت بہت کچھ ضایع ہوا۔ میں نے بل پر اعتراض کیا کہ تمھاری غلط فہمی کی وجہ سے ہمارا وقت ضایع ہوا اور تکلیف اٹھانی پڑی۔ تمھارا کام تھا کہ اطمینان کر کے پٹرول کے متعلق کہتے۔ تم پر نالش کیجائے تو ہرجانہ ایک پونڈ سے زیادہ دینا پڑیگا۔ لہذا یہ سمجھو کہ حساب برابر ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ غنیمت کہ موٹر خانہ کا لڑکا خود گواہی کے لئے موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے خاموشی ہوگئی۔ اس کے بعد بھی موٹر کے ذریعہ میں کئی دفعہ ساحلی مقامات پر گیا۔

ساحلی مقامات

دو دفعہ ریل پر جانا ہوا۔ لندن کے جنوب میں متعدد مقامات سمندر کے کنارے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب ہیں

موٹر سے جانے میں سیر زیادہ ہوتی ہے۔ مضافات کے مناظر بہت دلکش ہیں۔ جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ سڑکیں جدید وضع کی بنی ہوئی ہیں۔ خاک کا نام نشان نہیں اتوار کے دن ہزار ہا موٹر سڑک پر چلتی ہے۔ جا بجا پٹرول کی دکانیں اور ریسٹوران موجود ہیں۔ جنگل کا تو نام ہی ہے۔ جس طرف دیکھو آدمی نظر آئیگا۔ سمندر کے کنارے کے مقامات بڑی رونق کے ہوتے ہیں۔ لوگ تبدیل آب و ہوا کے واسطے یہاں آکر رہتے بھی ہیں۔ چند مقامات کا ذکر جہاں اکثر میرا جانا ہوا ہے دلچسپیوں سے خالی نہ ہوگا۔ انگلستان کے جنوب مشرقی ساحل پر زیادہ مشہور اور مقبول تین مقامات ہیں اور یہ تینوں لندن سے قریب بھی ہیں۔

برائٹن

سب سے بڑا مقام برائٹن ہے جو لندن سے پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ میرے خیال میں یہ مقبول بھی سب سے زیادہ ہے۔ کثرت سے لوگ یہاں جاتے ہیں۔ اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ مقام صحت بخش مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوسرے مقامات کی نسبت یہاں کی آب و ہوا خشک ہے اور دھوپ بھی لندن سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صاحب بہادر دھوپ اور گرمی سے بچنے کی خاطر پہاڑی مقامات پر چلے جاتے ہیں مگر یہاں لوگ ان مقامات کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں دھوپ اور گرمی کی زیادتی ہو۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جو چیز ضرورت سے زاید ہوتی ہے اس سے آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور کمیاب چیز کی قدر کرتا ہے۔ کاش کہ ہندوستان کی کچھ گرمی انگلستان کو دیکر اس کے معاوضہ میں سردی لے سکتے۔ دھوپ کی تلاش یہاں کے لوگوں کو اس قدر رہتی ہے کہ اس بات کا باقاعدہ حساب رکھتے ہیں کہ کس سال کس مقام پر کتنے گھنٹے دھوپ رہی۔ جہاں دھوپ کے اوقات زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جگہ سب سے زیادہ مقبول ہو جاتی ہے۔ برائٹن میں کھیل کود اور تفریح کے اسباب بہت ہیں۔ ایک

مشرقی وضع کی عمارت رایل پویلین کے نام سے موسوم بہت خوبصورت ہے۔ اس عمارت کے گنبد اس وضع کے ہیں جیسے ہندوستان کی بعض درگاہوں پر پائے جاتے ہیں۔

ایسٹ بورن وغیرہ دوسرا مقام ایسٹ بورن ہے یہ برائیٹن سے اگرچہ چھوٹا ہے۔ لیکن بعض باتوں میں اس پر فوقیت رکھتا ہے۔ اچھے اچھے پارک اور سبزے کے میدان میلوں چلے گئے ہیں۔ سمندر کے کنارے عالیشان عمارتیں اور ہوٹل ہیں۔ اس کے قریب ہیٹینگس ہے جس کی آبادی ستر ہزار کے قریب ہو گی۔ اس سے ملحق ایک ہی سلسلہ میں دوسری آبادی سینٹ لیونارڈس کی ہے۔ اس نواح میں ایک چھوٹا مقام بکس ہل ہے۔ جس کی آبادی پچیس ہزار سے زیادہ نہ ہو گی۔ یہاں لڑکوں کے لئے مدارس اچھے ہیں۔ ان سب مقامات پر رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ بالخصوص اتوار کے دن مجمع زیادہ ہوتا ہے۔

سمندر کے کنارے جتنے مقامات ہیں وہاں ایک قسم کی عمارت ضرور ہوتی ہے جسے پیئر کہتے ہیں۔ سمندر میں دور تک اس عمارت کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جس کی شکل ایک جزیرہ نما کی سی ہوتی ہے۔ تین طرف پانی اور بیچ میں پیئر ہوتا ہے۔ اس عمارت میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اندر مختلف اقسام کی دلچسپیاں مہیا کی جاتی ہیں۔ کھانے پینے کی دکانیں۔ سینما اور ناچ گھر وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔

آئل آف وائٹ انگلستان کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے جس کو آئل آف وائٹ کہتے ہیں۔ مناظر قدرتی اور آب و ہوا کے لحاظ سے یہ حصہ ملک بھی اچھا مانا جاتا ہے۔ یہاں متعدد مقامات سمندر کے کنارے ہیں۔ جہاں لوگ کثرت سے جاتے ہیں۔ لندن سے اس جزیرہ کو جانے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک پورٹس موتھ سے اور دوسرا ساوتھ امپٹن سے جاتے وقت میں ساوتھ امپٹن ہو کر گیا تھا وہاں ایک روز قیام بھی کیا۔ یہ جگہ لندن سے اسی میل کے فاصلہ پر ہے۔ افریقہ اور امریکہ

وغیرہ سے یہاں جہاز آتے رہتے ہیں۔ سوا لاکھ کے قریب اس کی آبادی ہے۔ تفریح کے لحاظ سے یہ مقام کچھ اچھا نہیں ہے۔ رات کو ایک ہوٹل میں قیام کرکے علی الصباح اسٹیمر کے ذریعہ رائڈ چلا گیا۔ جو جزیرہ کا ایک مشہور مقام ہے۔ راستے میں دو مقامات پر اسٹیمر ٹھیرا۔ منظر بہت اچھا تھا۔

رائڈ نو بجے کے قریب اسٹیمر رائڈ پہونچا۔ یہ ایک خوبصورت چھوٹا سا شہر ہے بارہ ہزار کے قریب اس کی آبادی ہوگی۔ یہاں کا پیر تقریباً ایک میل لمبا ہے۔ کہتے ہیں کہ انگلستان میں اس سے لمبا پیر نہیں ہے۔ یہی پیر بندرگاہ کا بھی کام دیتا ہے۔ بندرگاہ سے ایک چھوٹی سی برقی ریل شہر تک جاتی ہے۔ تاکہ مسافرین کو اسباب کے لانے لیجانے میں سہولت ہو۔ پیر سے متصل کئی ایک ہوٹل ہیں لیکن جگہ کسی میں خالی نہ تھی اس لئے کسی قدر دور جانا پڑا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک ہوٹل میں صرف ایک کمرہ خالی ملا۔ ساڑھے آٹھ شلنگ روزانہ رہایش اور صبح کے ناشتے کے تھے۔ کھانا اس سے خارج تھا۔ اس مقام سے تمام جزیرے کی سیر موٹر کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

پورے جزیرے کا رقبہ ایک سو پینتیس مربع میل سے زاید نہیں ہے اور آبادی بھی ایک لاکھ کے اندر ہوگی۔ رائڈ سے متعدد موٹریں اور شارابینک جزیرہ کے مختلف مقامات تک جایا کرتی ہیں۔ صبح کو جاکر شام کو واپس آتی ہیں۔ سمندر کے کنارے جو مقامات یہاں دیکھنے کے لائق ہیں ان میں ایک سینڈون ہے جو رائڈ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پر جانب جنوب۔ چھ ہزار کے قریب اس کی آبادی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کی آب وہوا کسی قدر گرم اور ہندوستانیوں کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ فوجی لوگ جو ہندوستان اور چین میں ایک عرصہ تک رہ چکے ہیں۔ اگر ان کا تبادلہ انگلستان ہوجائے تو کچھ دنوں ان کو اس مقام پر رکھا جاتا ہے۔ تاکہ رفتہ رفتہ وہ سرد آب وہوا کے عادی ہوجائیں۔ اس کے جنوب میں کوئی دو میل کے فاصلہ پر ایک اور چھوٹا مقام

شنکلن

شنکلن ہے ۔ کچھ آبادی سمندر کے ساحل پر ہے اور کچھ آبادی پہاڑوں پر سطح سمندر سے (۱۵۰) فٹ بلندی پر ہے۔ یہاں سے تین میل اور نیچے چلے جاؤ تو ایک خوب صورت مقام سمندر کے کنارے ونٹنار ہے ۔ یہاں کی آب و ہوا مرض دق کے لیۓ مفید ہے ۔ چنانچہ ایک شفاخانہ مخصوص اس مرض کے واسطے بنا ہوا ہے۔ اس کے قریب ایک اور قصبہ ننٹن ہے یہ موسم سرما میں گرم اور گرمیوں میں سرد رہتا ہے ۔ مناظر قدرتی یہاں بہت دلفریب ہیں ۔

میں کچھ دنوں اس جزیرہ میں رہا۔ روزآنہ شارابینک کے ذریعہ سیر کرتا تھا۔ بہت ہی سرسبز اور شاداب جزیرہ ہے ۔ پہاڑوں کا نشیب و فراز عجیب لطف دیتا ہے میں یہاں زیادہ دن قیام کرنا چاہتا تھا مگر کوئی ساتھی نہ تھا۔ سلیم بیگ اور رفیق بیگ لندن میں تھے ۔ تنہائی بری چیز ہے ۔ سیر و سیاحت کا لطف اسی وقت ہے جب کوئی ہم خیال بھی ساتھ ہو ۔ مجھکو تنہائی سے بڑی وحشت ہوتی ہے ۔ اس ملک کے لوگ فطرتاً دیر آشنا ہیں ۔ اس لئے کسی سے دوستی پیدا ہونے کی بھی امید نہ تھی ۔ ہوٹل میں یوں تو کئی ایک مسافر ٹھیرے ہوئے تھے لیکن ان سے سرسری گفتگو کے سوا اور کچھ توقع نہ تھی ۔ ایک روز کچھ دیر تک ایک سن رسیدہ میم صاحبہ سے دلچسپ گفتگو رہی ۔ ہم دونوں ہوٹل میں چائے پی رہے تھے ۔ حسب دستور موسم پر سے سلسلہ گفتگو آغاز ہوا ۔ اثنائے گفتگو میں اس نے کہا کہ تم کسی اجنبی ملک کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو ۔ غالباً جنوبی فرانس کے باشندے ہو ۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان سے آرہا ہوں تو اس نے کہا کہ میں خود اگرچہ ہندوستان نہیں گئی لیکن وہاں کے چند بڑے آدمیوں کو جانتی ہوں جو راجہ اور نواب ہیں سوئیٹزرلنڈ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ ہمارے ملک اور باشندوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے ۔ میں نے کہا زیادہ تر شکایت تو یہ ہے

کہ ہمارے ملک اور باشندوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے کہا زیادہ تر شکایت تو یہ ہے کہ تم لوگ ضرورت سے زیادہ روکھے اور خشک ہو۔ تم سے ملاقات اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے مہینوں کا عرصہ درکار ہے۔ اس نے جواب دیا کہ تمہارا خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ چیز بجائے عیب کے دراصل کیرکٹر کی ایک خوبی ہے۔ تم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دیر آشنا لوگ جب آشنا ہو جاتے ہیں تو ان میں صداقت بھی ہوتی ہے۔ ہم لوگ فرانسیسی نہیں ہیں کہ فوراً شیر و شکر ہو جائیں۔ جو دوستی عجلت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اس میں استقلال نہیں ہوتا۔ جتنی جلدی پیدا ہوئی تھی اتنی ہی جلدی وہ جاتی بھی رہے گی۔ اس گفتگو کے بعد پھر اس خاتون سے ملاقات نہ ہوئی۔

غلط اسٹیمر پر سوار ہونا

واپسی کے وقت رائڈ سے میں ایک غلط اسٹیمر پر سوار ہو گیا۔ ٹکٹ میرے پاس اس اسٹیمر کا تھا جو سوتھمپٹن کو جاتا ہے لیکن میں جس اسٹیمر پر سوار ہوا وہ پورٹس موتھ کو جاتا تھا۔ دونوں مقامات گو کہ قریب قریب ہیں لیکن سروس علیحدہ ہے۔ اسٹیمر والوں نے اگرچہ ٹکٹ دیکھا لیکن کچھ اعتراض نہیں کیا۔ پورٹس موتھ پر جب میں اترا تو اسٹیمر والوں نے اعتراض کیا وہ چاہتے تھے کہ میں اسی اسٹیمر سے یا تو واپس ہو جاؤں یا اس کا کرایہ علیحدہ دوں۔ بڑی حجت رہی۔ اسٹیمر کا آدمی کسی اور کام میں مصروف ہو گیا۔ میں سیدھا اسٹیشن چلا آیا اور لندن کا ٹکٹ خرید کر ریل میں بیٹھ گیا۔ واپس جانا بالکل خارج از بحث تھا اور دوبارہ کرایہ ادا کرنا بھی درست نہ تھا کیونکہ سوار ہوتے وقت اسٹیمر والوں نے اعتراض نہیں کیا۔ غالباً اسی وجہ سے معترض بھی انجان ہو گیا۔

موسمی کیفیت

ہمارے ملک میں ابر و باران کے زمانہ میں لوگ باغوں کو جاتے اور ٹہلن وغیرہ کرتے ہیں۔ مگر یہاں کیفیت برعکس ہے۔ ابر آیا تو سمجھو کہ اس روز کا لطف ہی جاتا رہا اور ساری تفریح ملیا میٹ ہو گئی

بالخصوص اتوار کے دن تو دعائیں مانگتے ہیں کہ سورج نکلا رہے۔ تاکہ سمندر کے ساحل پر جاکر نہائیں اور تفریح کریں۔ لندن کے موسم میں تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ کسی وقت اس کا اعتبار نہیں۔ دن بھر میں کئی رنگ بدلتا ہے۔ ابھی ابر آیا ہوا تھا ابھی دھوپ نکل آئی اور پھر ابر آگیا۔ اکثر ہلکی ہلکی بارش رہا کرتی ہے۔ چنانچہ لندن میں بارش کا اوسط پچیس انچ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ زور کی بارش کم ہوتی ہے اگر ہوتی ہے تو اس کو یہاں کے لوگ طوفان سمجھتے ہیں۔ ایک روز صبح کو میں نے دیکھا کہ زمین تر ہے۔ خیال ہوا کہ بارش مسلسل ہوئی ہوگی۔ مکان والی سے جب تذکرہ آیا تو اس نے کہا مسٹر بیگ تم کو شاید خبر نہیں کہ رات کو طوفان آیا تھا۔ گھر سے باہر جب لوگ جاتے ہیں تو اکثر اپنے ساتھ اس خیال سے اوور کوٹ رکھ لیتے ہیں کہ خدا معلوم کس وقت بارش ہو جائے۔ بعض لوگ چھتری بھی رکھتے ہیں لیکن نوعمر لوگ زیادہ تر اوور کوٹ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ٹوپی بھیگی رہتی ہے۔ محض دھوپ سے بچنے کے لئے مرد کے واسطے چھتری کا استعمال داخل عیب ہے۔ عورتیں البتہ دھوپ کی شدت ہو تو چھتری لگاتی ہیں مگر ایسا موقع بہت کم ہوتا ہے۔ یہاں کے موسم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ ۲۱ر مارچ سے ۲۲ر جون تک بہار کا موسم سمجھا جاتا ہے اور یہی سب میں اعلیٰ ہے۔ اس کے بعد ۲۲ر ستمبر تک گرمی کا موسم رہتا ہے۔ پھر خزاں شروع ہو جاتی ہے جس کا زمانہ ۲۲ر دسمبر تک ہے۔ بعد ازاں جاڑے کا آغاز ہوتا ہے۔ مجھے جاڑے کا تجربہ نہیں ہے لیکن یہ سنا ہے کہ تکلیف دہ موسم ہوتا ہے۔ دن کو ایسی سخت کہر رہتی ہے کہ سورج دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ بعض وقت فضا بالکل تاریک ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر روشنی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے اکثر حادثات بھی ہو جاتے ہیں۔ جاڑے میں لندن کا مقیاس الحرارت عام طور پر (۴۲) ڈگری سے کم نہیں ہوتا اور گرمیوں میں (۶۲) ڈگری انتہا ہے لیکن یہ اوسط

ہے۔ بعض اوقات زیادتی اور کمی بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میرے زمانہ قیام میں تین روز شدید گرمی ہوئی۔ اخباروں میں اس کا چرچا رہا۔ گرمی کی لہر کے عنوان سے مضامین طبع ہوئے لیکن پارہ (۹۳) ڈگری سے اونچا نہیں ہوا اس سے قبل ۱۹۱۱ء میں ۱۹ اگسٹ کو پارہ (۱۰۰) ڈگری پر پہونچا تھا۔ اس تین چار روز کی گرمی میں متعدد آدمی مر گئے۔ ہندوستان میں ایک سو بیس ڈگری ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دراصل (۹۳) ڈگری کچھ زیادہ نہیں ہے اور لوگ ضایع نہ ہوتے بشرطیکہ لباس میں تبدیلی کی کوئی صورت نکل آتی۔ یہاں گرمیوں میں بھی اونی لباس پہنے رہتے ہیں۔ پنکھے نہیں ہوتے۔ بازار میں نکلو تو دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں۔ ہوا کا نام نشان نہیں۔ ان حالات میں گرمی ضرور محسوس ہوتی ہے کمزور قلب کے لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ عورتیں البتہ محفوظ رہتی ہے کیونکہ ان کا لباس مردوں کی نسبت ہلکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس غیر معمولی گرمی میں کوئی عورت نہیں مری جتنے مرے سب مرد تھے۔ یہ لوگ لباس میں تبدیلی اس لئے نہیں کرتے کہ موسم کا بالکل اعتبار نہیں۔ ایسی صورت میں لباس کو تبدیل کرنا صحت پر مضر اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ میں نے گرمی سے پریشان ہو کر اونی بنیاں اور ویسٹ ترک کر دیا تھا۔ چوتھے روز ایسی سخت خنکی ہوئی کہ مجھکو نزلہ اور بخار ہو گیا۔ خاص طور پر باہر والوں کو احتیاط لازمی ہے۔ جولائی کے مہینے میں دن بہت بڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ صبح چار بجے سے پیشتر سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ اور سوا آٹھ بجے کے قریب غروب کا وقت ہے لیکن روشنی نو بجے تک رہتی ہے۔ لندن اور کلکتہ کے وقت میں سات منٹ کم چھ گھنٹے کا فرق رہتا ہے۔ مثلاً کلکتہ میں اگر شام کے چھ بجے ہیں تو لندن میں دن کے بارہ بجے ہوں گے۔ بحیثیت مجموعی لندن کی آب وہوا صحت بخش اور خوشگوار مانی جاتی ہے۔

صفائی اور حفظانِ صحت

صفائی اور حفظان صحت کے انتظامات عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر ہیں ۔ نہ صرف گورنمنٹ کو صفائی کا خیال ہے ۔ بلکہ عوام بھی اپنے مکانوں میں اس کا خیال کرتے ہیں ۔ بازاروں میں جا بجا ایسے ظروف موجود ہیں جن میں ردّی کاغذات یا کوئی سیگار چیز ڈال سکتے ہو ۔ سڑک پر ایسی چیزیں ڈالنے کی سخت ممانعت ہے ۔ ایک دفعہ میں کسی بازار میں جا رہا تھا ۔ چھوٹی سی گاڑی میں ایک شخص آئسکریم کی چھوٹی چھوٹی بٹیاں کاغذ میں لپٹی ہوئی بیچتا جا رہا تھا ۔ میں نے ایک ٹکیہ خریدی ۔ کاغذ پر کچھ عبارت چھپی ہوئی تھی جس کو میں نے غور سے پڑھا ۔ منشا یہ تھا کہ اپنے شہر اور ملک کو غلاظت سے محفوظ رکھو ۔ مہربانی کر کے اس کاغذ کو سڑک پر مت پھینکو ۔ اس قسم کی ہدایات موٹر بسوں اور ٹریموں میں لکھی ہوئی ہیں کہ اترتے وقت ٹکٹ گاڑی میں چھوڑ کر جاؤ ورنہ سڑکوں پر کوڑا ہونے کا اندیشہ ہے ۔ یہ باتیں محض نمایش نہیں ہیں بلکہ ان پر عمل بھی ہوتا ہے ۔ صحت کو قایم رکھنے کے لیے اور بھی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں ۔ مثلاً پیدل چلنا پھرنا عیب میں داخل نہیں ہے بلکہ جہاں تک ہو سکتا ہے پیدل چلتے ہیں ۔

تفریح

کھانے پینے میں اوقات کی پابندی ۔ دماغی محنت کے بعد تفریح اور جسمانی ورزش قواعد حفظان صحت کا عام طور پر خیال یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کی عمر کا اوسط ہمارے ہاں سے بہت زیادہ ہے ۔ شام کو جب نوکری سے فارغ ہوتے ہیں تو ضرور کسی نہ کسی قسم کی تفریح کرتے ہیں ۔ اگر باہر نہ جائیں تو اپنے مکان ہی میں گاتے بجاتے ہیں ۔ ہمارے مکان میں اکثر رات کو ایک بجے تک ناچ گانا ہوتا رہتا تھا ۔ ہم لوگ اگرچہ عملی طور پر اس میں حصہ نہیں لیتے تھے لیکن صاحب خانہ کی خاطر شریک محفل ہونا پڑتا تھا ۔ یہ لوگ تعجب ظاہر کیا کرتے تھے کہ

ہندوستان میں زندگی کیسی روکھی پھیکی ہوا کرتی ہے۔ تم کو نہ تو گانا آتا ہے۔ نہ ناچتے ہو اور نہ تیرنے کا شوق ہے۔ تم سب مردہ دل لوگ معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا یہ صحیح نہیں ہے البتہ تفریح کا طریقہ جداگانہ ہے۔ جب کبھی دل چاہتا ہے۔ ہم پیشہ ور لوگوں کو مکان پر بلاتے ہیں۔ اور ساری ساری رات محفل گرم رہتی ہے۔ مالک مکان کی لڑکی کہتی تھی کہ میں ہرگز ایسے ملک میں رہنا پسند نہ کرونگی۔ جہاں دوسروں کو ناچتا ہوا دیکھیں اور خود شریک ہونا عیب خیال کریں۔

اس گفتگو سے ناظرین یا تمکین بخوبی یہ اندازہ فرماسکتے ہیں کہ اس ملک میں رقص و سرود کے متعلق عورتوں کے خیالات کس قدر آزاد ہیں۔ یہ چیز ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہوگئی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو غیر مرد کے ساتھ ناچنے کی بڑی آرزو رہتی ہے۔ یہ مانا کہ روزمرہ ناچتے رہنے کی وجہ سے ان کے جذبات سرد ہوگئے ہیں لیکن جذبات شہوانی کہاں تک دبے رہیں گے یہ اپنا کام آہستہ آہستہ کرتے رہتے ہیں۔ ناچ میں جو کچھ عمل ہوتا ہے وہ تیر نیمکش کا اثر رکھتا ہے۔ جب تک یہ تیر جگر کے پار نہیں ہو لیتا دل کی خلش کیسے دور ہوسکتی ہے۔ یورپ کی عورتوں کے اخلاق پر رقص و سرود کے شوق نے جو اثر ڈالا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ یہ زہریلی ہوا کچھ ایسی عام ہوگئی ہے کہ اچھی اچھی باعصمت۔ اور شریف الخیال عورتیں بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ یہاں کی عورتیں عام طور پر اگرچہ صاحب فہم ہوتی ہیں۔ لیکن اس مرض مہلک کے اثرات سے بے خبر ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ سمجھدار ہیں روزمرہ کے کاروبار میں ہوشیار ہیں ؎

مگر نفس غافل کہ مکر و فریب — لیتے ہیں عقل و صبر و شکیب
جہاں پھونکا اک وسوسہ کان میں — تزلزل پڑا دین و ایمان میں
پڑا جس گھڑی معصیت کا حجاب — نہیں سوجھتا کچھ عذاب و ثواب

میرے خیال میں محض بے پردگی سے یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول اس قسم

کے موجبات ترغیب سے پاک ہونا چاہئیں۔

آب وہوا کا اثر

قدرت نے اس ملک کی آب وہوا کو روح پرور بنایا ہے سردی کی وجہ سے جسمانی محنت تکان پیدا نہیں کرتی بلکہ کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔آب وہوا کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے قوائے جسمانی مضبوط ہوتے ہیں۔ہمارے ملک میں گرمی قویٰ کو مضمحل کر دیتی ہے۔نہ دماغی محنت ہوسکتی ہے اور نہ جسمانی بلکہ آرام طلبی کی طرف طبیعت مائل رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ موسم گرما میں ہندوستان کے ذی مرتبہ انگریز پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور ہائی کورٹ بھی کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔دفاتر اور مدارس کے اوقات صبح کے ہو جاتے ہیں۔قدرت کے اس انتظام کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا لیکن خداوند کریم نے گرم ملک کے لوگوں کو عام طور پر ذہن اچھا بخشا ہے۔اس نعمت خداداد سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ماسوا اس کے یورپین اقوام کی بعض خوبیوں کو اگر ہم اختیار کریں تو دنیوی ترقی میں بہت کچھ امداد ملیگی۔

انگریزوں کی خصوصیات

انگریزوں کو دیکھو یہ لوگ کیسے مستقل مزاج۔دوراندیش۔ منتظم اور وقت کی قدر کرنے والے ہیں۔ان کے ملک میں کس قدر انصاف پسندی اور مساوات کا برتاؤ ہے۔زبردست اور کمزور۔امیر اور غریب سب کے حقوق برابر ہیں مثلاً ریلوے اسٹیشن پر دیکھو گے کہ ٹکٹ لینے کے لئے کھڑکی کے سامنے ایک لمبی قطار کھڑی ہے۔ہر شخص باری باری سے ٹکٹ لیتا ہے۔نیا آدمی قطار کے آخر میں کھڑا ہوتا ہے۔یہ نہیں ہو سکتا کہ قوی آدمی کمزور کو ہٹا کر خود پہلے ٹکٹ خریدے۔بالکل قاعدہ کی پابندی سب پر لازمی ہے۔میرا ہرگز یہ منشار نہیں ہے کہ یہ خوبیاں ہم میں مفقود ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ کمی کے ساتھ ہیں۔

فرائض منصبی کا احساس

فرائض منصبی کا احساس ان لوگوں میں خصوصیت کے

ساتھ ہے۔ بچپن ہی سے تربیت ایسی دی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ یہ خیال طبیعت ثانی کی صورت پیدا کر لیتا ہے ۔ مرد ہو کہ عورت ۔ بڑا ہو کہ چھوٹا ۔ یہ احساس سب میں موجود ہے ۔ فرایض کے اوقات میں نہ تو تفریح کا خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی سے فضول باتیں کرکے وقت کو ضایع کرتے ہیں ۔ بازار میں اکثر یہ منظر دیکھو گے کہ ملازم پیشہ لڑکیاں اپنی نوکری پر وقت مقررہ کے اندر پہونچنے کے لیے تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی ہیں ۔ بار بار اپنی گھڑی کو دیکھتی جاتی ہیں اور اس کوشش میں ہوتی ہیں کہ کسی طرح ایک منٹ کی بھی دیر نہ ہونے پائے ڈیوٹی کے خیال نے اوقات کی پابندی کا بھی خیال پیدا کر دیا ۔ یہ بات کچھ ملازمت پیشہ لوگوں ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ گھر کے کام کاج میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ۔ کام اول تو اوقات مقررہ کے لحاظ سے کرتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس درجہ منہمک ہوتے ہیں کہ کسی سے غیر ضروری بات تک نہیں کرتے ۔ سب کام خاموشی کے ساتھ اس طرح ہوتے رہتے ہیں گویا کہ ایک مشین کام کر رہی ہے ۔ دوسری چیز قابل تعریف یہ ہے کہ کاروباری اور روزمرہ کے معاملات میں ایمانداری بہت ہے ۔ دھوکا اور فریب کمتر دیکھا گیا۔

یہ بات یاد رکھنے کے لایق ہے کہ یورپ کے جملہ ممالک اس خصوص میں یکساں نہیں ہیں ۔ بعض شہروں میں اجنبی آدمی کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ۔ البتہ جرمنی اور انگلستان میں دھوکے کا احتمال بہت کم ہے ۔ برلن کے ایک مشہور باغ لونا پارک میں ایک روز ہم سیر کر رہے تھے ۔ میلہ بھرا ہوا تھا ۔ آدمیوں کی کثرت تھی ۔ ایک چھوٹی سی دکان سے ہم نے کچھ سودا خریدا ۔ سکوں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے کچھ پیسے دکاندار کو زیادہ دیدیے ۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دکان کا ایک آدمی ہم کو تلاش کرتا ہوا ایک جگہ آیا اور فاضل پیسے واپس دے گیا ۔ فرض کرو کہ یہ چند پیسے وہ واپس نہ کرتا ۔ نہ تو ہم کو اس کی خبر ہوتی اور نہ اس پر کوئی الزام عاید

ہوتا کیونکہ ایسے مجمع میں کسی کو تلاش کر کے نکال لینا اور وہ بھی چند پیسوں کی خاطر کوئی آسان بات نہیں ہے -

مقررہ قیمت

ہر چیز کی قیمت مقرر ہے - یہ نہیں ہو سکتا کہ اجنبی آدمی کو دیکھکر زیادہ قیمت وصول کرلیں - یہ مرض ممالک مشرقی میں بالعموم اور یورپ کے صرف چند شہروں میں دیکھا گیا - لندن میں اگر کسی ناسمجھ بچے کو بھی بازار میں بھجوادیا جائے تو قیمت کے متعلق کوئی فرق پیدا نہ ہوگا - اس کے خلاف قاہرہ میں اگر کوئی سمجھدار اجنبی بھی کامیابی کے ساتھ خرید و فروخت کر سکے تو اس کو خوش قسمت خیال کرو - یہ بات اب ہندوستان میں بھی ہو چلی ہے کہ ہر شہر میں بعض دکانیں ایسی ہیں جہاں قیمت مقررہ ہے - خریدار کی حیثیت اس میں کوئی تغیر یا تبدل نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی زیادہ تعداد ایسی دکانوں کی ہے جہاں قیمت کا دار و مدار طرفین کی پختہ کاری پر ہے قیمتوں کی یکسانیت کچھ دکانداری کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ جملہ کاروبار میں یہی حالت ہے مثلاً کپڑوں کی دھلائی مقررہ ہے - کسی تکرار کی ضرورت نہیں - دھوبن کی دکان پر کپڑے دیدو وہ ایک مطبوعہ فارم دیگی - جس پر کپڑوں کی تفصیل لکھی ہوئی ہے - صرف تعداد کے لحاظ سے اس کی خانہ پری کردو وہ وقت اور دن مقرر کردی گی - چاہے کپڑے اپنے مقام پر منگوالو یا خود دکان پر لینے کے لئے جاؤ - وقت مقررہ پر ضرور ملجائیں گے شاذ ایسا ہوگا کہ وعدہ پر چیز نہ ملے -

ہم کو سینکڑوں دفعہ تصویروں کے فلم دھلوانے کی ضرورت ہوئی - ہمیشہ دکان والا دن اور وقت مقرر کر دیتا تھا - کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مقررہ وقت پر فلم تیار نہ ملا ہو ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ہم مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے دکان پر گئے اور

وعدہ کی پابندی

فلم کا تقاضہ کیا - دکان پر ایک لڑکی کام کر رہی تھی اُسنے گھنٹہ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ تم پندرہ منٹ

پہلے آگئے ہو۔ کچھ دیر ٹھیر کر آؤ تو فلم تیار ملیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے خلاف حیدرآباد میں عیب ایک دکان پر فلم دھلنے کے لئے دئے تو متعدد مرتبہ چکر لگانے پڑے۔ ہر دفعہ دکاندار کچھ نہ کچھ بہانہ کرتا تھا۔ کبھی تو اس نے کہا کہ میں بھول گیا اور کبھی کہتا تھا کہ فرصت نہیں ملی۔ بالآخر کئی روز بعد اس نے فلم واپس کئے مگر ایک فلم غائب تھا۔ عذر اس نے یہ کیا کہ دوسرے فلموں میں کہیں مل گیا ہے۔ فرصت سے تلاش کروں گا۔ ممکن ہے کہ یہ ایک معمولی بات معلوم ہو۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ چیزیں کاروبار کے فروغ میں بہت دخل رکھتی ہیں۔

مسلمان بھائیوں کے واسطے یہ مقام عبرت کا ہے کہ آج کل یورپین اقوام جن خوبیوں کی بدولت ترقی کر رہی ہیں۔ یہ سب کسی زمانہ میں مسلمانوں میں بھی موجود تھیں۔ اگر ہم ان پر قایم رہتے تو آج یہ روز بد کیوں دیکھتے۔ صفائی اور ستھرائی کے متعلق پیغمبر اسلام نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک معتبر حدیث یہ ہے۔ دم علی الطھارۃ یوسع علیك الرزق۔ (ہمیشہ پاک وصاف رہو۔ اس سے رزق زیادہ ہوگا) کیسی سچی بات ہے۔ پاک وصاف رہوگے تو صحت بھی اچھی رہے گی۔ اور صحت اچھی ہو تو انسان کاروبار بھی کرسکیگا۔ یورپ نے اس بات کا ثبوت کافی طور پر دیدیا ہے۔ یورپ کی ترقی کا ایک ذریعہ علم ہے۔ دیکھو ہمارے سرکار دوعالم اس خصوص میں کیا ارشاد فرماتے ہیں العلم لا یحل منعہ۔ یعنی (علم حاصل کرنے میں کوتاہی حرام ہے)۔ اسی طرح پابندی اوقات۔ فرایض منصبی کے احساس اور کاروبار میں ایمانداری کے متعلق متعدد احکام موجود ہیں۔ خود پیغمبر اسلام نے اپنی دیانت اور امانت کی وجہ سے امین کا لقب حاصل کیا۔ کاش یہ تمام خوبیاں ہم میں واپس آجائیں۔ پھر تو ترقی کا زینہ خود بخود کھل جائیگا۔

یورپین اقوام کے دو بڑے عیب

دنیا کی کوئی قوم عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یورپ کی اقوام میں بھی اکثر باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ان کو

تباہی کے راستہ پر تیز رفتاری کے ساتھ لیجارہی ہیں۔ مجھ کو انگریزوں کی عیب جوئی مقصود نہیں ہے۔ لیکن جو باتیں بالکل آئینہ ہیں اور بغیر کسی تلاش کے آنکھوں کے سامنے خود بخود آجاتی ہیں۔ ان کو میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مس میو نے اپنی مشہور کتاب مدر انڈیا میں اہل ہنود کے عیوب کی پردہ دری کی ہے۔ اگرچہ بہت مبالغہ کے ساتھ کام لیا گیا ہے لیکن اگر ان باتوں کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ غیر قوم کے عیوب تلاش کرنے سے اپنی قوم کے حق میں کیا فائدہ برآمد ہو سکتا ہے۔ حتی الامکان خوبیوں کی تلاش کر کے ان کو اخذ کرنا چاہیئے۔ مس میو نے اپنی کتاب میں اہل ہنود کی جن کمزوریوں کو ظاہر کیا ہے ان میں سے اکثر خود یورپین اقوام میں شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

دو بڑے عیب یورپین اقوام میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مذہب کو ان لوگوں نے بالکل چھوڑ رکھا ہے۔ خدا کا وجود ان کے نزدیک برائے نام ہے یہ ساری خرابی اس تعلیم و تربیت کی ہے جو بچپن سے ان کو دیجاتی ہے۔ اسوا اس کے سائنس نے کے حیرت ناک کوششوں کو روزآنہ دیکھتے دیکھتے ذہنیت بھی بدل گئی ہے۔ ان کی عقل کسی بات کو تسلیم نہیں کرتی تاوقتیکہ اس کے اسباب سمجھ میں نہ آجائیں اور مشاہدہ سے اطمینان نہ ہو جائے۔ اس حد تک تو مضایقہ نہیں لیکن تعجب تو یہ ہے کہ سائنس کو مذہب کی ضد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سائنس کی حیرت ناک ایجادات کو دیکھ کر خدا کی عظمت اور شان کا پہلے سے زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہاں کیفیت برعکس ہے۔ دوسرا عیب میرے خیال میں نتیجہ ہے۔ لامذہبی کا کیونکہ خدا کو بھول جانے کے بعد انسان میں اچھے اور برے کی تمیز کم ہو جاتی ہے۔ مذہب ایک بہت بڑا ذریعہ اصلاح باطن کا ہے۔ اس سے اگر قطع تعلق کرلو تو اخلاق کے واسطے کوئی خاص معیار باقی نہیں رہتا۔ سامنے ایک وسیع میدان پاؤگے۔ جس طرف جی چاہے دوڑتے پھرو اور کہدو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ پوچھنے اور روکنے والا

کون ہے۔ یہ کیفیت تمام یورپ میں پائی جاتی ہے۔ شرم اور حیا برائے نام رہ گئی ہے۔ جو کچھ باقی ہے وہ بھی کچھ عرصہ میں جاتی رہے گی۔ برلن کا برہنہ کلب جس کی بنیاد لندن میں بھی پڑ گئی ہے صاف صاف اس منزل کی نشاندھی کر رہا ہے جس کی طرف لامذہبی ان کو لیجا رہی ہے جدھر دیکھو کھلم کھلا حسن پرستی کے مزے لوٹے جا رہے ہیں۔ جائز اور ناجائز۔ حرام اور حلال کا امتیاز اٹھتا جاتا ہے۔ بالخصوص فرانسیسیوں کی حالت اس معاملہ میں ناگفتہ بہ ہے۔ وہ زمانہ بھی قریب آتا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی رنگ نظر آئے گا کیونکہ یورپ کی تعلیم کا اثر ہم لوگوں میں روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جب تک ہمارے نونہالان چمن گلشن یورپ میں نشو ونما پاتے رہیں گے وہاں کی زہریلی ہوا اپنا اثر پھیلاتی رہے گی۔ ان باتوں کی روک تھام ابھی سے کرنا ضروری ہے۔

لیکن غضب تو یہ ہے کہ ہم لوگ خود مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ عوام کو تو جانے دو کیونکہ یہ طبقہ ہمیشہ گنہگار ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو دیکھو جو اپنے کو اصلاح ظاہر سے آراستہ رکھتے اور مذہبی پیشوائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کسی قوم یا ملت کے مقدس گروہ کو لے لو۔ بناوٹ اور نمایش ظاہری کی کمی نہ پاؤگے روزہ نماز اور پوجا پاٹ میں بظاہر نہایت مستعد اور پابند۔ باتیں بھی اللہ والوں جیسی۔ نصیحت کے پل باندھنے میں بڑے مشاق۔ لیکن ان کی خانگی زندگی کو ٹٹولو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب شیشہ بندھی ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

بلاشبہ نوے فی صدی ایسے نکلینگے جن کے اعمال دنیا داروں سے بھی بدتر ہیں تو اب صورت حال یہ ہوئی کہ ہماری اصلاح باطن جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ خود راہ راست پر نہیں ہیں۔ اور تعلیم و تربیت و تمدن میں ہم اس قوم کی تقلید

کر رہے ہیں۔ جو مذہب سے بالکل دست بردار ہو چکی ہے۔ پس آیندہ ہمارا جو کچھ حشر ہونے والا ہے وہ معلوم۔

عیسائی پادریوں نے اپنی قوم کی ان خرابیوں کی طرف توجہ بھی کی ہے لیکن ان لوگوں کے نزدیک پادریوں کی نصیحت گوز شتر سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتی۔ وہ زمانہ گیا کہ پادری جنت کے چوب دار سمجھے جایا کرتے تھے۔ اب تو اگر ان لوگوں کا بس چلے تو پادریوں کو جنت میں داخل بھی نہ ہونے دیں۔

مسٹر نارمن ڈگلس کے خیالات

ایک مستند انگریز مصنف نارمن ڈگلس نے ایک دلچسپ کتاب یورپ کے موجودہ طرز تمدن کے متعلق لکھی ہے مصنف مذکور نے لندن کی بازاری عورتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگر حضرت عیسٰی زندہ ہو جائیں اور ان کو یورپ کی سیر کرائی جائے تو یقین ہے کہ وہ اپنی امت سے متنفر ہو کر سکونت کے لئے ہندوستان کو پسند کریں گے لندن کے گوشہ مغربی میں عام طور پر نوجوان عورتیں مردوں کی گھات میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ مسٹر نارمن ڈگلس ان عورتوں کا ذکر اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں کہ اکسفورڈ سرکس کے قریب نوجوان لیکن کنواری لڑکیاں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ آیندہ چلکر کاروباری لوگوں کو راستہ چلنے میں بڑی دقت واقع ہوگی۔ اور زمین کے نیچے متعدد راستے بنانے پڑیں گے۔ یہی صاحب لکھتے ہیں کہ افسوس تو یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لڑکیاں پیشہ ور ہوتی ہیں۔ مصنف مذکور کی رائے یہ ہے کہ ان لڑکیوں کو جہازوں میں سوار کرا کے مشرقی افریقہ کے علاقہ انگریزی میں بھجوا دیا جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ وہاں غیر شادی شدہ سرکاری ملازمین کثیر تعداد میں ایسے ہیں جن کو گھرداری کے لئے عورتوں کی ضرورت ہے لیکن خود ہی سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ عورتیں وہاں جانا پسند بھی کرینگی پھر لکھتے ہیں کہ یورپ میں عورت کی عصمت اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنی ہندوستان میں اور تحریر فرماتے ہیں کہ

اگرچہ اہل ہنود داشتہ رکھنا معیوب نہیں سمجھتے مگر فرق یہ ہے کہ ہندو کی داشتہ اس کے گھر میں رہتی ہے اور وہ اس کی پرورش کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یوروپین آدمی کی داشتہ یا تو بازار میں پھرتی رہتی ہے یا اپنے خاوند کے زیر پرورش رہتی ہے۔ مسٹر نارمن ڈگلس نے یورپ کے متعلق اس خصوص میں جو کچھ لکھا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمثیلاً دو واقعات ایسے بیان کروں گا جن کا مجھکو ذاتی تجربہ ہے۔ ایک روز رات کے وقت میں رسل اسکوائر کے قریب ایک گلی میں جا رہا تھا۔ مقابل سے ایک نوجوان عورت آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم مجھے ایک سگریٹ دے سکتے ہو۔ میں نے اس کو ایک سگریٹ دے دیا فوراً ہی اس نے کہا مجھے ایک شلنگ کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا افسوس ہے کہ میری جیب اس وقت خالی ہے۔ جواب دیکر میں جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ کو روکا اور اصل مطلب پر گفتگو کرنے لگی۔ میں نے اظہار مجبوری کیا اور چلا آیا۔ دوسری دفعہ شام کو چار بجے کے قریب میں ایک بازار میں چلا جا رہا تھا۔ رفیق بیگ بھی ساتھ تھے ایک نوجوان لڑکی سڑک کو عبور کرتے وقت ایک موٹر سے ٹکر کھا کر نیچے گر گئی۔ میں بالکل قریب تھا۔ اس لئے میں نے اس کو نیچے سے اٹھایا۔ غنیمت کہ زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ اسی حادثہ کے متعلق باتیں کرتی ہوئی وہ ہمارے ساتھ ہو گئی۔ راستہ میں اس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے کہا امریکہ سے آتا ہوں۔ یہ سنکر اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈالدیا اور کہنے لگی پھر تو تم میرے دوست ہو۔ میں نے رفیق بیگ سے ہندوستانی میں کہا کہ اس عورت سے کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہیئے۔ ہم کو ایک غیر زبان میں بات کرتے سنکر اس کے کان کھڑے ہوئے اور تعجب کے ساتھ اس نے پوچھا تم کس زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہندوستانی زبان ہے۔ اس پر اس نے کہا تو کیا تم ہندوستانی ہو۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ میں ہندوستانی ہوں۔ یہ سنکر وہ مجھ سے بالکل الگ ہو گئی۔ اور سڑک کے دوسری جانب چلی گئی۔ غالباً وہ سمجھتی تھی کہ

امریکن دولتمند ہوتے ہیں۔ ان سے کچھ فائدہ ہو جائیگا اور ہندوستانی اکثر طالب علم ہوتے ہیں۔ جن سے نفع کی توقع زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بیروزگاری سنا ہے کہ لندن میں چار لاکھ عورتیں بے روزگار ہیں۔ ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ اگر اس کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا جائے تو بجائے خود وہ ایک دلچسپ کتاب ہوگی۔ اصل تو یہ ہے کہ (ع

کارساز ما در فکر کار ما

ہر ملک کی معاشرت جداگانہ اصول پر ہوتی ہے اور اس کے مطابق سب کام ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آج کل بے روزگاری نے سب کا آٹا گیلا کر رکھا ہے۔ اخلاق پر اسکا اثر پڑنا ایک امر ناگزیر ہے۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی ۔۔۔ کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو ۔۔۔ سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو

سرد مہری انگلستان کے باشندوں کے متعلق غیر ممالک کے لوگوں کو عام طور پر یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ سرد مہر اور دیر آشنا ہوتے ہیں۔ ایک حد تک یہ شکایت صحیح ہے۔ ہندوستان اور دیگر ممالک شرقیہ کا سرگرم جوش یہاں نہیں ہے ہر شخص اپنے معاملات اور اغراض میں منہمک رہتا ہے۔ دوسروں کے حالات کی یہ لوگ نہ جستجو کرتے ہیں اور نہ ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہندوستان میں پڑوس داری محلہ داری اور عزیز داری وغیرہ کے فرائض بہت ادا کئے جاتے ہیں۔ اکثر تقاریب اور میل جول کے موقعوں پر ان حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس قسم کی مروت اور معاشرت مفقود ہے۔ برسوں ایک محلہ میں رہیں گے لیکن یہ بھی پتہ نہ چلیگا کہ پہلو میں کون رہتا ہے۔ میں جس مکان میں مقیم تھا اس کے قریب میں دو ایک اچھے مکانات تھے لیکن ہماری مکان کی مالکہ کو یہ خبر نہ تھی کہ ان مکانات میں کون

رہتا ہے بلکہ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پہلو کے مکان میں کون ہے۔ قرابت داری اور عزیز داری بھی محض میل جول کی حد تک ہوتی ہے۔ ہندوستان کی طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ کمانے والا تو ایک لیکن اس کے دست نگر متعدد افراد خاندان۔ یہاں کے لوگ ایسی قرابت داری کے معتقد نہیں ہیں۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنی پرورش کا خود ہی بندوبست کرے۔ مسافر نوازی اور مہمان نوازی کا جو دستور ہمارے ہاں ہے اس کا عشر عشیر بھی یہاں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ باتیں اچھی ہوں یا بری لیکن ایک نتیجہ اس روکھے پن کا یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس کو یہ معلوم ہے کہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے تو ذاتی طور پر محنت اور مشقت کرنی چاہیئے کسی سے مالی امداد کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

بھیک مانگنے والوں کا طریقہ

اس ملک میں بھیک مانگنے والے بہت کم ہیں۔ میں نے چند معذور آدمیوں کو دیکھا جو محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔ مثلاً۔ لندن کے بازاروں میں دو ایک اندھے بعض مقامات پر کھڑے نظر آئے ان کے گلے میں ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر نابینا لکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ دیا سلائیاں لئے کھڑے تھے۔ اسی طرح بعض معذور لوگ سڑک کے کنارے کسی گوشہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ زمین پر سفیدی سے کچھ نقش و نگار بناتے ہیں اور ایک طرف نمایاں حروف میں "تھینک یو" یعنے آپ کا شکریہ لکھدیتے ہیں۔ گویا نقش و نگار دیکھنے سے آپ کو اگر تفریح ہوئی ہے تو اس کے معاوضہ میں کچھ دیدیجئے۔ اتنے بڑے شہر میں مجھ کو صرف دو آدمی ملے جنھوں نے فقیروں کی طرح سوال کیا۔ ایک روز پیکاڈلی میں کسی دکان کے سامنے میں کھڑا ہوا تھا۔ ایک شخص میرے قریب آیا اور کہنے لگا کہ میں بھوکا ہوں اور محتاج ہوں۔ میری کچھ مدد کرو۔ میں نے اس کو ایک شلنگ دے دیا

دوسری دفعہ میں سراج الحق سے ملنے کے لئے جا رہا تھا اس محلہ کا راستہ معلوم نہیں تھا سڑک پر ایک معمولی حیثیت کا آدمی کھڑا تھا۔ اس سے میں نے راستہ دریافت کیا وہ پندرہ بیس قدم تک راستہ بتاتا ہوا میرے ساتھ آیا۔ میں جب شکریہ ادا کر کے اس سے الگ ہونے لگا تو اس نے کہا کہ مجھ کو پینے کے لئے کچھ دیتے جاؤ۔ پینے کے نام پر خیرات دیتے ہوئے مجھ کو پس و پیش ضرور ہوا لیکن موقع کچھ ایسا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا ایک شلنگ اس کو بھی میں نے دے دیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر میں انکار کر دیتا تو یہ شخص خاموشی کے ساتھ میرا پیچھا چھوڑ دیتا اور اس طرح دق نہ کرتا جیسے مصر کے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ ان دونوں واقعات کا تذکرہ جب میں نے اپنی مالکہ مکان سے کیا تو اس نے کہا کہ تم نے ناحق دو شلنگ خراب کئے۔ اس قسم کے لوگ ہرگز امداد کے لایق نہیں۔

بیکاری

جنگ عظیم کے بعد سے روزگاری روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جملہ آبادی کے منجملہ تینتیس فی صدی بے روزگار ہیں۔ اکیس فی صدی کے قریب بچہ ہیں۔ بقیہ کام پر ہیں۔ جو لوگ کام سے لگے ہوئے ان میں سے (۷۰) فی صدی ایسے ہیں جن کی ہفتہ وار آمدنی پچیس شلنگ سے نیچے ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ایک سو ساٹھ روپیہ ماہانہ کے اندر ہے۔ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ طباعت اور اخبار نویسی سے متعلق ہے۔ چنانچہ بازاروں میں اخباروں اور کتابوں کی دکانیں بکثرت پاؤ گے۔ بیکاری کے مسئلہ پر حکومت غور کرتی رہتی ہے اور حتی الامکان اس کو رفع کرنے کی تدابیر عمل میں لاتی رہتی ہے۔ جا بجا اس کے متعلق دفاتر قایم ہیں جن کو لیبر اکسچنج کہتے ہیں۔ اس دفتر میں متعلقہ محلوں کے بیروزگار آدمیوں کی فہرست اور ان کی قابلیت کا اندراج ہوتا ہے۔ جس کسی کو ملازم کی ضرورت ہو وہ اس دفتر میں اپنی ضروریات کی اطلاع دیدے تو آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جاتا ہے؛

چنانچہ غلام یزدانی صاحب کو ایک ٹائپسٹ کی ضرورت تھی۔ قریب کے دفتر میں اطلاع دیدی گئی۔ دوسرے دن دفتر والوں نے ہمارے مکان پر ایک لڑکی کو بھجوایا جو اس کام سے بخوبی واقف تھی۔ بیروزگار لوگوں میں ایک خاص قسم کی جماعت ہوتی ہے۔ جس کو محتاج کہتے ہیں۔ یہ ایک کثیر تعداد ہے۔ حکومت نے ان محتاجین کی گذر اوقات کے لئے خاص انتظام کر رکھا ہے۔ ایک کثیر رقم سالانہ اس گروہ کی پرورش میں صرف کیجاتی ہے۔ خود دار لوگ اس خیرات سے مستفید نہیں ہوتے۔ بعض اہل الرائے حکومت کی اس پالسی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کام کرنے والوں پر ٹیکس عاید کر کے بیکار لوگوں کی پرورش کرنا ملک کے حق میں مضرت بخش ہے۔ اس رعایت کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ محتاجین کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح ہو یا غلط لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ لندن کے بازاروں میں گداگروں کی مصیبت نہیں ہے۔

وسعت اخلاق

یہاں کے لوگوں کے اخلاق عام طور پر اچھے ہوتے ہیں اجنبی آدمی کو راستہ بتانے میں یا اور کوئی واجبی امداد دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ لندن میں راستہ پوچھنے کا اتفاق اکثر مجھ کو ہوا ہے کبھی کسی نے پہلو تہی نہیں کی۔ بلکہ بہت اخلاق کے ساتھ ممکنہ امداد دی۔ کسی نے معاوضہ بھی نہیں مانگا۔ عام طور پر قاعدہ یہ ہے کہ پولس کانسٹبل سے امداد لیجاتی ہے۔ مگر بعض دفعہ یہ شخص موقع پر نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں راستہ چلنے والوں سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ لندن میں رات کے گیارہ بجے تک میں رہا۔ کیونکہ نیا نیا آیا ہوا تھا مکان جانے کا راستہ ذہن سے نکل گیا۔ سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ میں لندن برج اسٹیشن چلا جاتا۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل سیدھی جاتی ہے۔ یا وکٹوریہ اسٹیشن سے فارسٹ ہل کی ٹریم میں سوار ہو جاتا۔ اس وقت ان راستوں کا خیال نہ رہا۔ ایک شخص نے کہا

کہ وکٹوریہ اسٹیشن سے ریل کے ذریعہ سیدھے کرسٹل پیلس کو چلے جاؤ۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل ملجائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ بہت چکر کا تھا مگر اس شخص کے معلومات محدود تھے۔ اس کی ہدایت کے مطابق وکٹوریہ اسٹیشن جا کر میں نے کرسٹل پیلس کا ایک ٹکٹ خریدا۔ ابھی ریل میں نہ بیٹھا تھا کہ پلیٹ فارم پر ایک ٹکٹ کلکٹر ملا۔ اس نے یہ مشورہ دیا کہ کرسٹل پیلس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ راستہ میں ایک اسٹیشن ویسٹ نارا وڈ ملیگا۔ وہاں اتر جاؤ۔ وہاں سے فارسٹ ہل کو ریل جاتی ہے۔ میں نے اس کے مشورہ پر عمل کیا۔ لیکن نارا وڈ کے پلیٹ فارم پر ریلوے کا ایک ملازم ملا جس نے کہا تم نے بڑی غلطی کی۔ سیدھے کرسٹل پیلس چلے جاتے تو فارسٹ ہل کی ریل ملجاتی یہاں سے بھی ریل جایا کرتی ہے لیکن اس وقت بارہ بجے ہیں۔ آخری ریل ابھی چھٹ گئی۔ اب صبح تک کوئی ریل نہیں جائے گی۔ یہ سنکر بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں لندن میں بالکل اجنبی ہوں۔ یہاں آکر چار پانچ روز ہوئے ہیں لندن کے اسٹیشن پر ایک ٹکٹ کلکٹر نے یہاں اترنے کا مشورہ دیا تھا۔ اب تم لوگ کچھ امداد کرو۔ اس نے کہا اچھا تم میرے ساتھ اسٹیشن پر آؤ۔ میں کوشش کرتا ہوں اسٹیشن پر جانے کے بعد اس نے میرے مواجہ میں کرسٹل پیلس کے اسٹیشن ماسٹر کو ٹیلیفون دیا اور کہا کہ اس طرح ایک اجنبی آدمی یہاں اتر گیا ہے۔ ریل والوں نے ان کو مشورہ غلط دیا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔ یہ دوسری ریل سے کرسٹل پیلس آتے ہیں۔ وہاں سے جو آخری ریل جانے والی ہے اس کو دو منٹ کے لئے ٹھیرا لو ورنہ ان کو بڑی پریشانی ہوگی۔ ادھر سے جواب ملا کہ اب کوئی ریل جانے والی نہیں ہے۔ اس اثناء میں ریل کا ایک افسر وہاں آگیا۔ اس سے جب تمام قصہ کہا گیا تو اس نے کہا فکر مت کرو۔ میں خود کرسٹل پیلس جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ ریل میں بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو مال گاڑی میں سوار کرا دوں گا۔ دو تین منٹ بعد ریل آئی۔ اور اس افسر نے

مجھ کو اپنے ساتھ درجہ اول میں بٹھا لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے ماتحت ملازم نے میرے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس کو کچھ معاوضہ دوں اس نے کہا اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر تم دینا چاہتے ہو تو مجھ کو اعتراض بھی نہیں ہے۔ میں نے ایک شلنگ اس شخص کو دیا۔ کرسٹل پیلیس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مال گاڑی کے جانے میں تاخیر ہے۔ ریلوے افسر نے مجھسے کہا اس کا انتظار نہ کرو ورنہ صبح کو تین بجے تک مکان پہونچو گے۔ بہتر یہ ہے کہ ٹیکسی لیکر فارسٹ ہل چلے جاؤ۔ میں نے کہا مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت ٹیکسی کہاں ملے گی اس پر افسر مذکور نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو باہر لیجاؤ اور ایک ٹیکسی لیکر ٹیکسی والے کو سمجھا دو کہ اجنبی ہیں۔ ان کو فارسٹ ہل ان کے مکان پہنچا دے چنانچہ اس ملازم کی امداد سے ٹیکسی تلاش کی گئی۔ لندن کے اس حصہ میں رات کے وقت ٹیکسی آسانی کے ساتھ نہیں ملتی۔ اس لئے کچھ وقت تلاش میں صرف ہوا۔ فارسٹ ہل کی جس گلی میں ہمارا مکان تھا اس کا نام تو مجھے یاد تھا لیکن مکان کا نمبر یاد نہ رہا۔ اس سڑک پر اندھیرا بھی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُدھر سے ادھر کئی چکر لگائے مگر مکان نہ ملا۔ موٹر والے نے کہا جب تک نمبر نہ معلوم ہو میں مکان کا پتہ نہیں چلا سکتا مکان والوں کے نام سے کچھ مدد نہ ملیگی۔ بالاخر میں موٹر سے اتر کر بہت تفصیل کے ساتھ مکانات کو دیکھتا گیا۔ بڑی جستجو کے بعد مکان ملا۔ موٹر والے نے کہا۔ اچھی طرح سے اطمینان کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ آدھی رات کے وقت کسی غیر مکان میں داخل ہو جاؤ خدا کا شکر ہے کہ اس بے لطفی کی نوبت نہ آئی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ میں رات کو گیارہ بجے کے قریب لندن سے واپس آیا۔ ٹریم سے اتر کر مکان جا رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک وزنی سوٹ کیس بھی تھا جس کی وجہ سے جگہ جگہ ٹھیر کر آرام لینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک شخص موٹر سائیکل پر جس میں

ایک سائڈ کار بھی لگی ہوئی تھی پہلو سے گذرا۔کچھ دور جا کر وہ ٹھیر گیا۔میں جب قریب پہونچا تو اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا مکان دور ہے ۔اور سوٹ کیس کی وجہ سے تم کو زحمت ہو رہی ہے ۔کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں ۔میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے کہا کہ مکان میرا قریب آگیا ہے ۔اس لئے تم کو تکلیف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ایک روز یہ ہوا کہ کیمڈن اسکوئر میں ایک دوست کا مکان تلاش کر رہا تھا ۔اس نواح میں متعدد گلیاں ہیں اس لئے کسی قدر زحمت پیش آئی ۔ایک سن رسیدہ عورت گوشت ترکاری کی ٹوکری ہاتھ میں لئے جا رہی تھی ۔اس سے میں نے راستہ دریافت کیا اس نے کہا میں خاص اس گلی کی طرف تو نہیں جا رہی ہوں لیکن کچھ دور تک چلکر تم کو راستہ ضرور بتلا دوں گی ۔کہتی تھی کہ تم اس ملک میں اجنبی معلوم ہوتے ہو ۔میں نے جواب دیا کہ ہندوستان سے آتا ہوں اور لندن آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوا ۔اس نے کہا تعجب ہے کہ تم انگریزی اچھی طرح بولتے ہو ۔معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لوگ انگریزی پڑھتے ہیں ۔حسن اتفاق دیکھو کہ کچھ دنوں بعد یہی عورت اسی نواح میں مجھ کو ملی اور میں نے اس سے پھر راستہ پوچھا لیکن میں اس کو پہچان نہ سکا ۔اس نے خود ہی سوال کیا کہ "تم وہی اجنبی ہو ۔جس کی مدد میں نے چند روز پہلے کی تھی؟" ۔اس وقت مجھ کو بھی خیال آیا اور میں نے کہا کہ وہی شخص ہوں ۔اور ممکن ہے کہ میں تیسری دفعہ پھر تم ہی سے راستہ دریافت کروں ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ اگرچہ خشک ہیں لیکن وقت ضرورت اس قسم کی امداد دینے میں دریغ نہیں کرتے ۔

لندن کی پولیس

اجنبی آدمی کو پولس کانسٹبل سے بڑی مدد ملتی ہے ۔یہ شخص اگرچہ اپنے فرایض میں ہر وقت مصروف رہتا ہے ۔اور بات کرنے کی فرصت نہیں رہتی ۔لیکن راستہ بتانے میں کبھی کوتاہی نہیں

کرتا ۔ اگر خود اس کو معلوم نہیں ہے تو جیب میں سے گائڈ بک نکالکر دیکھے گا ۔ غرض یہ کہ ہر ممکن طریقہ سے امداد کریگا ۔ یہاں پولس کے ملازم بڑے بڑے قد کے اور تنو مند لوگ ہوتے ہیں ۔ لندن کے متعلق ان کے معلومات بہت وسیع ہوا کرتے ہیں ۔ کانسٹبل کی تنخواہ تقریباً ڈھائی سو روپیہ مہینہ ہوتی ہے ۔

ہندوستان کے حالات سے بے خبری

یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ یہاں کے لوگ ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات سے عام طور پر ناواقف ہیں ۔ یوں تو اخبار بینی کا شوق عام ہے مگر ان کی دلچسپی کی باتیں کچھ اور ہوتی ہیں ۔ ہندوستان کی خبروں کو سرسری طور پر پڑھتے ہیں ۔ اکثر آدمیوں سے ہندوستان کے متعلق گفتگو کا موقع ہوا ۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کو معلوم نہیں ۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عام ہو گئی ہے اور لوگ انگریزی سمجھتے ہیں ۔ لندن کے ایک ہوٹل میں چند انگریز ٹھیرے ہوئے تھے ۔ کھانے کے وقت ان سے میری بات چیت ہوئی ۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں حال ہی میں ہندوستان سے آیا ہوں تو تعجب کے ساتھ پوچھتے تھے کہ کیا ہندوستان کے مدارس میں انگریز مدرس اور پروفیسر پڑھاتے ہیں ۔ بعض کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ کالے ہوا کرتے ہیں ۔ تمہارا رنگ گورا کیسے ہے ۔ ان کے تصور میں ہندوستانی سب کالے ہوتے ہیں ۔ اکثر یہ ہوا کہ لوگ سوال کرتے کہ تم کہاں سے آئے ہو میں جواب دیتا کہ تم خود ہی پہچان لو کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں ۔ کوئی کہتا جنوبی فرانس ۔ کوئی کہتا اسپین ۔ دو ایک نے مصر کا نام لیا لیکن کسی نے اصل حقیقت کو نہیں پہچانا ۔

ایک لطیفہ

ایک غلط فہمی یہاں کے لوگوں کو یہ بھی ہے کہ ہندوستان

میں سب لوگ متعدد بیویاں رکھتے ہیں - ہمارے مکان میں لٹویا کی طرف کی جو لڑکی ٹھیری ہوئی تھی اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ روایت مبالغہ کے ساتھ بیان کی جاتی ہے - میں نے اس کو ہرچند یقین دلانا چاہا کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جو وقت واحد میں دو نکاح کرتے ہوں - وہ کہتی تھی میں نے معتبر ذرایع سے سنا ہے کہ کوئی ہندوستانی ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتا - ایک روز اس معاملہ سے متعلق بڑا لطیفہ رہا - پڑوس کے مکان میں ایک اور لڑکی لٹویا کی ٹھیری ہوئی تھی - یہ اپنے ہم وطن سے ملنے کے لیے ہمارے مکان میں اکثر آیا کرتی تھی - اس کا بھی یہی خیال تھا - اکثر مجھ سے پوچھا کرتی تھی کہ تمھارا حرم کتنا بڑا ہے اور ہندوستانی اس قدر بیویوں کے ساتھ کیسے خوش رہتے ہیں - ایک دن راستہ میں اس سے ملاقات ہوئی - اس نے حسب عادت یہی تذکرہ چھیڑ دیا - مجھ کو اس وقت مذاق کی سوجھی میں نے کہا ہندوستان میں میری متعدد بیویاں ہیں - لیکن میں چاہتا ہوں کہ لندن سے بھی ایک بیوی ساتھ لیتا جاؤں چنانچہ ایک انگریزن میرے ساتھ نکاح پر آمادہ ہو گئی ہے اور کل شام کو میرا نکاح ہے - میں تم کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ آکر محفل عقد میں شریک ہو اور چائے وہیں پیو - اگرچہ یہ گفتگو مذاقیہ تھی لیکن وہ اس کو واقعہ سمجھی اور بہت جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے لڑنے لگی کہ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیئے اور پوچھتی تھی کہ اس لڑکی کو تم نے اطلاع دے دی ہے یا نہیں کہ ہندوستان میں تمہاری متعدد بیویاں موجود ہیں - میں نے کہا اطلاع دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس لڑکی نے خود مجھ سے دریافت نہیں کیا - بہرحال تم ضرور شریک ہونا - اس گفتگو کے بعد میں لندن چلا گیا مگر وہ لڑکی سیدھی ہمارے مکان پر گئی - مالکہ مکان سے تمام واقعہ بیان کیا اور اصرار کیا کہ اس نکاح کو کسی طرح روکنا چاہیئے - میں جب مکان واپس آیا تو مالکہ نے مجھ سے بہت بےچینی کے ساتھ کہا کہ مسٹر بیگ اگر تم برا نہ مانو

تو میں تم سے ایک بات دریافت کروں۔ میں نے کہا بہت شوق سے پوچھو۔ اس پر اس نے پوچھا کیا یہ صحیح ہے کہ تم یہاں کسی لڑکی سے عقد کرنے والے ہو۔ میں نے جب اصلی واقعہ بیان کیا تو وہ بہت ہنسی۔ اس کے بعد جب کبھی وہ لڑکی ہمارے یہاں آتی تو سب ملکر اس کا مذاق اڑاتے۔ اس واقعہ سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہاں کے لوگ پسند نہیں کرتے کہ انگریز لڑکیاں ہندوستانیوں سے شادی کریں

بین الاقوامی شادیاں

انگریزوں کی طرح ہندوستان کے لوگ بھی اس بین الاقوامی شادی کو پسند نہیں کرتے۔ حقیقت میں یہ ایک بے جوڑ بات ہے۔ اس مصیبت کا شکار زیادہ تر ہمارے ہاں کے نوعمر طالب علم بنتے ہیں۔ آغاز جوانی میں جذبات پر قابو اور دوراندیشی کو پیش نظر رکھنا کسی قدر مشکل کام ہے۔ بالخصوص غیر ملک میں جہاں نہ تو والدین نگرانی قایم رکھ سکتے ہیں اور نہ دوسرے بہی خواہ نیک مشورہ دینے والے موجود ہوتے ہیں صورت حال اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہندوستان سے جو طالب علم یورپ جاتے ہیں وہ اکثر اچھے خاندان کے ہوتے ہیں لیکن تعصب قومی کی وجہ سے انگلستان میں شریف الخاندان اور مساوی درجہ کے لوگ ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے۔ بھلا اچھے خاندان کی لڑکی شادی کے واسطے کیوں ملنے لگی تھی۔ البتہ معمولی طبقہ کی وہ لڑکیاں جو بے روزگار ہوتی ہیں یا ملازمت کرکے اپنی زندگی کے دن کاٹتی ہیں اور کوئی پرورش کرنے والا ان کو نصیب نہیں ہوتا ہندوستانی طالب علموں کو اپنا شکار بنا لیتی ہیں۔ ابتداء میں محبت کے جذبات فریقین کو اندھا کر دیتے ہیں مگر نکاح کے بعد جب یہ عورتیں ہندوستان آتی ہیں تو ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ یہاں کی طرز معاشرت اور آب و ہوا ان کو ناپسند ہوتی ہے ان کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے کسی پرند کو قفس میں بند کر دیا ہو ہندوستانی

شوہر کے والدین اور اقرباء الگ ناراض رہتے ہیں - الغرض زندگی ایک مصیبت ہو جاتی ہے - انگریزنیاں کسی نہ کسی طرح اپنے وطن کو واپس چلی جاتی ہیں - نان نفقہ کے واسطے نالش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - قومی برتری کی وجہ سے وہ اکثر کامیاب رہتی ہے - دیسی شوہر کی تو اچھی طرح خانہ بربادی ہوئی - مگر ولایتی بیوی اپنے وطن میں گل چھرے اڑاتی رہتی ہے - ایک تو بیوی ہاتھ سے گئی - دوسرے اس کو منصب بھی دینا پڑا - شماتت ہمسایہ اس کے ماسوا ہے - گویا سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا -

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے -

گئے دو تو جہاں سے خدا کی قسم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے -

ایسی مثالیں کم پاؤ گے کہ یہ گنگا جمنی میل راس آیا ہو - راس بھی آتا ہے تو اس طرح کہ خاوند اپنے عزیز و اقارب سے بالکل الگ ہو کر بود و باش اختیار کرے - کیونکہ ہندوستان آنے کے بعد ولائتی بیوی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یوروپین اقوام ہندوستانیوں کے ساتھ برتاؤ کیسا رکھتے ہیں - مدارج کا احساس ہو جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر رہے - اس بیوی کو خوش رکھنے کے لئے اخراجات بھی کیسے کیسے لاحق ہوتے ہیں - روزمرہ کے خرچ کو جانے دو لیکن موسم گرما میں میم صاحبہ رنگ لاتی ہیں یا تو پہاڑ پر جا کر رہیں گی یا وطن یاد آئیگا - اگر شوہر دولتمند ہے تو خیر ورنہ متوسط درجہ کا آدمی یہ بار کیسے اُٹھا سکتا ہے - الغرض کامیاب شادی آدھی خانہ بربادی کے قریب ہے -

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اولاد کا کیا حشر ہو گا - نہ تو خالص یوروپین نہ خالص ہندوستانی - ایک خاص اصطلاح ان کے لئے وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے - شادی بیاہ کے موقعہ پر ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا

وہ ظاہر ہے۔ اینگلو انڈین اور یوریشین حضرات کو دیکھو۔ یورپین لوگ تو ان کو منھ بھی نہیں لگاتے۔ اور ہندوستانیوں میں اپنے کو شمار کرنا یہ خود اپنی ذلت خیال کرتے ہیں سوسائٹی میں ان کی جو کچھ وقعت ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ خدا ہمارے نوجوانان وطن کو نیک ہدایت دے۔

کالے گورے کا تعصب

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہاں کے لوگ ہندوستانیوں کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کے ساتھ تعصبانہ برتاؤ کرتے ہیں اس خصوص میں اکثر واقعات میں نے سنے ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو طالب علم ہیں مجھ سے کہتے تھے کہ ایک دفعہ وہ اپنے قیام کے لئے مناسب جگہ تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ ایک مکان پر یہ نوٹس لگا دیکھا کہ یہاں کمرے خالی ہیں۔ انھوں نے مالک مکان سے جب ملاقات کی تو اس نے کہا کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ میرے دوست نے کہا تمہارے نوٹس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جگہ خالی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نوٹس غلطی سے لگا ہے۔ میں ابھی اس کو اتارے لیتی ہوں یہ کہکر اس نے نوٹس بورڈ اتار لیا۔ یہ وہاں سے چلے آئے لیکن اتفاق سے دوسرے ہی دن جب ادھر سے گذرے تو وہی نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔ انھوں نے دوبارہ مالکہ مکان سے دریافت کیا۔ آخر کار اس نے صاف صاف یہ کہدیا کہ میرے دوسرے مہمان اس مکان میں ہندوستانیوں کا ٹھیرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے میں مجبور ہوں

اس قسم کے واقعات کے متعلق حال ہی میں ایک صاحب نے پارلیمنٹ میں بھی سوال کیا تھا۔ جواب صرف اس قدر ملا کہ کاروباری معاملات میں حکومت دخل نہیں دے سکتی یہ کیفیت کچھ انگلستان کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ امریکہ میں یہاں سے زیادہ تعصب ہے۔ ایک روز ہائڈ پارک میں یہ تماشہ میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا آدمی جو غالباً آفریقہ کی طرف کا رہنے والا تھا۔ چند لڑکیوں کیساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا لڑکیاں اس کا مذاق

اڑا رہی تھیں ۔ کچھ دیر کی تفریح کے بعد یہ لڑکیاں اس کو چھوڑ کر چلی گئیں ۔ اس کے چہرہ سے مایوسی اور ملال کے آثار نمایاں تھے ۔ شاید وہ اس غلط فہمی میں تھا کہ کسی لڑکی سے دوستی ہو جائے گی لیکن یہ خبر نہ تھی کہ ۔ع۔ ایں خیال است و محال است و جنوں

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

بھلا انگلستان کی عورتیں کب کالے رنگ کو پسندیدہ نظر سے دیکھتی ہیں ۔ البتہ فرانس اور جرمنی میں اس کا خیال کم ہے ۔ میں نے برلن اور پیرس کے ناچ گھروں میں حبشیوں کو یورپین عورتوں کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا ہے ۔ رنگ کا تعصب فرانس میں سب سے کم پایا گیا ۔ میرے ایک دوست مجھ سے کہتے تھے کہ ایک دن وہ پیرس کے کسی رسٹوراں میں کھانا کھا رہے تھے ۔ مقابل کی میز پر کچھ انگریز سیاح بیٹھے ہوئے تھے ۔ اتنے میں ایک سیاہ رنگ کا آدمی آیا اور انگریزوں کی میز پر بیٹھ گیا انگریزوں نے مینجر سے شکایت کی اور چاہا کہ وہ اس کالے آدمی کو وہاں سے اٹھا دے ۔ مینجر نے صاف الفاظ میں یہ کہدیا کہ یہ انگلستان نہیں ہے پیرس میں کالے گورے کا فرق نہیں کیا جا سکتا ۔ انگریز برانگیختہ ہو کر وہاں سے چلے گئے ۔ راوی معتبر ہیں اس لئے میں نے اس واقعہ کا تذکرہ کر دیا ۔

ایک روز ان ہی باتوں کا ذکر ہمارے مکان میں ہو رہا تھا ۔ میں نے مالکہ مکان سے دریافت کیا کہ تم لوگ ہندوستانیوں کو تہذیب اور انسانیت سے خارج سمجھتے ہو ۔ اس نے کہا میں تم سب کو اچھے کپڑے پہنتے ہوئے دیکھتی ہوں اور سب کے خیالات اچھے پاتی ہوں ۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ ہندوستانی شائستہ ہوتے ہوں گے بلکہ میں چاہتی ہوں کہ میرے مکان میں زیادہ تر ہندوستانی ٹھیرا کریں ۔

شادی کے متعلق خیالات

ہماری مالکہ مکان اکثر ہندوستان کی معاشرت کے متعلق حالات دریافت کرتی تھی ۔ یہ سنکر وہ خوش ہوئی کہ

ہندوستان میں شادیاں والدین کی مرضی پر ہوا کرتی ہیں - اور شاکی تھی کہ ہمارے ملک میں والدین کی اب تو نہ وہ وقعت ہے جو پہلے تھی اور نہ اولاد پر ہم کو کچھ اختیار ہے پچھلے زمانہ کی تعریف کرتی تھی - کہتی تھی کہ اس وقت اتنی خودسری نہ تھی - ماں کے ان خیالات سے لڑکی کو اتفاق نہ تھا - وہ موجودہ رواج کی حامی تھی - ماں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ کئی دفعہ میری لڑکی کی نسبت کا موقع آیا اور میں چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہو جائے لیکن اس کو کوئی نسبت پسند ہی نہیں آتی - خدا معلوم اس کا حشر کیا ہونے والا ہے باپ بیچارہ بھی اسی غم میں مبتلا تھا - میں نے دو ایک دفعہ مس ویب سے دریافت بھی کیا کہ تم کیوں شادی نہیں کرتی ہو - تمہارے والدین اس بات پر تم سے ناراض بھی ہیں - وہ کہتی تھی کہ یہ کام والدین کے خوشی کرنے کے واسطے نہیں ہوا کرتا - اس کا اثر میری زندگی پر ہوگا نہ کہ والدین کی - جن آدمیوں کو میرے والدین شادی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں وہ مجھے پسند نہیں - آج کل مردوں کو اپنا پیٹ پالنا مشکل ہو رہا ہے - بیوی کی پرورش کیا کریں گے -

انگلستان میں بلکہ یورپ میں یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ شادی نہیں کرتے جنگ عظیم کے بعد سے اول تو مردوں کی تعداد کم ہو گئی ہے دوسرے گرانی اور بے روزگاری نے بہت پریشان کر رکھا ہے - جہاں تک ممکن ہے تجرد ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں جن لوگوں نے شادی کر لی ہے - وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ اولاد زیادہ نہ ہونے پائے کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت میں اخراجات لاحق ہوتے ہیں - شادی کے مخالفین کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی جا رہی ہے - چنانچہ اعداد و شمار پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹ء سے سنہ ۲۱ء تک انگلستان میں انیس آدمی فی ہزار شادی شدہ تھے لیکن سنہ ۲۷ء میں ان کی تعداد سولہ سے اوپر نہ تھی - عورت اس فکر میں رہتی ہے کہ خاوند ایسا ہو جو اس کو آرام کے ساتھ گھر میں بٹھائے نوکری کی ضرورت

نہ ہو سعر د چاہتا ہے کہ بیوی بھی کما کر لائے - غرض اس پھیر میں پڑے رہتے ہیں - یہ تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کے لوگوں میں توالد و تناسل کی طرف رغبت نہیں ہے کیونکہ یہ جذبہ بالکل فطرتی ہے اور فطرت کا عمل ساری دنیا میں یکساں ہے - لیکن بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر یہ لوگ اقتصادی پہلو سے نظر ڈالتے ہیں - بیروزگاری کی موجودہ حالت کیا کم تکلیف دہ ہے - افزائش نسل اگر جاری رہے تو اس مصیبت میں اور ترقی ہو جائے گی اس لئے تجرد کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو اخلاقی نقطۂ خیال سے بہت تاریک ہے -

عورت ہو کہ مرد خواہشات نفسانی کی تکمیل سب کو کرنی پڑتی ہے - یہ قدرت کا ایسا تقاضہ ہے کہ اگر اس کی تعمیل نہ کی جائے تو انواع و اقسام کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑیگا - یورپ میں فی الحال اس فرض کو ادا کرنے کے لئے تین طریقے رائج ہیں - تجرد پسند گروہ کے بعض لوگ فاحشہ عورتوں کے ذریعہ اپنی حاجت روائی کرتے ہیں - جس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں مرد اور عورت امراض مخصوص میں مبتلا ہیں - حکومت کی طرف سے فاحشہ عورتوں کو تندرست رکھنے کا کوئی انتظام انگلستان میں نہیں ہے - اگرچہ عملی طور پر فاحشہ عورتوں کی گرم بازاری ہے - مگر حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ باضابطہ طریقہ پر اس کو تسلیم کرے بلکہ انجان رہنا مرغوب خاطر ہے - یہی کہنے میں فخر سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ معیوب طریقہ قانوناً ممنوع ہے - اس کے خلاف فرانس اور بعض دیگر ممالک میں سرکار کی طرف سے فاحشہ عورتوں پر نگرانی رکھی جاتی ہے اور اس مرض منحوس کے روک تھام کی حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے - تجرد پسند گروہ میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زناکاری کے مہذب طریقہ کی طرف مائل ہیں - یہ لوگ کسی ایک شریف عورت سے تعلقات پیدا کر لیتے ہیں - اگرچہ باقاعدہ نکاح نہیں کرتے لیکن یہ تعلق نکاح کے مساوی ہے

ایسی عورت کو اگر داشتہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا - فرق صرف یہ ہے کہ داشتہ کو علانیہ طور پر اپنے مکان میں رکھنا معیوب سمجھتے ہیں - اگر اس تعلق سے اولاد پیدا ہو جائے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں - اس عورت کی سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں ہوتی - انگریز قوم میں ہم نے یہ بات دیکھی کہ ہر عیب کو رازداری کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں فرانس اور جرمنی میں پردہ داری کا لحاظ کم ہے - تیسرا گروہ جس کی تعداد بہت کم ہے - شادی کو پسند کرتا ہے - لیکن ضبط حمل کا رجحان سب میں عام ہے -

ایک دلچسپ مقدمہ

حال میں ایک دلچسپ مقدمہ عدالت میں پیش تھا - خاوند نے اپنی بیوی کے مقابلہ میں حصول طلاق کے واسطے نالش کی تھی اور حجت اس نے یہ برپا کی تھی کہ میری بیوی مختلف ترکیبوں سے استقرار حمل کو روکتی ہے حالانکہ مجھ کو اولاد کی خواہش ہے - عورت نے یہ جواب دیا کہ میرے خاوند کی آمدنی اس قدر کافی نہیں ہے کہ اولاد کی پرورش ہو سکے اس لئے میں اپنے عمل میں حق بجانب ہوں - عدالت نے عورت کے حق میں فیصلہ صادر کیا -

حالیہ قانون کی رو سے بلا تخصیص جنس سولہ سال کی عمر شادی کے لئے لازمی قرار دی گئی ہے لیکن بالعموم زیادہ عمر میں شادی کرتے ہیں - یہاں ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ دولھا کی عمر اسی سال کے قریب اور دلہن پندرہ برس کی - اس کے برعکس بھی دیکھا گیا ہے - مثلاً دلہن کی عمر ساٹھ سال کے قریب اور دولہا چوبیس سال کا - اخباروں میں اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں معلوم ہوا کہ ایسی باتوں کے لئے کچھ ہندوستان ہی مخصوص نہیں ہے -

مزدوری

ہندوستان کی نسبت یہاں مزدوری بہت زیادہ ہے

چنانچہ گھر میں کام کرنے والی ماما کم سے کم آٹھ روپیہ فی ہفتہ لیتی ہے۔ دکان پر کام کرنے والی عورت پچیس روپیہ فی ہفتہ کما لیتی ہے۔ ہمارے ہاں تیس روپیہ مہینہ پر شوفر آسانی کے ساتھ ملجائے گا۔ لیکن یہاں اس کی یافت ساٹھ روپیہ فی ہفتہ کے قریب ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ اخراجات زندگی یہاں بہت زیادہ ہیں مثلاً ایک درجن انڈوں کی قیمت دو روپیہ پانچ آنے کے قریب ہوتی ہے۔ گوشت بالاوسط دو روپیہ سیر ملتا ہے۔ کپڑوں کی دھلوائی بھی زیادہ پڑتی ہے۔ ایک کالر کے دو آنے اور قمیص کے پانچ آنے ہوتے ہیں یہ معلوم کرکے شاید تعجب ہوگا کہ حکومت کے جلیل القدر عہدہ داروں کی تنخواہ ہندوستان کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ تنخواہ دس ہزار پونڈ سالانہ لارڈ چانسلر کی ہے اور وزیر اعظم کی تنخواہ اس کی نصف ہے۔

مکانات یہاں کے مکانات میں اگرچہ صحن بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن حتی المقدور روشنی اور ہوا کا بندوبست رکھتے ہیں۔ آب ہوا کے لحاظ سے مکان کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی طرح دالان اور دراندے نہیں ہوتے۔ تمام مکان کمروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ عمارت کے اندر ہی بیت الخلا ہوا کرتا ہے لیکن یہ بالکل اس وضع کا ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں ریلوں کے درجہ اول اور دوم میں ہے۔ بھنگی کی ضرورت نہیں۔ نل کے ذریعہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ اب حیدرآباد میں بھی یہ طریقہ رائج ہونے والا ہے۔ اس انتظام میں خوبی یہ ہے کہ غلاظت اور بدبو نہیں ہونے پاتی۔ حمام میں حوض نما ٹب ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کر نہانے کا رواج کم ہے۔ حوض میں حسب ضرورت گرم اور سرد پانی نل کے ذریعہ آتا رہتا ہے۔ مکان کا دروازہ ہمیشہ بند رکھنے کا رواج ہے۔ باہر کی طرف ایک بٹن لگا دیتے ہیں۔ جس کے دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے مکان میں

رہنے والے دروازہ کی متعدد کنجیاں اپنے پاس رکھتے ہیں تاکہ غیر وقت مکان میں داخل ہونے کیلئے گھنٹی بجا کر دوسروں کو پریشان کرنے کی نوبت نہ آئے۔ مالکہ مکان نے مجھ کو بھی ایک کنجی دے دی تھی۔ مکان کے اندر بھی کمرہ کا دروازہ بند کر کے بیٹھتے ہیں۔ کبھی کھلا نہیں چھوڑتے کسی کو اندر آنے کی ضرورت ہو تو وہ پہلے دروازہ پر کھٹکھٹائیگا اور جب اس کو اجازت ملیگی وہ اندر آئے گا۔ یہ قاعدہ تمام یورپ میں عام ہے۔ ایک کمرہ ملاقات کے لئے مختص ہوتا ہے اور ایک کھانے کے لئے۔ آرایش حسب حیثیت ضرور ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ تقریباً سولہ فیصدی مکانات ایسے ہیں جن میں کم سے کم تین کمرے ہیں اور پانچ فی صدی ایسے ہیں جن میں کمروں کی تعداد آٹھ سے اوپر ہے۔

آزادی کا دعویٰ

اس ملک میں اگرچہ حقوق کی آزادی کا بہت کچھ دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قانون کی جکڑ بندی نے آزادی کو سلب کر لیا ہے۔ بقول شخصے اگر سانس بھی لو تو قانون کے مطابق لینا پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے قاعدہ اور قانون موجود ہے کسی کی مجال نہیں جو خلاف ورزی کر سکے۔ ایک قانون تو حکومت کا بنایا ہوا ہے اور دوسرا سوسائٹی کا ہے جس کو اٹیکیٹ کہتے ہیں۔ یہاں کی زندگی ان دونوں قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر قانون اپنی جگہ سخت گیر ہے۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل　　کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

شام کو چھ بجے قانوناً سب دکانیں بند ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ دیا سلائی کی ڈبیہ بھی خرید نہیں سکتے۔ اکثر اوقات اس قانون کی وجہ سے سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے ایک روز مجھ کو کسی چیز کی فوری ضرورت ہوئی چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں تیز قدمی کے ساتھ اپنے مکان سے بازار گیا۔ ٹھیک (۶) بجے ایک

چنانچہ میں داخل ہوا۔ دکان دار سے چیز مانگی۔ اس نے کہا معاف کیجیے چھ بج گئے ہیں۔ میں نے کہا زیادہ دیر نہیں ہوئی اور مجھ کو سخت ضرورت ہے۔ اس نے کہا بالکل ناممکن ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ قانون کی پابندی اس ملک میں سختی کے ساتھ کی جاتی ہے چنانچہ حال ہی میں ایک شخص پر بعد از وقت ڈبل روٹی بیچنے کی علت میں پانچ شلنگ جرمانہ ہوا ہے حالانکہ اس کا عذر یہ تھا کہ ایک بیمار کے لئے روٹی کی سخت ضرورت تھی۔ مجھ کو یہ سنکر بہت تعجب ہوا۔ میں نے دکان دار سے کہا تم لوگ ناحق اپنی آزادی پر فخر کرتے ہو۔ یہ تو ایک طرح کی غلامی ہے۔ اس نے میری رائے کے ساتھ اتفاق کیا۔ لندن کے اخباروں میں اکثر اس نوعیت کے مقدمات چھپتے رہتے ہیں۔ انگریزی مٹھائیوں میں ایک قسم کی مٹھائی ہوتی ہے جو کھانسی کے لئے مفید سمجھی جاتی ہے۔ ایک مٹھائی والے نے چھ بجے کے بعد ایک شخص کو یہ مٹھائی فروخت کی قانون کے مطابق اس پر مقدمہ قایم کیا گیا۔ جواب اس نے یہ پیش کیا کہ خریدنے والا کھانسی کا مریض تھا۔ مٹھائی جو بیچی گئی وہ ایک قسم کی دوا بھی ہے۔ اس لئے جرم عاید نہیں ہوتا۔ اس جواب سے عدالت کی تشفی نہ ہوئی۔ اور ملزم پر دس شلنگ جرمانہ کیا گیا۔ خالص شراب کی دکانیں رات کو گیارہ بجے بند ہو جاتی ہیں۔ البتہ کھانے کی دکانوں میں کھانے کے ساتھ ساڑھے بارہ بجے تک شراب دیجاسکتی ہے جو ایک بجے تک پی لینی چاہیئے۔ اس کے بعد میز پر کوئی گلاس شراب کا دکھائی دے تو قانون اپنا عمل کریگا۔ فرانس کے لوگ اس معاملہ میں خوش نصیب ہیں کہ وہاں ایسی پابندیاں نہیں ہوتیں۔ لندن میں ہفتہ کے دن ایک بجے سے تعطیل عام ہو جاتی ہے۔ اور اتوار کو تمام دن کاروبار بند رہتا ہے۔ گویا ہفتہ میں ڈیڑھ دن تعطیل رہتی ہے۔ اور تمام دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔

لندن سے روانگی

خدا کا شکر ہے کہ لندن میں دو مہینے خیر و خوبی کے ساتھ گزر گئے ۔ خوب سیر کی اور آرام بھی لیا ۔ گرمی میں روز بروز ترقی رہی ۔ کچھ پرانے دوستوں سے ملے اور کچھ نئے دوست پیدا ہو گئے یاد ہو گا کہ سویز پر جہاز سے اترتے وقت مسٹر اور مسز لشائی اور مسز کروک سے ملاقات ہوئی تھی ۔ لندن میں ان سب سے ملنا ہوا ۔ بڑے وسیع اخلاق کے لوگ ہیں ۔ کئی دفعہ انھوں نے ہماری دعوت کی اور اپنی موٹر میں لندن کی سیر بھی کئی دفعہ کرائی ۔ قومیت کا خیال بھی ان کو کبھی پیدا نہیں ہوا ۔ ہندوستان کے حالات بڑے شوق سے سنتے تھے ۔ شریف آدمیوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے ۔ اپنے قدیم دوست سراج الحق سے ملکر بڑی خوشی ہوئی ۔ یہ ہمارے ملک میں ملازم ہیں ۔ لیکن تحصیل علم کا شوق ایسا ہے کہ رخصت لیکر بغرض تکمیل تعلیم یہاں آئے ہوئے ہیں ۔ محنت اس قدر کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ۔ ان کی مالکہ مکان مجھ سے کہتی تھی کہ تم اپنے دوست کی خبر لو ۔ ایسا نہ ہو کہ اس محنت کا اثر ان کی صحت پر پڑے ۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد یہ میرے ساتھ پیرس تک گئے تھے ۔ جہاز پر جو ڈاکٹر ہمارے ہم سفر تھے ان سے بھی یہاں ملاقات ہوئی ۔ دونوں کسی قدر پریشان حال تھے ۔ کوئی آرام کی جگہ ہمارے سامنے تک ان کو ملی نہیں تھی ۔ بار بار اپنا مقام تبدیل کرتے تھے ۔ پردیس میں وطن کی ڈاک کا بڑا اشتیاق رہتا ہے ۔ لندن میں پیر کے دن ہندوستان کی ڈاک ملتی تھی ۔ بال بچوں کی اور دیگر احباب کی خیریت معلوم کرکے بڑی تسکین ہوتی تھی ۔ محب صادق عبدالرشید صاحب (مہتمم تعلیمات ضلع ورنگل) کے خط گلابی اردو میں بڑا مزہ دیتے تھے ۔ اکبر سلطان ورنگل سے ہفتہ وار مقامی اخبارات کا ایک بلندہ بھجوا دیا کرتے تھے جن سے وطن کی خبریں تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جاتی تھیں عبداللطیف صاحب وکیل ہنمکنڈہ اکثر گرمی کی شکایت کرتے ۔ لکھا تھا کہ اس سال

چنانچہ ۔۔۔۔ اس قدر شدت کی گرمی ہوئی کہ باید و شاید ۔ میں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا
۔۔ بی غیر موجودگی پر خدا کا شکر کرتا ۔ افسوس ہے کہ بعض احباب کو ہمارے خطوط نہیں پہونچے
بعض جگہ ایسا ہوا کہ زبان کی اجنبیت کی وجہ سے خود اسٹامپ نہ خرید سکے ۔ ہوٹل کے ملازم
کو پیسے دیدئے اور اشارہ سے سمجھا دیا کہ ٹکٹ خرید کر خط پر لگا کر ڈالدینا ۔ خدا معلوم
کیا بات ہوئی کہ وہ خطوط ہندوستان تک نہیں پہنچے مثلاً مولوی ولایت علی خان صاحب
کو شکایت تھی کہ خط نہیں پہنچا ۔ اس قسم کے واقعات سفر میں ناگزیر ہیں ۔ بہتر تو یہ ہے
کہ مسافر اپنے ہاتھ سے خط ڈالا کرے ۔ میرے عزیز دوست شمشاد حسین صاحب (مددگار
ناظم کوتوالی) کے ایک بھائی یہاں زیر تعلیم ہیں جذبہ دوستی کو دیکھئے کہ صاحب موصوف
نے بذریعہ تار برقی اپنے برادر خورد کو تاکید کی کہ وہ مجھ سے لندن میں ملاقات کریں
چنانچہ فدا حسین صاحب ناٹنگھم سے لندن مجھ سے ملنے کے لئے اکثر آتے تھے ۔ ایک
دفعہ میں بھی ناٹنگھم چلا گیا تھا ۔ زمانہ قیام لندن میں مولوی غلام یزدانی صاحب کی
ذات سے مجھ کو بڑی تقویت رہی ۔ عزیز گرامی منشن کا میں مشکور ہوں کہ لندن کے
متعلق وقتاً فوقتاً میرے معلومات میں اضافہ فرماتے رہتے تھے ۔

سپٹمبر کے پہلے ہفتہ میں ہم لندن سے پیرس کو روانہ ہوئے ۔ رفیق بیگ میرے
ساتھ تھے ۔ لیکن سلیم بھائی پندرہ روز قبل ہندوستان روانہ ہو چکے تھے ۔ وکٹوریہ اسٹیشن
سے پیرس کو ریل جایا کرتی ہے ۔ اس سے قبل جولائی کے مہینہ میں سراج الحق کے ساتھ
میں پیرس جا چکا تھا اس لئے سلسلہ اس وقت سے شروع کرتا ہوں ۔ ۲۸ جولائی کو شام
چار بجے کے قریب وکٹوریہ اسٹیشن سے ہم روانہ ہوئے اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پیرس
کے اسٹیشن گا ر ے نار پر پہونچے ۔ خوش قسمتی سے انگلش چینل سکون کی حالت میں
تھا ورنہ اکثر اس میں تموج رہتا ہے ۔ ڈوور سے کیلے تک اسٹیمر میں وقت
اچھا گزرا ۔ مسافروں کی کثرت تھی ۔ اسباب چاروں طرف منتشر پڑا تھا ۔ ہوا کسی قدر

تیز اور سرد چل رہی تھی۔ اسٹیمر پر سب سے پہلے پاسپورٹ کی جانچ پڑتال ہوئی اسکے بعد لوگ اپنے اپنے آرام کی فکر کرنے لگے۔ اس گڑبڑ میں سراج الحق کی ٹوپی کہیں کھوگئی یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب کہ ہم اسٹیمر سے بندرگاہ پر اتر چکے تھے۔ اسٹیمر پر واپس جاکے ہر چند ٹوپی کو تلاش کیا مگر نہ ملی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح کھوگئی۔ کیلے پر اسٹیمر سے اترنے کے بعد کسٹم ہاوز یعنے محصولخانہ میں سب کو جانا پڑتا ہے۔ میں معائنہ اسباب کے بعد ریل کی طرف جارہا تھا۔ کہ پیچھے سے ایک ملازم محصولخانہ کا تیز رفتاری کے ساتھ آیا اور جیب کی طرف اشارہ کرکے پوچھنے لگا کہ اس میں کیا ہے۔ اس وقت میری جیب میں ہندوستان کے بہت سے خطوط تھے۔ میں نے کہا یہ سب تم لے جاؤ وہ کسی قدر شرمندہ ہوکر واپس ہوگیا۔

پیرس کے اسٹیشن سے ہم ایک ہوٹل کو گئے جس کا پتہ ہم کو پہلے سے معلوم تھا یہ ہوٹل محلہ روسانلازار میں واقع تھا۔ اگرچہ نصف شب کے قریب رات گزر چکی تھی لیکن تمام بازار معمور تھے۔ دکانیں کھلی ہوئیں اور سڑکوں پر رونق تھی۔ ٹوپی کے کھوجانیکا ہم افسوس کرہی رہے تھے کہ ایک دوسرا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہوٹل پہونچنے پر موٹر میں سے

ایک نقصان اور سرگردانی

اسباب اتارا مگر میں اپنا ہنڈ بیگ اتارنا بھول گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ دو چار آدمی کرایہ کی سواری کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے ہم لوگ جیسے ہی اترے وہ لوگ موٹر میں سوار ہوگئے۔ موٹر کچھ دور گئی تھی کہ مجھ کو ہنڈ بیگ کا خیال آیا۔ ہر چند ہم نے آواز دی اور غل مچایا مگر موٹر نہ رکی۔ ہم کو اس کا نمبر بھی معلوم نہ تھا۔ ہنڈ بیگ میں تین پونڈ کے قریب نقد اور کچھ اشیاء روزانہ ضرورت کی تھیں۔ ہوٹل کی نگرانکار اس وقت ایک لڑکی تھی جو انگریزی سے واقف نکلی۔ اس سے ہم نے واقعہ بیان کیا اور امداد چاہی۔ اس نے کہا اب رات زیادہ گزرگئی ہے اور پولیس اسٹیشن بند ہوچکا ہے اس لئے صبح تک۔

کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ کمرے میں اسباب رکھنے کے بعد ہم دونوں بطور خود پولس اسٹیشن کی تلاش میں نکلے۔ مگر سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ زبان کی مصیبت پھر شروع ہوگئی۔ اول تو کوئی انگریزی داں آدمی نہ ملا۔ دوسرے رات بھی زیادہ گزر گئی تھی۔ بالآخر ہوٹل کو واپس ہوگئے۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ ایک تو ہینڈ بیگ کا رنج تھا۔ دوسرے یہ کہ کمرہ لب سڑک ہونے کی وجہ سے موٹروں اور ٹریم کا بڑا غل تھا۔ صبح کو ہوٹل والی لڑکی سے مشورہ کیا گیا۔ اس نے کہا کرایہ کی موٹروں کا جو دفتر ہے وہاں جاکر دریافت کرو ممکن ہے کہ کچھ پتہ چلے۔ چنانچہ اس دفتر کا پتہ اس نے کاغذ پر لکھدیا۔ ہم نے غلطی یہ کی کہ پیدل ہی دفتر کی تلاش میں نکلے۔ بڑی سرگردانی رہی۔ اِدھر اُدھر بہت چکر لگائے مگر وہ مقام نہ ملا۔ بالآخر ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر وہاں پہنچے۔ یہ جگہ تو وہی تھی جس کا پتہ ہمارے پاس تھا مگر جس مطلب سے آئے تھے وہ حاصل نہ ہوا۔ کوئی شخص انگریزی سے واقف نہ تھا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد منیجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی انگریزی سے کورے نکلے۔ عجیب عجیب ترکیبوں سے اس کو واقعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ خدا معلوم وہ کیا سمجھا مگر اس نے ایک کاغذ پر ایک دوسرے دفتر کا پتہ لکھدیا اور ٹیلیفون پر بھی اس دفتر والوں سے کچھ کہدیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر اس پتہ پر پہونچے۔ یہ مقام بھی کرایہ کی موٹروں کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ چٹھی دکھلانے پر ایک خادم ہم کو ایک صاحب کے پاس لے گیا۔ یہاں بھی اشاروں سے مطلب سمجھانا پڑا مگر جب کام نہ چلا تو ایک صاحب بلائے گئے۔ یہ تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے لیکن ہمارا مطلب یہ بھی نہ سمجھ سکے اور کہنے لگے تم جو کچھ چاہتے ہو ایک کاغذ پر لکھدو۔ میں نے تمام واقعہ لکھکر ان کو دیدیا۔ وہ کاغذ لیکر کسی کے پاس پڑھوانے کے لئے چلے گئے۔ بہت دیر کے بعد واپس آئے اور صرف اتنا کہا کہ ہم پولس کو اطلاع دیدیں گے۔ اگر چیز ملگئی تو تمہارے ہوٹل کو بھجوادیجائے گی۔ اس جواب سے ہماری کچھ تشفی نہ ہوئی اس لئے ہم خود ہی پولس کے صدر دفتر کو گئے۔ یہ ایک بڑی عالیشان عمارت تھی

کچھ دیر تک ہم ادہر اُدہر مارے مارے پھرے ۔ مگر ہماری زبان سے واقف کوئی نہ ملا۔ بالآخر کسی نے ہم کو ایک انگریزی داں عورت کا پتہ بتلایا ۔اس سے ہم نے واقعہ بیان کیا ۔ اس نے کہا یہ کام میرے صیغہ سے متعلق نہیں ہے ۔ایک طرف اشارہ کرکے بتلایا کہ عمارت کے اس حصہ میں چلے جاؤ ۔ وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ گم شدہ مال کی متعلق یہاں کارروائی ہوتی ہے ۔ ایک شخص نے ہم کو ایک مطبوعہ فارم دیا تاکہ اس کی خانہ پری کردی جائے ۔ یہ فارم فرانیسی زبان میں تھا ۔اس لئے ہم کو اس کی خانہ پری میں بڑی دقت معلوم ہوئی ۔ جس آدمی نے فارم دیا تھا وہ کچھ الفاظ انگریزی کے جانتا تھا مگر بہت بے رخی کے ساتھ پیش آیا مطلق ہمدردی کرنے پر آمادہ نہ تھا ۔ہم مایوس ہوکر واپس ہونے والے تھے کہ ایک غیر متعلق آدمی نے جو اپنے کام سے وہاں آیا ہوا تھا ہماری مدد کی ۔ وہ شد بد انگریزی جانتا تھا ۔اس کی ہدایت کے مطابق ہم نے فارم کی تکمیل کردی اور اسی نے اشارہ سے بتلایا کہ فلاں عورت کو یہ فارم دے دو ۔ہم اس عورت کے پاس فارم لے گئے ۔ وہاں ایک نوٹس لگا تھا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انگریزی داں مسافروں کے واسطے یہ صیغہ مخصوص ہے ۔چنانچہ یہ صیغہ جس عورت کی نگرانی میں تھا وہ انگریزی سے واقف تھی ۔اس نے نام لیکر ہمارا پتہ نوٹ کرلیا اور کہا کہ اگر تمہاری چیز ملگئی تو تم کو بھجوادی جائے گی ۔تین چار روز کے انتظار کے بعد جب کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم کو بالکل مایوسی ہوگئی ۔چنانچہ ہینڈ بیگ کا کچھ پتہ نہ چلا غنیمت ہوا کہ چک بک اور پاسپورٹ ہینڈ بیگ میں نہ تھے ورنہ سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ۔ میری رائے میں یہ دونوں چیزیں ہینڈ بیگ میں نہ رکھنا چاہیئے ۔چھوٹی چیز ہونے کی وجہ سے اس کے کھو جانے کا اندیشہ ہر وقت رہتا ہے ۔ اگر لندن میں یہ واقعہ ہوتا تو نوے فی صدی ہینڈ بیگ واپس ملجاتا لیکن پیرس انتظام کی خوبی میں لندن کو نہیں پہونچ سکتا ۔

پیرس کا ہوٹل

ہوٹل میں اگرچہ انگریزی داں عورت موجود تھی لیکن اس کا موقع ہم کو پسند نہ آیا ۔ کثرت ٹرافک کی وجہ سے رات کو

نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے ہم نے دوسرے ہوٹل میں منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ بہت کچھ تلاش کے بعد ، وموارٹ میں ایک ہوٹل پسند آیا۔ اس ہوٹل میں صرف ایک خرابی تھی۔ کوئی انگریزی جاننے والا نہ تھا۔ لیکن اس کے کمرے شاہ راہ سے فاصلہ پر تھے اور ایک صحن بھی تھا جس میں میز کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بند کمروں سے اگر دم گھبرا جائے تو اس صحن میں بیٹھکر تازی ہوا سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ فی کس بتیس فرانک روزآنہ قرار پائے جس میں صبح کا ناشتہ بھی شریک تھا۔ چھ فرانک ایک شلنگ کے برابر ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ دو آنے کا ایک فرانک ہوا۔ کمرہ میں ساز و سامان نفیس تھا۔ بالخصوص مسہری بہت پر تکلف تھی۔ فرانس کے ہوٹلوں میں عام طور پر پلنگ بہت اچھا ملتا ہے۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل کمرے میں ہی تھے۔ ماسوا اس کے سرہانے ٹیلیفون بھی لگا ہوا تھا۔ تاکہ بوقت ضرورت دفتر سے بات ہو سکے۔ اس ہوٹل کو پسند کر کے ہم اسباب لانے کے واسطے اپنے سابقہ ہوٹل کو گئے اور اپنا بل طلب کیا تو ہوٹل والی کچھ رنجیدہ ہوئی۔ اس نے کہا شاید تم کو کوئی دوسرا ہوٹل اس سے سستا مل گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ رعایت کرنے پر آمادہ ہوں کرایہ کم کر دیتی ہوں۔ مگر چونکہ ہم دوسرے ہوٹل کو پیشگی رقم دے آئے تھے اور یہ ہوٹل پسند بھی نہ تھا اس لئے رعایت سے مستفید نہ ہوئے اور وہاں سے منتقل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ پتہ چلا کہ پیرس میں ہوٹلوں کے نرخ حسب موقع کم و زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جدید ہوٹل کی مالکہ ایک درمیانی عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند بھی ہوٹل میں رہتا تھا مگر کاروبار میں دخیل نہ تھا۔ دفتری کام اور ہوٹل کا سب انتظام میڈم خود کیا کرتی تھی اس کی ایک نوعمر لڑکی بھی تھی جس کی عمر چودہ پندرہ سال کی ہوگی۔ یہ مدرسہ میں انگریزی پڑھتی تھی۔ اس لئے کسی قدر انگریزی میں بات چیت کر لیتی تھی۔ اکثر اس کے ذریعہ سے ہم اپنا مطلب میڈم کو سمجھا دیا کرتے تھے۔ مگر جب یہ لڑکی نہ ہوتی تو اشاروں پر کام چلتا تھا۔ ہم نے بعض ہوٹل ایسے بھی دیکھے۔ جہاں انگریزی بولی جاتی تھی۔ مگر کسی نہ

کسی وجہ سے وہ ہوٹل ہم کو پسند نہ آیا۔ البتہ بڑے بڑے ہوٹل جہاں انگریزی سمجھی جاتی ہے آرام کے ہیں۔ مگران کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔ پیرس کے ہوٹل لنڈن کے ہوٹلوں کی نسبت سستے اور آرام دہ ہیں۔

لنڈن کو واپسی

پانچ روز قیام کے بعد میں لنڈن واپس ہو گیا۔ اگرچہ پیرس میں زیادہ قیام کرنے کا ارادہ تھا لیکن سراج الحق کسی ضروری کام کی وجہ سے لنڈن واپس چلے گئے۔ دوسرے دن تنہائی کی وجہ سے طبیعت گھبرانے لگی اور پیرس جیسا عذار شہر آنکھوں میں سنسان ہو گیا اس لئے بادل نخواستہ میں لنڈن واپس ہو گیا۔ اس دفعہ آبنائے انگلستان تموج میں تھا۔ راستہ بھی میں نے دوسرا اختیار کیا یعنی بولون سے فوک اسٹون گیا۔ چاروں طرف سے کالی کالی گھٹائیں امنڈ کر آرہی تھیں۔ خاصا اندھیرا ہو گیا۔ کچھ دیر بارش بھی رہی۔ اس سمندر میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جو اسٹیمر چلتے ہیں وہ چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ سمندر کی زبردست لہروں نے ہمارے اسٹیمر کی بری گت بنائی بالکل ایک فٹ بال معلوم ہوتا تھا۔ میں آنکھیں بند کرکے ایک جانب لیٹ گیا۔ یہ معلوم ہوتا رہا۔ کہ اسٹیمر کبھی آسمان پر جاتا ہے اور کبھی نیچے آتا ہے۔ جہاز کے ملازمین مسافروں کو تشت تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ چاروں طرف متلی اور قے کا زور تھا۔ اس کیفیت کو دیکھکر حافظ شیرازی یاد آگئے۔ وہ بھی اس قسم کی مصیبت میں گرفتار ہوئے ہونگے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

شب تاریک بیم موج گرداب چنیں حائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

مجھے دوران سر اس قدر سخت ہوا کہ دو روز تک لنڈن میں طبیعت خراب رہی۔

پیرس

پیرس سلطنت فرانس کا دارالسلطنت اور آبادی کے لحاظ سے تمام یورپ میں دوسرے درجہ پر ہے۔ سمندر کے کنارہ سے تقریباً ایک سو اسی میل کے فاصلہ پر دریائے سین کے دونوں طرف آباد ہے۔ شمال و جنوب میں پہاڑوں کا سلسلہ

اس کو گھیرے ہوئے ہے - دریائے سین کا جو حصہ شہر میں سے گزرتا ہے اس میں دو چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں - ایک کو جزیرہ شہر کہتے ہیں اور دوسرے کو جزیرہ سینٹ لوئی - زمانہ قدیم میں پیرس کی آبادی صرف جزیرہ شہر کے اندر محدود تھی - چند مشہور عمارتیں بھی اس حصہ میں واقع ہیں - شہر کے بقیہ حصہ سے اس جزیرہ کا اتصال پانچ پلوں کے ذریعہ ہوتا ہے سارے شہر میں دریائے سین پر بتیس پل عبور و مرور کے واسطے بنے ہوئے ہیں - جن کے منجملہ سب سے قدیم پل ۱۵۷۸ء میں بنا تھا - اور جدید ترین جو ۱۹۰۰ء میں تیار ہوا - جو سب سے خوبصورت ہے - اس پل میں ایک آہنی کمان ہے جو تین سو پچاس فٹ لمبی اور ایک سو بتیس فٹ چوڑی ہے - عمارتوں کی خوبصورتی اور سڑکوں کی کشادگی کا لحاظ کرتے - شاید پیرس سے بہتر کوئی شہر دنیا میں نہ ہوگا - اس شہر کی اور بھی چند خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے اس کو شہرت عام حاصل ہے - مستورات کے لباس کا فیشن اسی شہر سے نکلتا ہے اور تمام یورپ اسی فیشن کی تقلید کرتا ہے - علم ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے واسطے بھی یہ شہر سارے ملک فرانس کا مرکز ہے - ریشمی کپڑا - سامان آرایش زیور - اور عطر وغیرہ کی بڑی تجارت گاہ ہے - غرض یہ کہ سیاسی - تجارتی - و معاشرتی ہر لحاظ سے پیرس کو فرانس کے تمام شہروں پر فوقیت حاصل ہے - اس کے مدارس میں تحصیل علم کی غرض سے ملک کے تمام حصوں سے طالب علم آتے ہیں -

یہ ایک بہت قدیم شہر ہے جس کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے سیاسی انقلاب اور خون ریزیاں اس شہر میں ہو چکی ہیں - تقریباً چودہ سو برس سے سلطنت فرانس کا یہ دارالحکومت رہا ہے - ۱۴۲۰ء میں کچھ عرصہ کے لئے اس شہر پر انگریزوں کا بھی قبضہ رہ چکا ہے - اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہوا - تیسری دفعہ ۱۸۷۱ء میں جرمنوں نے اس پر حملہ کیا - اس کے علاوہ اندرونی نزاعات کی وجہ سے بہت کچھ کشت و خون پیرس کی گلیوں میں ہوتا رہا ہے

باوجود اس کے یہ شہر اپنی گوناگوں رونق اور دلچسپیوں کے لحاظ سے یورپ میں ہمیشہ ممتاز رہا۔ پیرس کے نام میں کچھ ایسا جادو بھرا ہے کہ چاروں طرف کے مسافر ہزارہا کی تعداد میں روز آنہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں سیر و تماشا اور عیش و عشرت کا بہت کچھ سامان جمع ہے۔ رات دن جس وقت دیکھو مسرت و شادمانی کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔

پیرس میں غلاظت

پیرس اگرچہ خوب صورت اور شاندار شہر ہے لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس عظیم الشان شہر کی شہرت پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ صفائی و ستھرائی کا خیال یہاں کے لوگوں کو اتنا نہیں ہے جیسا برلن اور لندن میں پایا گیا۔ بیت الخلا اور پیشاب خانے اکثر غلیظ حالت میں ہیں۔ بعض بیت الخلا تو ایسے دیکھنے میں آئے جیسے ہندوستان کی ریلوں کے تیسرے درجہ میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ جس ملک میں کوٹ پتلون کا رواج ہے وہاں اس قسم کے بیت الخلا کیسے مروج ہوئے اور یہ لوگ کیسے حاجت روائی کرتے ہیں۔ شہر کے بعض محلے بہت ہی غلیظ حالت میں ہیں اور انتظامی حالت بھی برلن اور لندن کی نسبت گری ہوئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ شہر دل آویزی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا

پیرس کے بازار

بعض محلے ایسے ہیں کہ وہاں ساری رات رقص و سرود کا چرچا رہتا ہے۔ لندن رات کو بارہ بجے کے بعد سنسان ہو جاتا ہے۔ لیکن پیرس میں ساری رات چہل پہل رہتی ہے۔ چند بازار جن کو بولی وارڈ کہتے ہیں بڑی رونق کے ہیں۔ بولی وارڈ اصل میں شہر پناہ کو کہتے ہیں۔ قدیم قلعہ کی فصیلوں کو توڑ کر جو بازار وہاں قائم کئے گئے ان کو اصطلاح میں بولی وارڈ کہنے لگے مثلاً بولی وارڈ میڈلین اور بولی وارڈ اٹیلین وغیرہ۔ ان سڑکوں کے بیچ میں ایک روش ہوتی ہے جس کے دونوں طرف سایہ دار درخت ہیں۔ ان بازاروں کے

قہوہ خانے بڑے پر تکلف ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں دکانوں کے سامنے سائبان کے نیچے میز کرسیاں بچھادی جاتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی مرد اور عورت ان قہوہ خانوں میں گھنٹوں مصروف بہ تفریح رہتے ہیں۔ لندن کی طرح خاموشی نہیں رہتی۔ لوگ آپس میں خوب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان قہوہ خانوں میں بازاری عورتیں خوب بناؤ سنگار کئے ہوئے کثرت سے موجود رہتی ہیں۔ عطر چونکہ سستا ہے اس لئے ہر عورت معطر رہتی ہے بعض دفعہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عطردان کھلا ہوا ہے۔ تقریباً سب عورتیں اپنے ہونٹوں پر سرخی لگاتی ہیں۔ بھوں کے بال اکھیڑ دیتی ہیں اور ایک مہین سیاہ رنگ کی لکیر خوبصورتی کے واسطے کھینچ دی جاتی ہے۔ اس قسم کی اکثر عورتیں جو تنہا قہوہ خانہ میں آتی ہیں مشتبہ روش کی ہوتی ہیں۔ لیکن بناؤ سنگار کا شوق یہاں کی عورتوں میں عام ہے اس لئے اس قسم کی ہر عورت کو بازاری نہ سمجھنا چاہیئے۔

فرانسیسوں کے خصائل و عادات

یہاں کے لوگوں کے عادات اخلاق و معاشرت انگلستان سے بہت مختلف ہیں۔ حالانکہ ان دونوں ممالک کے درمیان چنداں فاصلہ نہیں ہے۔ چنانچہ ڈوور اور کیلے کے درمیان انگلش چینل صرف اکیس میل چوڑا ہے۔ فرانس کے لوگ بڑے باتونی اور ملنسار ہوتے ہیں۔ مگر نازک مزاجی نے ان کو زود رنج بنادیا ہے۔ بہت جلد غصہ آجاتا ہے۔ اور اتنی ہی جلد ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں میوہ خریدنا چاہتا تھا۔ بازار میں ایک نوجوان عورت میوہ بیچ رہی تھی۔ میں نے دو کیلے خریدے۔ اس کے بعد میں نے دو کیلے اور مانگے لیکن غلطی یہ ہوئی کہ کیلوں کو ہاتھ لگاکر اور ذرا دبا کر میں نے بتلایا کہ نرم کیلے مجھکو دینا۔ یہ بات اس کو بہت ناگوار ہوئی۔ اپنی زبان میں وہ بہت کچھ خفا ہوئی۔ اور بادل ناخواستہ اس نے مجھ کو دو کیلے اور دئے۔ مگر جب میں نے آٹھ مانگے تو اس نے قطعی انکار کردیا

ہر چند میں نے کوشش کی لیکن اس کا مزاج ٹھنڈا نہ ہوا۔ایک دفعہ ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹکٹ کلکٹر کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ وہ انگریزی سمجھتا نہ تھا اور میں اس کو اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر تحمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ مشتعل ہوگیا یہی کیفیت پولس کی بھی ہے۔مسافروں کے ساتھ اکثر لاپروائی کا برتاؤ کیا جاتا ہے ان لوگوں میں مصافحہ کرنے کی رسم بہت عام ہے۔اگر کوئی شخص دن میں کئی دفعہ ملیگا تو ہر دفعہ ہاتھ ملائیگا۔

فرانیسوں کی غذا

فرانیسیوں کی غذا بھی انگریزوں سے مختلف ہوتی ہے گھونگے۔ مینڈک۔ گھوڑے اور گدھے کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔لیکن یہ بات ضرور ہے کہ بخت و پز کے فن میں ان لوگوں نے کمال حاصل کرلیا ہے۔ایک ایک چیز کو مختلف طریقوں پر پکاتے ہیں مثلاً یہ سنا گیا ہے کہ صرف انڈے کو دو سو پچاس طریقوں پر پکا سکتے ہیں۔گھونگے کو کچھ اس طرح تیار کرتے ہیں کہ اندر کا کیڑا زندہ رہتا ہے اور اسی طرح اس کو کھا لیا جاتا ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گزشتہ زمانہ میں آئے دن کے افلاس کی وجہ سے ان لوگوں نے سستی چیزیں کھانی شروع کر دیں اور اب تک وہی طریقہ چلا آتا ہے۔گوشت کو کئی وضع سے پکاتے ہیں۔ اقسام اقسام کے میٹھے تیار کرتے ہیں مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ہم ان کھانوں سے مستفید نہ ہوسکے۔کھانے کے بعد کافی بغیر دودھ کے اکثر پی جاتی ہے۔چائے عام طور پر ناقص ہوتی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ لندن کے سوائے یورپ میں کہیں اچھی چائے نہیں ملتی۔تاوقتیکہ مانگو نہیں کافی کے ساتھ کبھی دودھ نہیں دیتے اور ایک رواج یہ ہے کہ صبح کو ناشتہ میں انڈے نہیں کھاتے۔صرف روٹی۔مکھن۔اور کافی دیتے ہیں۔ ہم نے خاص طور پر ہوٹل کی میڈم سے کہکر اپنے ناشتہ میں انڈوں کا انتظام کرایا تھا۔یہ لوگ کھانا بھی بہت دیر تک کھاتے ہیں۔

چنانچہ دوپہر میں کھانے کے واسطے ملازمین کو عام طور پر دو گھنٹہ کی مہلت ملتی ہے۔ جس کو وہ اسی کام میں صرف کر دیتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ انواع واقسام کی میوے کی شرابیں پی جاتی ہیں۔ ہم یا تو چشمے کا پانی پیتے تھے یا تازہ آبشورہ۔

ایک لطیفہ

ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ بازار میں سیر کرتے کرتے پیاس معلوم ہوئی۔ ایک دکان میں جا کر ہم نے لیمونیڈ مانگا کچھ دیر انتظار کے بعد دو پلیٹوں میں ہمارے سامنے آمولیٹ رکھدیا گیا جو انڈے سے تیار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بھوک نہ تھی لیکن مجبوراً کھانا پڑا۔ اس قسم کے واقعات اکثر پیش آئے۔ ایک دفعہ کھانے کے بعد کچھ میٹھا کھانے کو دل چاہا۔ فہرست شیرینی کی لمبی چوڑی تھی۔ اس میں ایک نام کسی قدر لمبا اور شاندار تھا۔ رفیق بیگ نے اس پر انگلی رکھکر لانے کا حکم دیا۔ ہم اس امید میں تھے کہ کوئی اچھی قسم کی پڈنگ کھانے کو ملیگی لیکن بہت مایوسی ہوئی جب کہ ویٹر دو تشتریوں میں ایک ایک ناشپاتی رکھکر لے آیا

پیرس کی اصلی سیر جس کی خاطر دنیا کے ہر حصہ سے ہزاروں سیاح آتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہوا کرتی ہے۔

دنیا کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ اکثر برے اور معیوب کام رات کے اندھیرے میں ہوا کرتے ہیں۔ ناچ رنگ۔ تماش بینی۔ عیش پرستی۔ چوری۔ قتل وغارت غرض یہ کہ اس قسم کے سب کام رات ہی کے وقت راس آتے ہیں۔ پیرس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ رات کے وقت جس طرف نکل جاؤ گہما گہمی دیکھو گے۔ شہر کیا ہے راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے۔ تفریح کے مقامات۔ شراب خانے۔ قہوہ خانے۔ رسٹوران سب معمور ہیں۔ بازار روشنی سے جگمگ کر رہا ہے۔ خوبصورت۔ بدصورت۔ جوان اور بڈھی ہر قسم کی عورتیں لباس فاخرہ سے آراستہ بناؤ سنگار کئے ہوئے۔ ہر مقام پر اس قدر کثرت سے موجود ہیں کہ ان کو ٹھیس لگائے بغیر راستہ چلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے

یہ عورتیں جس جس طریقے سے مردوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں ۔ وہ بھی ایک تماشہ قابل دید ہے ۔ ان عام مقامات کو چھوڑ کر اگر خاص خاص مکانات کے اندر جاؤ تو گویا طلسم ہوش ربا میں آ گئے ۔ اجنبی آدمی کی زبان پر بلا تکلف یہ شعر آ جاتا ہے ۔

این چہ شور الیست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

اگر فی الحقیقت شیطان بھی کوئی ہستی موجود فی الخارج ہے تو میرے خیال میں اس نے اپنی حکومت کا مرکز اسی شہر میں قایم کر لیا ہے ۔ عیش پرستی کے سب سامان اس کی مرضی کے مطابق یہاں موجود ہیں ۔ بڑی چیز جس کے ذریعہ شیطان دنیا میں فساد پھیلاتا ہے عورت ہے ۔ پیرس میں بھلا عورت کی کیا کمی ہے ۔ صرف جیب میں روپیہ کی ضرورت ہے ۔ اگر تمہاری جیب بھری ہوئی ہے تو وقت واحد میں پچاسوں عورتیں پروانہ وار تمہارے گرد چکر لگائیں گی ۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

ہے عالم میں خوبی ساری پیسہ کی

مولوی رومی نے اپنی ایک نظم میں یہ بیان کیا ہے کہ جب شیطان نے بارگاہ خداوندی میں یہ درخواست پیش کی کہ میں انسان کو اپنے دام میں پھانسنے کے لئے کوئی اچھا ذریعہ چاہتا ہوں تو وہاں سے اس کو بے شمار دولت اور نادر اشیاء عطا ہوئیں ۔ لیکن اس سے شیطان کی تسکین نہیں ہوئی ۔ اور اس نے عرض کیا کہ اس سے بھی زیادہ دل آویز کوئی چیز عطا ہو ۔ اس موقعہ پر چند اشعار خالی از لطف نہ ہونگے ۔

دام دیگر خواہم اے سلطان بخت
دام مرد انداز حیلت جوئی سخت
خمر و چنگ آورد پیش او نہاد
نیم خندہ زد و بد و شد نیم شاد

چوں کہ خوبی زنان با او نمود
کہ ز عقل و صبر مردان می ربود
بس زد انگشتک برقص اندر فتاد
کہ بدہ زو تر رسیدم در مراد

مطلب یہ ہے کہ سب سے اخیر میں اللہ میاں نے عورت دی کہ اس کے ذریعہ انسان کو برباد کرو۔ آمدم بر سر مطلب۔

بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں نصف شب کے بعد پروگرام شروع ہوتا ہے۔ اکثر مسافر پچھلی رات کو ہوٹل واپس آتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لیے پیرس کے ہوٹلوں میں ایک خاص انتظام کیا گیا ہے۔ داخلہ کے دروازہ پر ایک بٹن لگا رہتا ہے۔ اس کو دبا دینا کافی ہے۔ دروازہ خود بخود کھل جائیگا۔ ترکیب یہ رکھی ہے کہ دروازہ کے قریب ہی ایک حجرے میں ملازم سوتا رہتا ہے۔ جس وقت باہر کا بٹن دباؤ اس حجرے میں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ ملازم وہیں سے لیٹے لیٹے ایک کھٹکا دبا دیتا ہے جس کی وجہ سے داخلہ کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ رات کے وقت بڑی بڑی سڑکوں پر بجلی کی روشنی کثرت سے ہوتی ہے۔ شراب خانے۔ قہوہ خانے اور رسٹوران پچھلی رات تک معمور رہتے ہیں۔ پٹریوں پر چلنے والوں کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

ایک دلچسپ اشتہار

ایک رات کسی بازار میں ایک دلچسپ طریقہ اشتہار کا دیکھنے میں آیا۔ ایک سہ منزلہ دکان تھی۔ تیسری منزل پر بجلی کی روشنی کا ایک گھوڑا الٹے پاؤں تیز رفتاری کے ساتھ ایک جانب سے آتا تھا یہ خاص مقام پر پہنچنے کے بعد ایک لات مارتا تھا۔ جس سے بجلی کی روشنی میں حرف (سی) بجاتا تھا۔ لات مار کر گھوڑا واپس ہو جاتا اور کچھ وقفہ سے دوبارہ آتا۔ اسکی

دوسری لات پر حرف (ایچ) نمایاں ہوجاتا تھا۔ اسی طریقہ پر گھوڑا متعدد دفعہ آتا جاتا رہا۔ اس کی ہر لات پر ایک حرف نمایاں ہوجاتا۔ یہاں تک کہ لفظ چاکلیٹ روشنی کے حروف میں نمایاں ہوگیا۔ کچھ دیر بعد یہ لفظ غائب ہوجاتا تھا۔ اور پھر وہی کارروائی شروع ہوجاتی تھی۔ دکان کے سامنے ہر وقت ایک جم گھٹ اس تماشہ کو دیکھنے کے لئے لگا رہتا ہے۔

پیرس کی سیر رات کے وقت

رات کی تفریح کے واسطے بکثرت سامان موجود ہیں اس لحاظ سے یورپ کا کوئی دوسرا شہر پیرس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ متعدد بڑے اور چھوٹے۔ مہنگے اور سستے انواع واقسام کے تھیٹر۔ سینما۔ ناچ گھر اور کیبرے ہیں۔ اگر ان کی فہرست مرتب کی جائے تو سینکڑوں کی تعداد میں ہوگی سنتے ہیں کہ ہر مہینے میں کم سے کم ایک ناچ گھر کا ضرور اضافہ ہوجاتا ہے۔ سیر کرنے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو کسی خانگی رہبر کے ذریعہ یا موٹر کوچ کے ذریعہ۔ میرے خیال میں موٹر کوچ میں جانا زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ بڑی بڑی موٹر لاریاں ہوتی ہیں۔ خاص خاص بازاروں میں خاص مقامات پر یہ موٹریں کھڑی ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کام پر ملازم ہوتے ہیں کہ مسافروں کو جمع کریں۔ ایک دفعہ میں اور رفیق بیگ بازار میں چلے جارہے تھے۔ کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا کہ ایک شخص نے راستہ روک کر ہم سے پوچھا کیا تم پیرس کی رات کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہو۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ اس مقام سے رات کو ساڑھے نو بجے موٹر کوچ روانہ ہوتی ہے اور ڈیڑھ بجے تک مختلف ناچ گھروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ موٹر میں ایک انگریزی داں رہبر بھی رہتا ہے۔ فی شخص نوے فرانک لیتے ہیں۔ جس میں ناچ گھروں کی فیس داخلہ شریک ہے۔

اس وقت ہم نے اس کو ٹال دیا مگر دوسرے روز جب اس طرف سے ہم لوگ گذرے تو پھر اس شخص نے راستہ روکا۔ اور بہت اصرار کرنے لگا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آدھی رات کے بعد بھی موٹر جاتی ہے اور پچھلی رات تک سیر کرائی جاتی ہے۔ ہم نے پچھلی شب کا پروگرام پسند کیا اور دو ٹکٹ خرید لئے۔ قریب کے ایک رستوراں میں کھانا کھا کر ساڑھے نو بجے ہم موٹر میں سوار ہو گئے۔ بہت سے مسافر تھے اور کئی موٹریں تھیں۔ کوئی دو سو آدمی کی جماعت ہوگی۔ جس میں زیادہ تر مستورات تھیں۔ ہوا کسی قدر سرد چل رہی تھی اور موٹر کی آدھی چھت کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا اوورکوٹ پہن لیا لیکن میرے قریب ایک مسافر سردی سے سکڑنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا تم اپنا کوٹ کیوں نہیں لائے۔ اس نے کہا ہوٹل میں بھول آیا ہوں۔ سردی سے تکلیف ہو رہی ہے اس لئے واپس جانا چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے ساتھ میری بیوی اور ایک دوسری لیڈی ہے۔ میں چلا جاؤں تو ان کی سیر خراب ہو جاتی ہے۔ رفیق بیگ کا کوٹ خالی تھا۔ انھوں نے فوراً اس کو دیدیا۔ یہ مسافر برازیل کا رہنے والا تھا۔ اور محض سیر کی خاطر پیرس آیا تھا۔ موٹر سے اترنے کے بعد اس نے اپنی بیوی اور دوسری لیڈی سے ہمارا تعارف کرایا۔ سب سے پہلے جہاں ہم گئے ایک مسجد تھی۔ پہلے تو ہم کو تعجب ہوا کہ آخر اس وقت مسجد میں کیا کام ہے۔ لیکن جب اندر گئے تو اور بھی تعجب ہوا۔ مسجد کیا ہے۔ ایک ناچ گھر ہے۔ ع مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے۔ معلوم ہوا کہ مسجد کے متعلق چند مکانات ہیں جن میں حمام۔ قہوہ خانے اور دکانات ہیں۔ اندر کی آرایش مشرقی تہذیب کے مطابق تھی۔ ملازمین بھی مسلمان تھے جو غالباً مراکش کے باشندے ہیں۔ ترکی ٹوپیاں اور لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے تھے۔ بعض کی رنگت سانولی تھی اور بعض کالے تھے۔ قہوہ خانہ میں عربی رقص و سرود ہو رہا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں قہوہ پیش ہوا۔ یہاں سے اٹھ کر دوسرے کمروں میں گئے جہاں

مشرقی ساخت کی بہت سی چیزیں فروخت کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ دکاندار سب مسلمان تھے۔ میں نے ایک شخص کو السلام علیکم کہکر مخاطب کیا۔ اس نے کسی قدر متعجب ہوکر پوچھا "مسلم؟" میں نے کہا "الحمدللہ"۔ اس نے عربی میں گفتگو شروع کی۔ میں نے کہا "لا اتکلم"۔ پھر اس نے پوچھا "ترک؟" میں نے جواب دیا "ہندی"۔ اس کے بعد اس نے دکانداری شروع کر دی اور میری عربی معلومات کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ چیزیں اونے پونے داموں پر میرے سر تھوپ دے لیکن ہم لوگ گول ہو گئے۔ بعض امریکن عورتوں نے کچھ خریدا۔

یہ بات یاد رکھنے کے لایق ہے کہ پیرس میں جو سیاح آتا ہے۔ اس کو مالدار سمجھکر یہاں کے لوگ اسے اسامی بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اکثر چیزوں کی قیمت زیادہ بتاتے ہیں خصوصاً امریکن سیاح سے بہت زیادہ وصول کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ اسی موٹر میں ایک امریکن لیڈی تھی جس نے مجھ سے بہ سبیل تذکرہ کہا کہ ایک دکان میں بال تراشنے کی قیمت اس سے بہت زیادہ لیگئی لیکن ایک فرانسیسی عورت سے اسی کام کے لئے نصف قیمت لی گئی

مسجد سے روانہ ہونے کے بعد ہم ایک ناچ گھر میں گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آدمی گنجایش سے زیادہ تھے۔ کسی قدر تنگی کے ساتھ بچوں پر بیٹھنا پڑا زیادہ تر گانا ہوتا تھا۔ دو تین مرد تھے اور دو تین عورتیں تھیں۔ یہاں کوئی عورت نیم برہنہ بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک شخص بار بار مذاقیہ گفتگو کرتا تھا۔ جو لوگ فرانسیسی سمجھتے تھے وہ اس کی گفتگو کا لطف اٹھاکر ہنستے رہے مگر ہم کو کچھ بھی لطف نہ آیا۔ ہر مہمان کے سامنے ایک ایک گلاس شیمپین کا پیش ہوا۔ پینا یا نہ پینا بالکل اختیاری ہے لیکن خریدنا ضرور پڑتا ہی کیونکہ یہی فیس داخلہ کی سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے جو موٹر کا کرایہ دیا تھا۔ اس میں اس کی قیمت شامل تھی۔ یہاں سے فارغ ہوکر ایک بہت بڑے ناچ گھر میں گئے۔ یہ مکان عالیشان تھا اور میز کرسیوں سے خوب آراستہ تھا۔ درمیان میں کچھ جگہ ناچ کے

لیے محفوظ تھی۔ یہاں بیسیوں لڑکیاں ناچنے والی اپنا کمال دکھا رہی تھیں خصوصیت یہ تھی کہ کمر سے اوپر جسم بالکل برہنہ تھا۔ اور کمر کے نیچے ستر پوشی کا انتظام برائے نام تھا ہزار ہا آدمی مرد اور عورت تماشہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ یہاں بھی ہم لوگوں کی ضیافت شیمپین کے ایک ایک گلاس سے کی گئی۔ ناچنے والی لڑکیوں کے علاوہ متعدد نوجوان عورتیں موجود تھیں۔ یہ سب اسی فکر میں رہتی ہیں کہ مسافروں کو ہموار کر کے ان سے شراب کے آرڈر لیں اور ان کے ساتھ بیٹھکر مے نوشی کریں۔ بہت سے آدمی ان عورتوں کے ساتھ ناچتے اور تفریح کرتے نظر آئے۔ ہم دونوں نے اپنا شیمپین کا گلاس ایک ایک لڑکی کو دیدیا۔ کچھ دیر تماشہ دیکھنے کے بعد ہماری جماعت یہاں سے روانہ ہوگئی۔ ایک اور ناچ گھر میں گئے وہاں بھی تقریباً یہی کیفیت تھی۔ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے غبارے اور کاغذکی بیلیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ ایک طرف بینڈ بھی بج رہا تھا۔ رقص وغیرہ اور مے نوشی کی وجہ سے عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ اسی قسم کا ایک اور تماشہ دیکھنے کے بعد ہماری سیر ختم ہوگئی اور جس مقام سے ہم چلے تھے وہاں ہم کو پہنچا دیا گیا۔ یہ طریقہ سیر کا سب سے اچھا ہے۔ اس میں دھوکے اور فریب کا اندیشہ نہیں ہے۔

آخری ناچ گھر کی سیر کرانے کے بعد ہمارے رہبر نے سیر کرنے والوں کو دو جگہ تقسیم کردیا بڑا گروہ تو ایسے آدمیوں کا تھا جن کے ساتھ عورتیں تھیں۔ اس گروہ کو اس نے موٹر میں سوار کراکے واپس کر دیا۔ اس کے بعد جو دس بارہ مرد رہ گئے تھے ان سے رہبر نے کہا کہ اب میں تم کو ایسے مقام پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں عورتوں کی موجودگی مناسب نہیں۔ چنانچہ ہم اس کے ساتھ ایک ناچ گھر میں گئے۔ یہ مکان مختصر تھا۔ فرش فروش بھی معمولی لیکن جو ہنگامہ یہاں دیکھنے میں آیا اس کی کیفیت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا فوٹو کھینچنا میرے بس میں نہیں ہے۔

نہ ہے نشاط کہ گر کھینچئے اسے تحریر   عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ   ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

یہ چھوٹا سا مکان نوجوان اور حسین لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مئے ناب اور گلفام ساقیوں کی کمی نہ تھی۔ کچھ لوگ ناچ رہے تھے۔ کچھ مئے نوشی میں مصروف تھے۔ اور زیادہ تر لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا لطف اٹھا رہے تھے۔ عشق و محبت کے عجیب عجیب اسرار دیکھنے میں آئے۔ بوس و کنار تو خیر ایک معمولی چیز ہے مگر اس سے بھی زیادہ بدتمیزی ہو رہی تھی۔ ہماری جماعت ایک طرف بیٹھ گئی۔ یہاں ہر صاحب کی بڑی خاطر مدارات ہوئی جام پر جام کمیشن میں اس کو ملتا تھا۔ ظالم کئی گلاس شیمپین کے اڑا گیا ایک ستر سال کا بڈھا بھی عیش پرستی میں مصروف تھا۔ باوجود اس سن و سال کے ایسی ایسی طفلانہ حرکات کرتا تھا کہ دیکھکر ہنسی بھی آتی تھی اور عبرت بھی ہوتی تھی۔ ناچتے وقت اپنے ساتھ والی لڑکی کے ساتھ ایک حرکت ایسی نازیبا کرتا تھا کہ دیکھنے والے بلا تکلف ہنس پڑتے تھے۔ بلکہ بعض لوگ تو اشارہ کرتے تھے کہ پھر وہی حرکت کرو۔ بالآخر وہ لڑکی ناراض ہوکر الگ ہو گئی۔ شاید کوئی نوجوان ساتھی یہ سلوک کرتا تو اس کو ناگوار نہ گذرتا بڈھے کے غمزے اس کو پسند نہ آئے۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بڈھا کسی دوسری لڑکی کو پکڑ لایا۔ اور دیر تک حاضرین کو خوش کرتا رہا۔ عبرت کا مقام ہے کہ جو آدمی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو اس کو عاقبت کا خیال تک نہیں آتا۔ بعض خدا کے بندے ایسے ہیں جو نوجوانی میں سب کچھ کرتے ہیں لیکن آخر عمر میں تائب ہو کر نیک روش اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت غنیمت ہیں۔ مگر بعض عقل کے اندھے ایسے ہیں جن کو مرتے دم تک نیک ہدایت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو ہم نے یہی کہتے سنا کہ۔

~~جب~~ اب تو آرام سے گذرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے

اس حد تک تو ہم کو بھی اتفاق ہے کہ " اب تو آرام سے گزرتی ہے - لیکن عاقبت سے لاعلمی محض جہالت ہے کیونکہ اپنے اعمال خود عاقبت کا پتہ دے رہے ہیں - صرف غور کرنے کی ضرورت ہے -

خانگی رہبر کے ذریعہ سیر

خانگی رہبر کے ساتھ سیر کرنے میں بہت کچھ احتمالات ہیں - یہ شخص محض اپنے فائدے کے واسطے بعض دفعہ مخدوش اور ناپسندیدہ مقامات پر لیجاتا ہے اور اکثر سبز باغ دکھا کر توقع سے زیادہ خرچ کرا دیتا ہے - لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بغیر ایسے آدمی کی امداد کے اجنبی مسافر ان مقامات پر نہیں جا سکتا - جہاں موٹر کوچ عام طور پر نہیں جاتی - ہم کو روزانہ کوئی نہ کوئی رہبر راستہ میں ملجاتا تھا - یہ لوگ بڑے لسان ہوتے ہیں اور طرح طرح سے مسافر کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں - کسی قدر بے حیا بھی ہوتے ہیں - کیونکہ باوجود انکار کے وہ کچھ دور تک برابر لپٹے رہتے ہیں - یہ سب لوگ کم حیثیت ہوتے ہیں اکثروں کے پاس ننگی تصاویر کا ذخیرہ ہوتا ہے - جن کو وہ بہت رازداری کے ساتھ بتلا کر فروخت کرتے رہتے ہیں - دو ایک روز تک ہم ان کو ٹالتے رہے لیکن ایک روز سر شام ایک شخص ملا جو بہت ہی بے حیا تھا - اس کے میلے کچیلے کپڑے تھے اور بورے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا - اول تو اس نے ہماری ہاتھ تصویریں بیچنے کی فکر کی - مگر جب ہم نے قطعی طور پر انکار کر دیا تو اس نے دبی آواز میں کہا میں تم کو پیرس کی ایسی سیر کراؤنگا جو تم نے کبھی دیکھی نہ ہو - پہلے تو ہم انکار کرتے رہے مگر کچھ دور تک وہ ہمارے ساتھ ہو لیا اور کچھ ایسی باتیں بنائیں کہ ہم اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئے ہم نے اس سے پوچھا کہ پہلے یہ بتلاؤ کہ خرچ کیا ہو گا - اس نے کہا کہ کچھ بھی نہیں - صرف شراب کی قیمت میں سیر کرا دونگا - ہم نے تاکید کے ساتھ کئی دفعہ اس سے پوچھا کہ اس سے زیادہ خرچ تو نہ ہو گا - اس نے کہا ہرگز نہیں میں ذمہ دار ہوں -

پچیس فرانک سے زیادہ خرچ نہ ہوں گے۔ ہم دونوں اس کے ساتھ ہو لئے۔ ایسی ایسی گلیوں میں لے گیا۔ جہاں روشنی بھی کافی نہ تھی۔ ہم کو خوف بھی دلواتا تھا کہ ان مقامات پر اگر رہبر ساتھ نہ ہو تو اجنبی آدمی مصیبت میں پڑ جائے۔ بات بات پر یہاں ریوالور چل جاتے ہیں۔ اور چھریاں بھونک دی جاتی ہیں۔ خدا معلوم سچ کہتا تھا یا غلط مگر اس کی ان باتوں سے ایک قسم کی تشویش ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی اہمیت کو بڑھانے کے لئے واقعات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتا تھا دو تین مقامات پر لے گیا۔ جو فرش فرنیچر اور دوسری آرایش سے خوب آراستہ و پیراستہ مکان کی چھت میں اور فرش پر چھوٹے چھوٹے کانچ کے ٹکڑے خوبصورتی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ بجلی کی روشنی کا عکس عجیب شان پیدا کر رہا تھا۔ تمام مکان جگ مگ کر رہا تھا۔ ان مکانوں میں نوجوان عورتیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں عجیب عجیب کرتب دکھاتی ہیں۔ ان حرکتوں کا ذکر خلاف ادب ہے رہبر نے جو اندازہ خرچ کا بتلایا تھا وہ بالکل غلط نکلا۔ دوگنے سے زیادہ خرچ ہو گیا۔ ہر جگہ تکرار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ وہ ہم کو اور چند مقامات پر لے گیا جہاں کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھنا خلاف تہذیب ہوگا۔ انتہا درجہ کی بے حیائی ان مقامات پر دیکھی گئی۔ اس سیر سے ہم کو کچھ ایسی نفرت ہوئی کہ رہبر کی مرضی کے خلاف بڑی شاہ راہ پر آ گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی خانگی رہبر کے ساتھ نہیں گئے۔ البتہ ہوٹل کی میڈم بعض مقامات کی نشاندھی کر دیتی تھی اس کے علاوہ کک کمپنی یا امریکن اکسپریس کے ذریعہ بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے تھے۔

لیڈو چند ناچ گھر بہت اچھے ہیں۔ دو ایک مقامات کو دیکھ لینا کافی ہے۔ مثلاً شانزالیزی کی سڑک پر ایک ناچ گھر

بہت مشہور ہے۔ جس کو لیڈو کہتے ہیں۔ لب سڑک ایک آدمی یونیفارم پہنے کھڑا رہتا ہے۔ یہ بہت تپاک کے ساتھ مسافروں کا استقبال کرکے ان کو دروازہ تک پہونچا دیتا ہے۔ اس ناچ گھر میں اچھی اچھی دکانیں بھی ہیں اور ایک حوض نہانے کا بہت اچھا ہے۔ مگر یہ مقام کسی قدر مہنگا ہے۔ اس کا پتہ ہم کو جس طریقہ پر معلوم ہوا اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک روز شام کو ہم دونوں آدمی کسی بازار میں کھڑے سوچتے تھے کہ کہاں جانا چاہیے۔ ایک مہذب آدمی قریب میں کھڑا تھا۔ یہ انگریزی سے واقف نکلا۔ اس سے ہم نے مشورہ لیا تو اس نے لیڈو کا پتہ دیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر جب جانے لگے تو اس نے روک کر کہا۔ تم جاتے تو ہو مگر وہاں کی لڑکیوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کے پھندے میں آجاؤ اور جو کچھ تمہاری جیب میں ہو وہ ان کی نذر کردو۔ ہم نے کہا تم اطمینان رکھو۔ ہمیں یورپ کا تجربہ کافی ہوچکا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسافر آدمی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھے تو ایسے مقامات پر سے وہ مفلس ہوکر نکلیگا۔

تھیٹر

بہت سے اچھے تھیٹر ہیں مگر جس کو فرانسیسی زبان نہ آئے وہ ان تھیٹروں کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ مگر پھر بھی بعض تھیٹر ایسے ہیں کہ جن کو دیکھنے کے لئے زبان دانی کی چنداں ضرورت ہیں۔ اس قسم کے تھیٹروں میں سب سے اچھا فولی برجے ہے جو محلہ روریشر میں واقع ہے۔ اس تھیٹر میں لوگ چونکہ کثرت سے آتے ہیں اس لئے پہلے ہی سے ٹکٹ خرید رکھنا چاہیئے۔ عین وقت پر ٹکٹ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ آٹھ دس شلنگ میں معقول جگہ ملجاتی ہے۔ اس تھیٹر میں ایک مقام ایسا ہے جہاں سے لوگ کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے ہیں اس کا ٹکٹ بہت کم قیمت پر ملتا ہے مگر تکلیف کی جگہ ہے۔ اس مقام کو پرامینار کہتے ہیں۔ انٹرول کے وقت یہاں بڑی رونق

رہتی ہے ۔ یہ ایک بڑا ہال ہے جس کے بیچ میں میز کرسیاں پڑی رہتی ہیں ۔ انٹرول کے وقت رفرشمنٹ کی خاطر یہاں بڑا ہجوم رہتا ہے ۔ ایک جانب شراب کی دکان ہے ۔ کچھ دکانیں سگریٹ اور چاکلیٹ وغیرہ کی بھی ہیں ۔ بینڈ نوازی بھی ہو رہی ہے ۔ اس پر رونق مجمع میں چند عورتیں ایسی بھی ملینگی جو اپنے ذاتی فائدہ کی فکر میں چکر لگاتی رہتی ہیں ۔ جہاں کسی مرد کو انھوں نے تنہا پایا بلاتکلف اس کے پاس پہونچ گئیں ۔ یا تو شراب کی فرمایش ہوگی یا چاکلیٹ کی ۔ کچھ نہیں تو سگریٹ ہی صحیح ہے ۔ اگر کسی کو اپنی طرف متوجہ پایا تو فرمایشوں کا سلسلہ ہی قایم ہو جاتا ہے ۔ ان سے پیچھا چھڑانے کی ایک بہت اچھی ترکیب ہم نے نکالی ۔ جہاں اس قسم کی عورت ہمارے پاس آئی ۔ ہم نے کہدیا کہ ہم عربی یا ترکی زبان جانتے ہیں ۔ فرانسیسی یا انگریزی نہیں آتی ۔ یہ جواب سنکر وہ مایوس ہو جاتی تھیں دلچسپی کی اور چیزیں بھی یہاں مہیا ہیں ۔ چند فینسی چیزوں کی دکانیں ہیں اور ہوائی بندوق سے نشانہ بازی بھی ہوتی رہتی ہے ۔ اصل تماشہ کے علاوہ انٹرول میں ایک چھوٹا سا تماشہ کم قیمت پر ہوتا رہتا ہے ۔ اس تماشے کا اشتہار بھی دلچسپ چیز ہے ایک جانب ایک بڑے قد کا مصنوعی حبشی کھڑا ہے جو پہلی نظر میں اصلی انسان معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا ہے اور بجلی کی قوت سے یہ آگے پیچھے اس طرح ہلتا ہے جیسے مکتب میں سپارہ پڑھتے وقت بچے ہلتے ہیں ۔ لکڑی میں ایک کاغذ کا بورڈ لگا ہوا ہے جو تماشہ کا اشتہار ہے ۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لایق ضرور ہے ۔ کوئی پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے ۔ افریقہ کی طرف کی گندمی رنگ کی عورتیں نیم برہنہ حالت میں عجیب و غریب طریقہ پر باجہ کی آواز کے ساتھ اپنے پیٹ کو پھڑکاتی ہیں ۔ سازندے بھی آفریقہ کی طرف کے ہوتے ہیں ۔ اصلی تماشہ جس کی خاطر اس تھیٹر میں آئے ہو دیکھنے کے لایق ہے

جہاں تک میرا علم ہے پروگرام ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اس پروگرام کی باتصویر کتابیں سنہری جلد کی فروخت ہو رہی تھیں۔ قیمت اس کتاب کی زیادہ تھی اور تصویریں بھی بہت اعلیٰ قسم کی تھیں۔ اگر یہ پروگرام عارضی ہوتا تو اس قدر مہنگی کتاب شایع نہ کیجاتی۔ میں نے تین دفعہ اس تھیٹر کو دیکھا۔ وہی ایک پروگرام تھا۔ تماشہ کی تفصیل لکھنا ایک امر بے سود ہے کیونکہ زیادہ تر لطف دیکھنے میں ہے۔ تحریر میں وہ بات نہیں پیدا کیجا سکتی۔ عجیب وغریب مناظر پانی کے اندر دکھائے جاتے ہیں سمندر کے نیچے کی خیالی دنیا کا سین بڑی کاریگری سے تیار کیا گیا ہے۔ برہنہ عورتیں نہایت خوبی کے ساتھ تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک حبشی کے ساتھ پانی کے اندر کشتی ہوتی رہتی ہے۔ اس تھیٹر میں متعدد عورتیں ہیں جو بالکل برہنہ کام کرتی ہیں۔ پیرس میں اس قسم کے کئی ایک تھیٹر ہیں لیکن فولی برجے سب میں ممتاز ہے۔ ایک چھوٹی سی نقل بھی پروگرام میں داخل ہے۔ انگریزی داں سیاح اس کا خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ اس نقل میں وہ دشواریاں بتائی جاتی ہیں جو محض انگریزی داں آدمی کو اجنبیت زبان کی وجہ سے پیرس میں لاحق ہوتی ہیں۔ پہلے تو اسٹیشن پر اترتے ہی قلی سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنے پیسے دیدے۔ اسی طرح ٹیکسی والے کے ساتھ جھک جھک رہتی ہے۔ پھر ریسٹوراں میں عجیب لطف رہتا ہے۔ اس نقل کے ختم پر دوسرا پہلو بھی دکھایا جاتا ہے۔ یعنے ایک فرانیسی صاحب جن کو انگریزی نہیں آتی سیر کے لئے لندن تشریف لیجاتے ہیں۔ وہاں ان کو اور بھی زیادہ مصیبت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ لندن میں لوگ فرانسیسی زبان سے اتنے بھی واقف نہیں جتنے پیرس کے لوگ انگریزی سے واقف ہیں۔ الغرض تماشا بحیثیت مجموعی اچھا ہوتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ زبان کی اجنبیت لطف کو کرکرا نہیں کرتی۔

زبان کی مشکلات

پیرس جانے سے قبل ہم نے یہ سنا تھا کہ وہاں انگریزی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات کسی قدر مبالغہ آمیز ثابت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی داں لوگ ملجاتے ہیں مگر ہر موقع پر ایسا آدمی ملنا ممکن نہیں۔ عام طور پر دکانوں میں۔ ہوٹلوں میں یا رسٹوراں میں انگریزی نہیں سمجھی جاتی۔ میں دو ایک بڑی دکانوں میں بھی گیا ہوں۔ کوئی انگریزی داں نہیں ملا۔ کسی کسی رسٹوراں میں ایک آدہ شخص معمولی انگریزی جانتا ہے یہی کیفیت ریلوے اسٹیشنوں کی ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اگر فرانسیسی زبان نہ آئے تو یورپ کا سفر زحمت سے خالی نہیں۔ پیرس میں کئی دفعہ مجھ کو پریشانی اٹھانی پڑی ایک خاص دشواری فرانسیسی زبان کی یہ ہے کہ لکھتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں یعنی تلفظ جداگانہ ہوتا ہے اور اگر صحیح تلفظ ادا نہ کرو تو کوئی بھی کچھ نہیں سمجھتا مثلاً ایک بڑا اور مشہور اسٹیشن گارے سانلازار ہے لیکن اس کو سینٹ لیزرس لکھتے ہیں۔ مجھے اس اسٹیشن پر جانے کی ضرورت تھی۔ ہر چند ٹیکسی والے سے سینٹ لیزرس کہا گیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا بالآخر کاغذ پر لکھکر بتایا تب اس نے استعجاب کے ساتھ کہا" سانلازار" اور سیدھا مقام مقصود پر لے گیا۔ جس محلہ میں ہمارا ہوٹل تھا اس کو رو مو مارٹ کہتے ہیں لیکن لکھتے رو دانٹ مارٹرے ہیں۔ ایک دفعہ میں راستہ بھول گیا۔ بہت کچھ " رو مانٹ مارٹرے" کہتا رہا لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ آخر کو کاغذ پر لکھکر بتلایا تو معلوم ہوا کہ رو مو مارٹ کہنا چاہیئے۔ اسی طرح بہت سی باتیں ہیں جن کی تفصیل لکھنا بے سود ہے لیکن ایک لطیفہ لایق تذکرہ یہ ہے کہ مجھکو منجن کی ضرورت تھی۔ ہوٹل کے قریب ایک دکان میں گیا۔ جس میں ایک عورت کام کر رہی تھی۔ اس سے میں نے انگریزی میں منجن کی شیشی مانگی مگر وہ مطلب نہ سمجھی۔ بالآخر اشارہ سے اس کو سمجھایا۔ اس نے ایک ٹیوب دے دیا۔ میں نے

جب اس کو استعمال کیا تو میری انگلی اور ہونٹ سرخ ہو گئے - ہر چند میں نے ان کو رگڑا لیکن سُرخی باقی رہی - دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ چیز عورتوں کے بناؤ سنگار میں کام آتی ہے - دکان ہوٹل کے پہلو میں تھی - دکان والی عورت کو میں نے اپنی کیفیت تبلائی - وہ بہت محظوظ ہوئی لیکن شیشی کو واپس لینے سے انکار کیا - بالآخر دوسری شیشی خریدنی پڑی - اس واقعہ کے بعد جب کبھی میں اس دکان کی طرف سے گزرتا تھا وہ عورت مجھ کو دیکھکر مسکراتی تھی - زبان کی مشکلات کے متعلق ایک پر لطف واقعہ میرے ایک دوست بیان کرتے تھے - سنا ہے کہ جب ہندوستانی فوج جنگ کے سلسلہ میں فرانس میں مقیم تھی تو ایک شخص انڈوں کی تلاش میں نکلا - اس کو معلوم نہیں تھا کہ فرانسیسی زبان میں انڈے کو کیا کہتے ہیں - باوجود کوشش کے جب وہ اپنے مطلب کو سمجھا نہ سکا تو اس کو ایک نئی ترکیب سوجھی وہ مرغ کی طرح "ککڑوں کوں" بولتا تھا - اور ہاتھ سے انڈے کا اشارہ بھی کرتا جاتا تھا - اگرچہ اپنی اس حرکت سے وہ تھوڑی دیر کے لئے تماشا بن گیا - لیکن اپنا مطلب اس نے پورا کر لیا - اس کے بعد سنا ہے کہ جب کبھی وہ اس محلہ میں سے نکلتا عورتیں انڈے لیکر اس کے پیچھے دوڑتیں اور فرمایش کرتیں کہ وہ پھر اسی طرح مرغ کی بولی بولے - میرے ایک دوست نے جو واپسی میں وینس سے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے - اپنا ایک بہت ہی پر لطف قصہ سنایا - کہتے تھے کہ میں پیرس کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا - رات کو سوتے وقت مجھے دودھ پینے کی خواہش ہوئی - میں نے ہوٹل کے ملازم کو بیسیوں طریقوں سے دودھ لانے کے لئے سمجھانے کی کوشش کی - مگر وہ ایک نہ سمجھا - آخر مجبور ہو کر اپنے سینے کو دبا کر ایک پیالی میں دودھ نچوڑنے کا اشارہ کیا - اس پر وہ بہت ہنسا - مگر میرا کام نکل گیا - ایک دفعہ یہ دل چاہا کہ موٹر میں بیٹھکر پیرس کا چکر لگائیں - چنانچہ ایک ٹیکسی کو ٹھیرایا - اور سب سے پہلے موٹر والے کے ہاتھ میں تیس

فرنیک رکھدے ۔ پھر اشارہ سے اس کو سمجھایا کہ پیرس کی سیر کرنا چاہتے ہیں ۔ اس نے چاروں طرف خوب سیر کروائی ۔ آدمی ایماندار تھا کیونکہ جب ہم موٹر سے اترنے لگے تو اس نے میٹر دیکھکر کچھ پیسے واپس کرنا چاہے ۔ ہم نے وہی پیسے اس کو انعام میں دے دئے ایک دن بڑی دل لگی رہی پیرس کے قریب ایک مقام ارمان نامی ہے ۔ مجھ کو وہاں جانا تھا ۔ اسٹیشن پر کچھ دیر دریافت کرنے کے بعد اس کھڑکی کا پتہ چلا جہاں سے ارمان کو ٹکٹ ملتا ہے ۔ مسافروں کی کثرت تھی ۔ دستور کے مطابق میں بھی قطار میں کھڑا ہو گیا ۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے تیسرے درجہ کا ایک ٹکٹ مانگا ٹکٹ بیچنے والا انگریزی سے ناواقف تھا ۔ آخر کار اس کو اشارہ سے سمجھایا کہ تیسرے درجہ کا ایک ٹکٹ چاہیئے ۔ اس نے تین ٹکٹ درجہ اول کے دیدئے میں نے لینے سے انکار کیا وہ بہت جھنجھلایا ۔ اس تکرار میں تاخیر ہونے لگی اور پیچھے مسافر بے چین ہونے لگے ۔ آخر کو ایک شخص جو کسی قدر انگریزی جانتا تھا ۔ وہ آگے بڑھا ۔ اس کی امداد سے مطلب سمجھایا گیا ۔ درجہ اول کے ٹکٹ بڑے جھگڑے کے بعد واپس ہوئے ۔ ریل کے ڈبوں پر فیومرس اور نان فیومرس لکھا ہوا ہوتا ہے ۔ پہلے تو میں یہ سمجھتا رہا کہ اس کا منشا زنانہ اور مردانہ ڈبہ ہے مگر کچھ ڈبے ایسے بھی دکھائی دئے جس میں مرد ۔ عورت دونوں بیٹھے ہوئے تھے ۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید انھوں نے ڈبہ کو محفوظ کر لیا ہے ۔ میں ایک ایسے ڈبے میں بیٹھ گیا جس پر نان فیومرس لکھا ہوا تھا ۔ خیال تھا کہ یہ ڈبہ مردانے کے لئے مخصوص ہے مگر جب سگریٹ پینے لگا تو معلوم ہوا کہ نان فیومرس کا مطلب یہ ہے اس ڈبہ میں سگریٹ نہیں پی سکتے کیونکہ ایک شخص نے منع کیا اور سمجھایا کہ ممانعت لکھی ہوئی ہے ۔ اس وقت میں دوسرے ڈبہ میں چلا گیا ۔ اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ اور لائق تذکرہ ہے ۔ ایک بینک میں انگریزی سکہ تبدیل کروانے کے لئے گیا ۔ متعدد کھڑکیاں تھیں ۔ ایک کھڑکی پر

اشاروں سے مطلب سمجھایا ۔ کارکن لڑکی نے انگریزی سکہ لیکر ایک برنجی نمبر دے دیا اور اشارہ سے بتادیا کہ آگے چلے جاؤ ۔ دو ایک کھڑکیوں پر اس نمبر کو لیکر گیا ۔ لیکن ہر جگہ سے واپس ہونا پڑا ۔ ایک کھڑکی کے سامنے دیکھا کہ کچھ لوگ روپیہ وصول کر رہے ہیں ۔ خیال ہوا کہ اس کھڑکی پر کام نکل آئے گا ۔ وہاں نمبر پیش کیا ۔ کارندہ نے خدا معلوم کیا کہا کہ مجھکو واپس ہونا پڑا ۔ سامنے ایک بنچ پڑا ہوا تھا ۔ اور کچھ لوگ اس پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ بحالت پریشانی میں بھی وہیں بیٹھ گیا اور افسوس کر رہا تھا کہ ناحق اس بنک میں آیا ۔ روپیہ چونکہ داخل کر چکا تھا واپس بھی نہیں جا سکتا تھا بیٹھے بیٹھے جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ بنک کا ملازم اپنی زبان میں کچھ کہتا ہے اور اس کی آواز پر ایک آدمی بنچ پر سے اٹھکر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور نمبر دیکر رقم لیتا ہے ۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ سلسلہ سے نمبر پکارا جاتا ہے اور اس لحاظ سے تقسیم ہوتی ہے ۔ یہ معلوم کر کے کچھ اطمینان ضرور ہوا لیکن دوسری فکر یہ لاحق ہوئی کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اب میرا نمبر آیا کیونکہ نمبر بھی فرانسیسی زبان میں پکارا جاتا تھا قریب کے دو ایک آدمیوں سے مدد لینے کی کوشش کی مگر وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے ۔ آخر کو میں نے سوچا کہ جب بنک والا نمبر پکارے اور حاضرین میں سے کوئی نہ جائے تو سمجھو کہ اپنی باری آئی ۔ یہ خیال صحیح نکلا ۔ بنک والے کی دو تین آوازوں پر جب کوئی نہ اٹھا تو میں اپنا نمبر لے کر گیا ۔ اس نے فوراً رقم دیدی

پیرس میں کئی ایک بڑے بڑے اسٹیشن ہیں لیکن ایک اسٹیشن گارے سانلازار خاص طور پر لائق تذکرہ ہے ۔ اعداد شماری کے ذریعہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں کوئی ریلوے اسٹیشن مسافروں کی کثرت کے لحاظ سے اس کی برابری نہیں کرتا ۔ معلوم ہوا ہے کہ روزآنہ اوسط مسافروں کا اس اسٹیشن پر ڈھائی لاکھ کے قریب ہے اور چوبیس گھنٹہ کے اندر بارہ سو ٹرینیں آتی جاتی ہیں ۔ پہلی دفعہ جب ہم اس اسٹیشن پر گئے تو مسافروں کا

ر ہم کو بڑی حیرت ہوئی - عمدہ اسٹیشن میں بڑی بڑی اور نفیس دکانیں بھی ہیں
لی خاطر اگر اس اسٹیشن پر چلے جاؤ تو ہرگز وقت ضایع نہ ہوگا -

ی سواریاں

پیرس کی سیر کے لئے ٹیکسی بہت اچھی چیز ہے - کرایہ لندن کی نسبت بہت کم ہے - لیکن یہ بات یاد رکھنے کے لایق
ت شب کے بعد کرایہ دوگنا ہوجاتا ہے - زمین کے نیچے کی ریل بھی کارآمد ہے
مگر اجنبی آدمی کو اس سواری میں چند در چند مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ٹکٹ خریدنا
اور یہ معلوم کرنا کہ کس پلیٹ فارم سے اور کونسی ریل جائے گی خالی از دقت نہیں ہے
چنانچہ مجھ کو کئی دفعہ غلط فہمی ہوئی اور میں غلط ریل میں سوار ہو گیا - اس میں وقت
ضایع ہوجاتا ہے - اور پریشانی الگ رہتی ہے لیکن سستی سواری ہے - مقامی لوگ
اس سواری سے بہت مستفید ہوتے ہیں - لندن اور برلن کے انڈر گراونڈ اسٹیشن صاف
ستھرے اور ریلیں آرام دہ ہیں - پیرس میں نہ تو اتنی صفائی ہے اور نہ کمپارٹمنٹ
اچھے ہیں - گنجایش بھی کم ہوتی ہے - جس کی وجہ سے زیادہ تر مسافر کھڑے ہی رہتے ہیں -

ایک اور ذریعہ سواری کا موٹر بس ہے مگر اس میں بھی وہ سہولت نہیں ہے - جو
لندن میں پائی جاتی ہے - صرف ایک منزل کی گاڑی ہوتی ہے - اور مسافروں کی
کثرت کی وجہ سے جگہ کا ملنا دشوار ہوتا ہے - جابجا موٹر بس ٹھیرنے کے واسطے
اسٹیشن بنے ہوئے ہیں - ایک خاص انتظام جو دوسرے شہروں میں دیکھا نہیں
گیا - یہ ہے کہ ہر اسٹیشن پر ایک مشین لگی ہوئی ہے - کھٹکا دبانے سے ایک ٹکٹ
نکل آتا ہے - اس ٹکٹ پر سوائے نمبر کے اور کچھ نہیں ہوتا - جو لوگ موٹر بس کے
انتظار میں جمع ہوتے ہیں - وہ اس مشین میں سے ایک ایک ٹکٹ نکال لیتے ہیں
موٹر والا آدمی ان ٹکٹوں کو دیکھکر سلسلہ وار مسافروں کو اندر آنے کی اجازت دیتا ہے
نمبروں کی ترتیب کے خلاف کوئی مسافر سوار نہیں ہو سکتا - موٹر بسوں کی تعداد بھی

لندن اور برلن کی نسبت کم معلوم ہوتی ہے۔

ٹرافک کا انتظام مختلف طریقوں پر ہے۔ کسی چوراستے پر برلن کی طرح۔ لیکن کسی قدر مختلف شکل کی قندیلیں لگی ہوئی ہیں۔ کہیں صرف پولس کا جوان کھڑا رہتا ہے۔ بعض سڑکوں پر یہ دیکھا گیا کہ گھنٹی بجتی ہے۔ گھنٹی کا انتظام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اجنبی آدمی کو اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس گھنٹی کے پھیر میں ایک دفعہ مجھ سے ایک مضحکہ خیز حرکت صادر ہو گئی۔ میرے بعض احباب منع کرتے ہیں کہ اس واقعہ کا تذکرہ سفرنامہ میں ہرگز نہ کرنا۔ البتہ اپنی ہنسی اڑوانا ہے تو اور بات ہے۔ میرے نزدیک اس واقعہ کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اجنبی ملک میں مسافر سے اکثر کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے۔ جس میں پہلو مضحکہ آمیز نکلتا ہے۔ اور میرا تو مقصد یہی یہ ہے کہ اپنی سرگذشت بیان کروں۔ بعض احباب میرے اس خیال سے متفق ہیں لہٰذا میں ضرور لکھوں گا۔ لیجئے سنیئے اور میری ہنسی اڑائیے ایک روز رات کے وقت میں ایک چوراہے پر تھا۔ راستہ چلنے والوں کی کثرت تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے گھنٹی بجتی جاتی تھی۔ میں مقابل کی روش پر جانے کی فکر میں بہت دیر سے کھڑا تھا۔ گھنٹی کا حساب کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک گھنٹی کی آواز پر میں اللہ کا نام لیکر چل کھڑا ہوا۔ بیچ سڑک پر جب پہنچا تو پولیس کانسٹبل نے آواز دیکر روکا۔ ایک طرف سے ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پس و پیش میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی تو آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ یہی کیفیت میری بھی ہوئی سامنے سے تین عورتیں آرہی تھیں دو تو آگے نکل گئیں لیکن ایک عورت بالکل میرے سامنے آگئی۔ موٹر کے خوف سے یہ بھی کچھ پریشان تھی۔ نہ معلوم کیوں اور کس طرح مگر ہم دونوں چشم زدن میں بغل گیر ہو گئے معلوم ہوتا تھا کہ مدت دراز کے بعد دو بچھڑے ہوئے دوست بغل گیر ہو رہے ہیں

یا بے تکلف احباب عید مل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو زمین پر سے اٹھا لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس موٹر کا خوف تھا وہ تو میلوں آگے نکل گئی ہو گی لیکن ہم دونوں بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے یہ عجیب و غریب تماشہ کر رہے تھے۔ بعض راستہ چلنے والوں کو شبہ ہوا کہ شاید ہم دونوں میں کچھ جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آ گئے اس وقت ہم کو ہوش آیا اور جس طرح خود بخود بغل گیر ہو گئے تھے اسی طرح بلا کسی قوت ارادی کے الگ بھی ہو گئے۔ دونوں پر ندامت ایسی غالب تھی کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھے بغیر بلا کسی گفت وشنید کے اپنے اپنے راستہ پر ہو لئے۔ اور بات چیت اگر ہوتی بھی تو کیا خاک ہوتی۔ نہ وہ بیچاری میری کچھ سمجھتی اور نہ میں اس کی کچھ سمجھتا۔ چونکہ یہاں کی عورتیں ہر وقت معطر رہتی ہیں۔ اس لئے دو روز تک میرے کپڑوں میں سے عطر کی خوشبو آتی رہی۔ پیرس کی چند باتیں جو ہم کو ناپسند آئیں ان کے منجملہ یہ بھی ہے کہ سگریٹ خریدنے کے واسطے اکثر شراب خانوں میں جانا پڑتا ہے۔ ڈاک کے ٹکٹ بھی ان ہی دکانوں میں ملتے ہیں۔ اور اکثر لیٹر بکس بھی ان ہی دکانوں میں ہوتا ہے۔ بازاروں میں نمایاں طور پر لیٹر بکس دیکھنے میں نہیں آئے۔ سگریٹ عام طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ امریکن اور انگلش سگریٹ بکثرت ملتے ہیں لیکن بہت مہنگے یعنی تقریباً سوا روپے کے بیس گولڈ فلیک سگریٹ ملتے ہیں۔ شہر کے اندر عجلت کے ساتھ ڈاک تقسیم کرنے کا ایک انتظام بہت اچھا ہے۔ یعنی برلن کی طرح یہاں بھی زمین کے نیچے نل لگے ہوئے ہیں۔ اس میں ڈاک ڈال کر ہوا کے ذریعہ ڈھکیل دی جاتی ہے۔ اور دو گھنٹے کے اندر شہر میں اس کی تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن ٹکٹ فی خط ڈھائی آنہ کا لگانا پڑتا ہے۔

پیرس سے دوویل کا سفر پیرس میں تین چار روز قیام کے بعد ایک خاص ضرورت سے رفیق بیگ کو برلن جانا پڑا۔

میں چونکہ تنہا پیرس میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے دوویل جانے کا قصد کیا یہ مقام سمندر کے کنارے آج کل بہت مقبول ہے۔ کثرت سے مسافر تفریح کے لئے وہاں جایا کرتے ہیں۔ ہم نے ہوٹل کی میڈیم کو ہرچند یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم دونوں آدمی تین روز کے لئے باہر جا رہے ہیں۔ ہمارا اسباب ہوٹل ہی میں رہیگا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہم کمروں میں اسباب مقفل کر کے چلے گئے۔ پیرس سے دوویل تقریبًا سات گھنٹے کا سفر ہے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں ریل پر سوار ہو گیا کمپارٹمنٹ میں چھ مسافر اور تھے۔ عین میرے مقابل ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے دونوں نوجوان تھے۔ مرد کی کیفیت عجیب تھی۔ جب تک بیٹھا رہا عورت کو لپٹائے رہا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بوس وکنار بھی کرتا تھا دو کنواری لڑکیاں بھی اس کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی کبھی اس منظر کو دیکھکر شرمندگی کے ساتھ نگاہ نیچی کر لیتی تھیں۔ عورت اگرچہ نوجوان تھی لیکن صورت شکل معمولی تھی۔ باوجود اس کے عاشق کی قدر دانی تعریف کے لائق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ لیلا را بچشم مجنوں باید دید۔ دوویل کے قریب کسی اسٹیشن پر یہ دونوں عاشق و معشوق اتر گئے۔ اس ملک میں بوس وکنار ایک معمولی چیز ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ فرانس کے کسی شہر میں ایک شخص نے ایک نوجوان لڑکی کا پیار اس کی مرضی کے خلاف لے لیا تھا۔ لڑکی نے عدالت میں استغاثہ کیا۔ عاشق مزاج ملزم نے جواب یہ دیا کہ محض حسن کی قدر دانی سے بوسہ لیا ہوگا۔ نیت بری نہ تھی۔ عدالت نے تصفیہ کیا کہ محض حسن کی قدر دانی کے واسطے اگر پیار لیا جائے تو کوئی جرم نہیں ہے۔ شاید حاکم عدالت کا یہ اعتقاد ہو کہ حسن پرستی بھی مقتضائے بشریت ہے۔ لہذا کوئی شخص اگر جذبہ سے متاثر ہو کر کسی عورت کا بوسہ لے تو اس کا یہ فعل عین قانون فطرت

کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں مواخذہ کرنا گویا انصاف کا خون کرنا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اکبر نے اس مضمون کو بہت خوبی کے ساتھ یوں ادا کیا ہے۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک روا   اس سے اگر بڑھے تو شرارت کی بات ہے

شکر کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں قانون کی کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ حسن پرستی تقاضائے فطرت انسانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک کیفیت انفرادی ہے جو زیادہ تر بری صحبت میں رہنے سے ترقی کر جاتی ہے۔ لیکن صحبت صالح اس میں کمی کر دیتی ہے۔

فرانس کی عدالت کا یہ تصفیہ تعجب کی نظر سے دیکھنے کے لائق ضرور ہے۔ مانا کہ انصاف کا معیار بھی ہر ملک میں جداگانہ ہوتا ہے اور قانون سازی کے وقت اس ملک کے رواج اور معاشرت پر نظر رکھنا از بس ضروری ہے تاہم کوئی قانون ایسا نہ ہونا چاہیئے جو بالکل مضحکہ خیز ہو اور جس کی وجہ سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیصلہ مذکور الصدر عدالت ابتدائی نے صادر کیا تھا۔ اغلب ہے کہ عدالت اپیل نے اس کو منسوخ کیا ہوگا۔ ورنہ شریف اور باعصمت عورتوں کو راستہ چلنا دشوار ہو جاتا

ہم بچپن سے ایک قصہ سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہانی بھی غلط معدلت گستری کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شہر میں دو آدمی جینو اور منو رہا کرتے تھے۔ جینو نے اپنا کنواں منو کے ہاتھ فروخت کیا۔ زر ثمن ادا ہو گیا۔ اور بیع تکمیل ہو گئی۔ ایک دن منو خوش خوش اس کنوئیں پر پانی سینچنے کے لئے گیا۔ جینو نے مزاحمت کی اور کہنے لگا "چہ خوش میں نے کنواں بیچا ہے نہ کہ اس کا پانی"۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ دونوں اس مقدمہ کا تصفیہ کرانے کے لئے قاضی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک شخص کا گدھا دل دل میں پھنسا ہوا ہے۔ ہر چند بیچارہ کوشش کرتا ہے لیکن گدھا نہیں نکلتا۔ جینو کو انسانی ہمدردی کا جوش ایسا ہوا کہ فوراً امداد کے واسطے پہنچا۔ گدھے کی دم پکڑ کر لگا گھسیٹنے۔ بدقسمتی دیکھو کہ گدھا تو کیچڑ ہی میں رہ گیا۔ لیکن دم ہاتھ میں آ گئی۔

گدھے والا جان کو آ گیا۔ چنو نے کہا چلو تم بھی اپنا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کر دینا۔ وہاں ضرور انصاف ہوگا۔ گدھے والا بھی ساتھ ہو گیا۔ سب سے پہلے کنوئیں کا مقدمہ قاضی صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ فریقین کے عذرات سماعت کرنے کے بعد قاضی جی نے فیصلہ کیا کہ چنو کا عذر بالکل واجبی ہے۔ پانی کی صراحت نہیں ہے۔ لہذا کنواں منو کا اور پانی چنو کا۔ لیکن چنو یا تو اپنا پانی کنوئیں میں سے نکال لے جائے یا منو کو کرایہ ادا کرے چنو بیچارے نے پریشان ہو کر کہا حضور! مجھ سے ان شرائط کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ لہذا میں مقدمہ ہی سے دست بردار ہوتا ہوں"۔ حکم ہوا کہ دست برداری کی صورت میں سو روپیہ جرمانہ داخل کرنا ہوگا۔ گدھے والے نے جو عدالت کا یہ رنگ دیکھا تو قاضی صاحب کی نظر بچا کر کمرہ عدالت سے فرار ہونے لگا۔ دربانوں نے روک کر کہا کدھر جاتا ہے۔ اس نے کہا جرمانہ دینے کی تو مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ مگر گواہوں کو لا کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میرے گدھے کی دم ہی نہ تھی۔ قارئین کرام سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں اپنے مرکز سے بہت دور ہٹ گیا۔ مگر آمدم بر سر مطلب۔

راستہ میں تین مسافر دوسرے آئے۔ دو عورتیں تھیں ایک مرد تھا۔ مرد ایک ضعیف العمر شخص تھا۔ اس کی عمر کوئی ستر سال کے قریب ہوگی۔ ایک عورت جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی عمر رسیدہ اور بہت موٹی تھی۔ دوسری عورت نوجوان تھی۔ اس کے طریقہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کی خادمہ ہے کیونکہ ضرورت سے زیادہ ادب اور لحاظ کرتی تھی۔ بڈھا میرے عین مقابل بیٹھا۔ جب دوویل قریب آیا تو اس بڈھے نے مجھ سے سلسلہ گفتگو شروع کیا۔ مگر انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اشاروں میں ہی گفتگو ہوتی رہی۔ وہ مجھ سے دریافت کرتا تھا کہ تم دوویل جا کر ہوٹل میں ٹھیرو گے یا کسی اور جگہ۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ میں اجنبی ہوں ــــ اور کسی ہوٹل میں قیام کروں گا تو اس نے کہا اسٹیشن سے تم میرے ساتھ چلو۔ میرا خیال ہوا کہ یہ شخص بھی مسافر ہے۔ اور

خود بھی کہیں ہوٹل میں ٹھیرے گا۔ مجھ کو بھی اپنے ساتھ ٹھیرانا چاہتا ہے ریل سے اتر کر اس نے کہا میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مجھے ایک رسٹوران میں لے گیا۔ اور کہا کہ یہاں کھانا کھالو۔ اس کے بعد ہوٹل والے کو کچھ سمجھا کر وہ چلا گیا۔ کھانے کے بعد میں نے ہوٹل والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس ٹھیرنے کا کوئی بندوبست ہے یا نہیں۔ اس نے اشارہ سے سمجھایا کہ وہ بڈھا ہدایت دے گیا ہے کہ کھانے کے بعد تم کو اس کے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ ہوٹل کے پیچھے ایک گلی میں لے گیا گلی تنگ اور رات اندھیری تھی۔ مقام بھی غلیظ تھا۔ دل نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں لیکن کوئی دوسری جگہ بھی مجھ کو معلوم نہ تھی اس لئے بادل ناخواستہ اس کے ساتھ ہو گیا ایک مکان میں گئے جو کسی قدر غلیظ تھا۔ ایک دالان میں بڈھا اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اور وہی خادمہ کام کر رہی تھی۔ بڈھے کی ہدایت پر خادمہ مجھ کو ایک کمرے میں لے گئی۔ جس میں ایک مسہری تھی اور منہ ہاتھ دھونے کا سامان تھا۔ معلوم ہوا کہ میرے قیام کے واسطے یہ کمرہ تجویز کیا گیا ہے۔ اگرچہ جگہ اچھی نہیں تھی اور ہوٹل بھی غیر معتبر معلوم ہوتا تھا مگر شب زیادہ ہو جانے کی وجہ سے میں نے وہاں قیام کا ارادہ کر لیا۔ دروازہ کو اندر سے مقفل کر کے سونے کے واسطے لیٹ گیا۔ لیکن نیند نہ آئی۔ ایک قسم کی تشویش ہوتی رہی۔ علی الصبح منہ دھونے کے بعد کپڑے پہنکر باہر نکل آیا۔ زینہ سے اترتے وقت پہلو سے آواز آئی۔ بان زورمان سیو۔ یعنی صبح کا سلام۔ مڑ کر دیکھا تو صاحب خانہ بڈھا اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑا ہوا ہے اور کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو۔ میں نے کہا نیچے جا رہا ہوں۔ نیچے خادمہ ملی۔ اس سے میں نے پوچھا کہ بیت الخلا کہاں ہے اس نے اشارہ سے پھاٹک کی طرف ایک جگہ بتائی جس کی کیفیت یہ تھی کہ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا۔ اس میں ایک آدمی بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ کموڈ بھی خراب و خستہ حالت میں تھا۔ اندر ٹھیرنا مشکل ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد ہی میں باہر نکل آیا اور کسی دوسرے ہوٹل کی

کی تلاش میں نکلا۔ کچھ دور جانے کے بعد معلوم ہوا کہ اچھے اچھے اور سستے ہوٹل متعدد ہیں۔ ایک ہوٹل میں کمرہ پسند کر کے اپنی جگہ واپس آگیا۔ اور بڈھے کو اطلاع دے دی کہ میں دوسرے ہوٹل میں جا رہا ہوں۔ شب باشی کے متعلق اس نے بیس فرانک مجھ سے لئے جو تین شلنگ سے کچھ اوپر ہوئے۔ مجھ کو اپنی حماقت پر کئی روز تک افسوس ہوتا رہا۔ غیر ملک میں اجنبی آدمی کے ساتھ اس طرح رات کے وقت چلا جانا ایک بڑی غلطی تھی۔ ایسے موقع پر ہمیشہ احتیاط رکھنا ضرور ہے۔ دوسرا ہوٹل اچھا اور آرام دہ تھا۔ اسی ہوٹل میں کھانے پینے کا بھی بندوبست تھا۔ کھانا اچھا اور سستا تھا۔ اس روز بارش کی وجہ سے بڑی بے لطفی رہی۔ سارے دن ساری رات بارش ہوتی رہی۔ زیادہ سیر نہ ہو سکی دوسرے دن صبح کو ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں ہوٹل کے سامنے ایک مقام پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اشارہ کھانے کا کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ کوئی بھوکا آدمی ہے اور کھانے کو کچھ مانگتا ہے۔ میں نے اس کو کچھ پیسے دینا چاہے مگر وہ زیادہ مانگنے لگا۔ میں نے انکار کیا۔ اس نے اصرار کیا۔ بالآخر اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک میرے ساتھ چلو چنانچہ وہ مجھ کو اس رسٹوراں میں لے گیا جہاں پہلی رات میں نے کھانا کھایا تھا۔ وہاں جانے کے بعد یہ پتہ چلا کہ اس رات کو کھانے کی قیمت میں نے ادا نہیں کی تھی اور یہ شخص رسٹوراں کا ملازم ہے۔ کھانے کی قیمت مانگ رہا ہے۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ جتنے پیسے وہ مانگتا تھا اس کو دیدے گئے۔

اگر مجھ کو اس ملک کی زبان آتی تو یہ بدنما واقعہ پیش نہ آتا۔ خدا معلوم مالک رسٹوراں نے اپنے دل میں کیا خیال کیا ہوگا۔ وہ اس واقعہ کو نیک نیتی کی طرف بھی محمول کر سکتا ہے اور بدنیتی کی طرف بھی۔ اس طرح کئی دفعہ اس سفر میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ان ممالک میں ہماری حالت جانوروں سے کچھ کم نہ تھی۔ شیخ سعدی کو سنو اس باب میں کیا کہتے ہیں

زباں در دہان خردمند چیست　　　کلید در گنج صاحب ہنر

چو در بستہ باشد چہ داند کسے کہ جوہر فروش است یا پیلہ ور

دوویل میں تین روز قیام رہا۔ موسم اچھا نہیں تھا یا تو ابر رہتا تھا یا بارش ہوتی تھی۔ اس لئے جیسی چاہیئے ویسی سیر نہ ہو سکی۔ مقام بہت خوبصورت ہے۔ سمندر کا کنارہ بہت دلچسپ ہے کچھ آبادی پہاڑ پر بھی ہے۔ قدرتی منظر بہت دل آویز ہے دوپہر کا کھانا کھا کر میں پیرس روانہ ہو گیا سر مغرب سانلازار اسٹیشن پر ریل پہنچی۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک عورت تھی جس کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ اور ایک کمسن لڑکا تھا۔ جو اس عورت کا بھائی معلوم ہوتا تھا کمپارٹمنٹ میں اوپر کی طرف ایک تختہ سامان رکھنے کا تھا اس پر اس عورت کا ایک پورٹ منٹو تھا۔ اترتے وقت گود میں بچہ کو لیکر دوسرے ہاتھ سے پورٹ منٹو اتارنے کی کوشش کرنے لگی مگر چیز تھی وزنی اس لئے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئی امداد کی غرض سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پورٹ منٹو اتار کر نیچے رکھدیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ اس کو پلیٹ فارم پر اتار دو۔ میں نے اس تھیلے کو ریل سے اتار کر پلیٹ فارم پر رکھدیا۔ عورت نے چاہا کہ اسے اٹھا کر لیجائے لیکن بچہ گود میں ہونے کی وجہ سے یہ کام اس کو مشکل معلوم ہوا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ آخر کار یہ فرض میں نے اپنے ذمہ لے لیا اور پورٹ منٹو ایک دروازہ تک لے گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہم کو دوسرے دروازہ پر جانا چاہیئے جو کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ میں نے ایک قلی کو بلایا اور اس کو کچھ پیسے دیکر کہا کہ یہ تھیلا اس عورت کے ساتھ باہر لے جاؤ۔ کمسن لڑکے کے ہاتھ میں جو اس عورت کے ساتھ تھا دو چھوٹے بکس تھے۔ میرا ہاتھ جب خالی ہوا تو اس لڑکے نے ایک بکس مجھ کو دے دیا۔ گیٹ کے باہر جب ہم پہنچے تو عورت نے جلدی سے بکس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ قریب ہی میں اس کا خاوند انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چلی گئی تعجب ہے کہ یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے واسطے پلیٹ فارم پر نہ آیا۔ اسٹیشن سے سیدھا اپنے ہوٹل کو گیا۔ رفیق بیگ بھی اسی وقت برلن سے واپس آچکے تھے۔ معلوم ہوا کہ

ہوٹل کی میڈم ہمارے غائب ہوجانے پر بہت پریشان رہی - بعد کو ایک انگریز عورت کے ذریعہ سے جو فرانسیسی زبان جانتی تھی ہم نے میڈم کو واقعات سمجھا دئے - میڈم نے کہا کہ اگر تم دو نو آج نہ آتے تو میں ضرور پولس میں اطلاع دیتی کہ دو مسافر کمرہ بند کرکے غائب ہوگئے ہیں -

اس میں شک نہیں کہ سیر و تفریح کے لئے پیرس ایک عجیب و غریب مقام ہے - لیکن اجنبی مسافر کو یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے - قدم قدم پر موجبات ترغیب موجود ہیں - سینکڑوں دولت مند سیاح یہاں آکر مفلس ہوجاتے ہیں - جذبات پر قابو رکھنا بھی کیرکٹر کی ایک اعلیٰ صفت ہے - ایک انگریزی اخبار میں کچھ عرصہ قبل میں نے پڑھا تھا کہ اسی پیرس میں ایک دکان کا ملازم جس کی راست بازی پر مالکوں کو اعتماد تھا ایک بڑی رقم بینک میں داخل کرنے کے واسطے لیجا رہا تھا - دفعتاً معلوم نہیں اس کو کیا خیال آیا کہ رقم لیکر تین روز تک غائب ہوگیا - پولس نے اس بدبخت کو کسی ناچ گھر میں گرفتار کیا - رقم کا بہت بڑا حصہ اس وقت تک برباد ہوچکا تھا - جب مقدمہ پیش ہوا تو عدالت میں ملزم نے یہ بیان دیا کہ ایک عرصہ سے میں عیش و عشرت کے سامان چاروں طرف دیکھتا چلا آرہا ہوں - کئی دفعہ میرے جذبات نے مجھ کو ابھارا لیکن میں ہمیشہ ان کو دباتا رہا بالآخر کمزوری مجھ پر غالب آگئی - جیب میں ضرورت سے زاید رقم موجود تھی - دل نے کہا اگر دیکھنا چاہتے ہو کہ عیش و عشرت کیا چیز ہے اور اس قسم کی زندگی میں کیا مزہ ہے تو ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا - جو کچھ مزے لوٹنے ہوں ایک ہی دفعہ لوٹ لو - آیندہ ہرچہ بادا باد یہ ایک ولولہ شیطانی تھا جو میرے ضمیر پر غالب آگیا - اب دل میں کوئی ہوس باقی نہیں رہی اس مضمون کو نظیر اکبر آبادی نے خوب باندھا ہے - چنانچہ کہتے ہیں -

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں / یہ بہار عیش یہ شور جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب شراب ارغوانی پھر کہاں / عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں

شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

اب جو آغاز جوانی کی بہاریں ہیں یہاں — عیش و عشرت میں اڑائے زندگی کی خوبیاں
نشہ پیکر کوئی دم کرلے تو سیر بوستاں — واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان

دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

پیرس کی عمارتیں

پیرس میں متعدد عمارتیں اور مقامات دیکھنے کے لائق ہیں جن میں سے چند خاص عمارتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آرچ ڈی ٹرمیف۔ یہ عالیشان کمان جو ایک وسیع چبوترے پر ہے شہر کے ممتاز حصہ میں واقع ہے۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں نپولین نے اپنی فتوحات کی یادگار میں اس کی بنیاد رکھی لیکن تیس سال کے بعد یہ تکمیل کو پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ تین لاکھ باسٹھ ہزار پونڈ اس پر صرف ہوئے۔ یہ عمارت متعدد خوبصورت مورتوں سے آراستہ ہے اوپر سے پیرس کے اطراف واکناف کا منظر بہت عالیشان ہے۔ اسی کمان کے نیچے جنگ عظیم کی یادگار میں غیر معلوم سپاہی کی قبر بھی بنی ہوئی ہے۔

نوتر دام۔ یہ ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ جس کے معنی (ہماری مریم) ہے۔ اس نام کا ایک گرجا جزیرہ شہر میں واقع ہے۔ دنیا کے خوبصورت ترین گرجاؤں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی تعمیر سنہ ۱۱۶۳ء میں شروع ہوئی اور سنہ ۱۲۵۰ء میں یہ مکمل ہوا۔ اس گرجا کے دو مینار ہیں۔ ہر مینار کی بلندی دو سو چھپن فیٹ ہے سنگ تراشی کی صنعت اور نقش و نگار کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

لوور۔ یہ عالیشان عمارت دریائے سین پر واقع ہے۔ دنیا میں اس سے بہتر اور وسیع کوئی شاہی محل نہیں ہے۔ شاہان فرانس اس میں رہتے تھے۔ جمہوریت کے زمانہ میں اس محل کو عجائب خانہ کر دیا گیا۔ اب اس کا شمار دنیا کے بہترین عجائب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس محل کے وسیع احاطہ میں اچھے اچھے چمن اور فوارے بنے ہوئے ہیں

بڑا دلکش مقام ہے ۔

ہوٹل دی انولید۔ یہ عمارت بھی بہت دلچسپ ہے ۔ ۱۶۷۰ء میں فرانس کے ایک بادشاہ نے اس کو بنایا تھا ۔ دراصل یہ ایک شفاخانہ تھا ۔ جس میں زخمی سپاہی رکھے جاتے تھے ۔ اس عمارت کے ایک حصہ میں عجائب خانہ ہے ۔ جس میں قدیم ہتھیار ۔ زرہ ۔ بکتر فوجی جھنڈیاں اور توپیں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں ۔ اسی عمارت کے دوسرے حصہ میں نپولین اعظم کی قبر ہے ۔ قبر پر سرخ سنگ مرمر کا خوبصورت تعویز بنا ہوا ہے ۔ قبر کے قریب ایک حصہ عمارت میں نپولین کے ذاتی استعمال کی متعدد چیزیں بطور نمائش جمع کی گئی ہیں ۔ مثلاً اس کی مسہری ۔ کرسیاں اور تلوار وغیرہ ۔ ان چیزوں کو دیکھکر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے ۔ تقریباً سات برس یہ بادشاہ آفریقہ کے قریب سینٹ ہلینا مینے ایک جزیرہ سے قید رہا ۔ اور وہیں دفن بھی ہوا ۔ انتقال کے کوئی بیس برس بعد ۱۸۴۰ء میں اس کی لاش پیرس میں منتقل کی گئی ۔ کس قدر باہمت اور دبدبہ کا آدمی تھا ؎

کہاں سلیمان کہاں سکندر کہاں ہے جم اور کہاں ہے دارا
یہ سب خاک کے تھے پتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر

ہوٹل دی وِل ۔ اس عمارت میں پیرس کے محکمہ صفائی کا دفتر ہے ۔ اس کا شمار یورپ کے زمانہ حال کی خوبصورت ترین عمارتوں میں کیا جاتا ہے ۔

میدلین ۔ یہ ایک خوبصورت گرجا گھر ہے جس کی تعمیر ۱۷۶۴ء میں شروع ہوکر ۱۸۴۲ء میں ختم ہوئی ۔ ایک بڑے چوراستہ پر واقع ہے ۔ اس کے بالمقابل پیرس کی ایک ممتاز سڑک اسی گرجا گھر کے نام پر موسوم ہے ۔

ساربان دریائے سین کے کنارہ پر یہ فرانس کی قدیم یونیورسٹی ہے ۔ جو اپنی قدامت میں اکسفورڈ اور کیمبرج سے بازی لے گئی ہے ۔ غیر ممالک کے اکثر طالب علم

تحصیل علم کے واسطے اس یونیورسٹی میں آتے ہیں ۔

ایفل ٹاور ۔ یہ ایک زبردست لوہے کا بنا ہوا سہ منزلہ مینار ہے ۱۸۸۹ء میں جو نمایش پیرس میں ہوئی تھی اس وقت یہ مینار بنا تھا اس کی بلندی نو سو چھپن فٹ ہے ۔ اور اپنی نوعیت کا دنیا میں سب سے اونچا مینار ہے ۔ پیرس میں جس طرف جاؤ یہ مینار ضرور نظر آتا ہے ۔ برقی جھولوں کے ذریعہ مسافروں کو اوپر لیجاتے ہیں ۔ اوپر سے پیرس کا منظر دیکھنے کے لائق ہے ۔ اس مینار کی تعمیر میں ساٹھ ہزار پونڈ گورنمنٹ نے صرف کئے اور ایک لاکھ چالیس ہزار پونڈ اس انجنیر نے اپنے پاس سے لگائے تھے ۔ جس نے اس کو بنایا تھا ۔ اس کو توقع تھی کہ داخلہ کے ٹکٹوں کی قیمت کے ذریعہ وہ اس رقم کی پابجائی کرے گا ۔ خدا معلوم وہ کہاں تک کامیاب ہوا ۔

میوزی گریوں ۔ یہ نمایش بھی قابل دید ہے ۔ لندن میں میڈم ٹوساڈ کی جو نمایش ہے ۔ اس کے یہ مماثل ہے ۔ بلکہ مجھ کو اس سے بہتر معلوم ہوئی ۔ پیرس کے تاریخی واقعات کا فوٹو ان تپلوں کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے ۔ ایک خاص چیز اس نمایش میں یہ ہے کہ ایک مقام پر گاندھی جی کی مورت بھی بنی ہوئی ہے ۔ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی بیٹھے ہوئے ہیں ۔

آپیرا ۔ تقریباً وسط شہر میں یہ ناچ گھر دنیا کا بہترین اور سب سے بڑا تھیٹر ہے ۔ یہ عمارت تین ایکر سے زیادہ زمین پر نہایت شاندار بنی ہوئی ہے اس کی اندرونی آرایش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ جہاں یہ واقع ہے وہ محلہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اسی کے قریب چوراستہ پر ایک مینار ہے جس کو وِنڈوم کہتے ہیں ۔ نپولین اعظم نے اپنی فتوحات میں جن توپوں کو بطور مال غنیمت حاصل کیا تھا ۔ ان کو پگھلا کر یہ مینار بطور یادگار بنایا گیا ۔ نپولین کا ایک مجسمہ اس مینار پر اس کی یاد کو تازہ کرتا ہے ۔

ورسائی - یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو بذریعہ ریل پیرس سے نصف گھنٹے کی مسافت پر ہے - یہاں ایک عالیشان شاہی محل ہے جس کو فرانس کے ایک مشہور بادشاہ نے بنایا تھا - اطراف کے باغ اور فوارے قابل دید ہیں - اب یہ محل عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔

بوادی بولون - پیرس کے جنوب ومغرب میں یہ عجیب وغریب سیرگاہ دیکھنے کے لائق ہے - ہم یہاں جس طریقہ پر پہنچے وہ بھی لائق تذکرہ ہے - ایک روز یہ ہوا کہ ہم ایفل ٹاور جانا چاہتے تھے - ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ ایفل ٹاور لے چلو وہ سمجھا نہیں - شاید یہ لوگ اس کو کچھ اور کہتے ہیں - ہم نے ہاتھ اونچا کرکے اشارہ سے بتلایا کہ وہ ایک اونچی چیز ہے وہاں چلو - اس نے کہا اچھا بیٹھ جاؤ - ہم دونوں ٹیکسی میں سوار ہوگئے - ہم کو یہ معلوم تھا کہ اس مقام سے ایفل ٹاور دو میل سے زیادہ نہیں - مگر جب ٹیکسی میں سوار ہوئے تو یہ معلوم ہوا کہ موٹر والا ہمارا مطلب سمجھا نہیں ہے - کیونکہ وہ ہم کو شہر سے باہر ایک جنگل کی طرف پچیس تیس میل لے گیا - وہاں ایک پہاڑ پر آبادی تھی - دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ یہاں کی مشہور سیرگاہ بوادی بولون ہے - سرسبز درخت - نفیس سڑکیں - خوبصورت چمن اور تالاب وغیرہ نے عجیب دلکش اثر پیدا کیا - یہاں عاشق مزاجوں کا جمگھٹ رہتا ہے - نوجوان اور حسین عورتیں بناؤ سنگار کرکے اپنا جوبن دکھانے کے لئے اس نواح میں چکر لگاتی رہتی ہیں - اس وسیع سیرگاہ کا رقبہ دو ہزار ایکڑ سے کم نہ ہوگا ایک روز شام کے وقت ہم بیٹھے تفریح کر رہے تھے کہ ایک نازنین مہ جبین کو دیکھا کہ آہستہ خرامی کے ساتھ گلگشت کر رہی ہے - کچھ عاشقان جانباز دور دور سے اس کے حسن کا لطف اٹھا رہے تھے - دوسرے لوگوں کو بھی اس جانب متوجہ دیکھ کر ہم کو دریافت حال کی ضرورت ہوئی - معلوم ہوا کہ یہ حسن کی دیبی آج کل پیرس میں یکتائے زمانہ ہے کبھی کبھی تفریح کے واسطے اس طرف بھی نکل آتی ہے - میں نے خیال کیا اس کو تو چاہیئے تھا - کہ ایک ہی جگہ بیٹھی رہا کرے - حسن کے پجاری خود ہی پروانہ وار جمع ہو کر

اس کی پرستش میں مصروف رہیں گے ؎

تو کجا بہر تماشہ میروی

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو

افسوس ہے کہ نہ تو میری قلم میں قوت ہے اور تخیل میں اتنی وسعت ہے کہ اس پری پیکر کا سراپا کھینچ سکوں۔ البتہ ہمارے ملک کے کوئی شاعر نازک خیال یہاں موجود ہوتے تو طبع آزمائی کے لئے اچھا موقع تھا مگر مشکل تو یہ ہے کہ وہ شب دیجور اور مار سیاہ کی تلاش میں رہتے اور یہاں لوگ سنہری بال پر سر دھنتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حسن کا بھی کوئی مقررہ معیار نہیں ہے۔ ہر ملک کا مذاق جداگانہ ہے۔

پیرس تا برن

پیرس کی سیر سے فارغ ہو کر ہم سوئیٹزرلینڈ روانہ ہوئے لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ رفیق بیگ کو مجھ سے الگ ہو جانا پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ لندن سے روانہ ہوتے وقت ہم دونوں نے راست جنیوا کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ رفیق بیگ نے اپنا ٹکٹ کاکس اینڈ کنگ کمپنی کی معرفت خریدا۔ میں نے امریکن اکسپریس سے لیا۔ اتفاق سے الگ الگ راستہ کے ٹکٹ ملے۔ مجبوراً الگ الگ سفر کرنا پڑا مگر لطف یہ ہے کہ پیرس سے روانہ ہوتے وقت ہم دونوں کی ریلیں بالمقابل ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں اور تقریباً ایک ہی وقت ہم روانہ بھی ہوئے۔ رفیق بیگ جنیوا چلے گئے۔ مجھ کو لوزان جانا پڑا۔ غلطی سے قلی نے میرا اسباب ایسے درجہ میں رکھ دیا جو راست برن کو جاتا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں معلوم ہوئی۔ اسباب کو فوراً منتقل کرنا خالی از زحمت نہ تھا۔ ماسوا اس کے ایک مسافر نے کہا کہ برن اچھا مقام ہے۔ چلے جاؤ تو کچھ ہرج نہیں وہاں سے لوزان چلے جانا۔ مجھکو بھی سہولت اسی میں معلوم ہوئی۔ کچھ فاضل کرایہ دیکر برن کا ٹکٹ لے لیا۔ اب تک تو ہم انسانی کارگزاریاں دیکھتے چلے آئے۔ مگر اب سوئیٹزرلینڈ میں کارکنان قدرت کی کارسازیاں

دیکھنے میں آینگی ۔ یہ ظاہر ہے کہ "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک" انسان بیچارے کی کیا حقیقت ہے جو قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کرسکے ۔ مگر پھر بھی اس کی کوششیں تعریف کے لایق ضرور ہیں ۔ برلن ۔ لندن اور پیرس کے عجائبات دیکھنے کے بعد اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ عقل انسانی روز بروز ترقی پر ہے ۔ بالخصوص ایجاد کی دنیا میں تو اس ناقص العقل ہستی نے وہ کارنمایاں کئے ہیں کہ خود عقل اپنی جگہ حیران رہ جاتی ہے ۔ البتہ افسوس ہے تو یہ کہ آدمی اس قوت لاثانی کا شکریہ کما حقہٗ ادا نہیں کرتا ۔ جس نے اس کو ذرہ سے اس درجہ کمال کو پہنچایا ۔ بلکہ غرور نے اس کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالدیا ہے کہ وہ اپنی اصلیت کو بھولتا جاتا ہے ۔ پیغمبر اسلام پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس میں خداوند کریم نے اشارہ فرمادیا ہے کہ پہلے انسان کس حالت میں تھا ۔ چنانچہ سورہ علق میں یہ ارشاد ہوا ہے ۔ "خلق الانسان من علق ؕ" (انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا) اسی سورہ میں اس بات کو بھی صاف کردیا گیا کہ علم جیسی بیش بہا چیز بھی خالق دوجہاں کی عطا کردہ ہے ۔ الذی علم بالقلم ؕ (جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا) اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ (علم الانسان مالم یعلم ؕ انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں) اب اس کلام ربانی کو دنیا کے موجودہ حالات سے مطابق کرکے دیکھو ۔ کون عقل کا اندھا شبہ کرسکتا ہے کہ سائنس کی یہ ساری برکتیں منجانب اللہ نہیں ہیں ۔ بیشک یہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے اور اس امانت کو وہی واپس لے گا ۔ ان للہ وانا الیہ راجعون ۔

تقریباً ۱۰ بجے صبح کو پیرس کے ایک اسٹیشن گارے دی لیان سے روانہ ہو کر سر مغرب ریل برن پہنچی ۔ دوپہر کا کھانا ڈائننگ کار میں کھایا ۔ جیسے جیسے سوئٹزرلینڈ کی سرحد قریب آتی گئی مناظر قدرت کی دلفریبیاں بڑھتی جاتی تھیں ۔ درجہ میں دو تین مسافر کچھ دور تک ساتھ رہے ۔ مگر ایک میم صاحبہ پیرس سے برن تک ساتھ

رہیں ۔ برن کے قریب کسی قصبہ میں ان کا مکان ہے ۔ انگریزی پڑھنے کی غرض سے ایک عرصہ تک لندن میں قیام رہا ۔ اس لئے ان سے گفتگو کرنے میں مجھ کو زحمت نہیں ہوئی ۔ اس خاتون کی عمر کوئی تیس سال کے قریب ہو گی ۔ ابھی تک کنواری ہیں سنگار کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے اکثر بٹوے میں سے آئینہ نکال کر اپنے حسن کا مشاہدہ بار بار کر لیتی تھیں ۔ اگر کچھ نقص پائیں تو پوڈر وغیرہ کے ذریعہ اس کو رفع کر لیتیں ۔ سنگار کا یہ شوق یورپ میں وہم کی حد تک پہنچ گیا ہے ؎

لے آئینہ کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ	صورتیں اپنی قدرت پر وردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ	زلف دراز طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ	اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سوئٹزرلینڈ

بڑی تلاش کے بعد اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں جگہ ملی ۔ متوسط درجہ کا اور آرام دہ ہوٹل ہے ۔ اسے ہوٹل بیوین برگ کہتے ہیں ۔ کھانے کا انتظام بھی اس میں معقول ہے ۔ مسافر ہوٹل ہی میں کھانا کھائیں تو ان کے ساتھ کرایہ میں رعایت کی جاتی ہے ۔ کھانا اور کمرہ دونوں تشفی بخش ثابت ہوئے ۔ کرایہ دس شلنگ کے اندر تھا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہوٹلوں کا انتظام سوئٹزرلینڈ میں سب سے اچھا ہے ۔ یہاں کے لوگوں کو اس کام میں خاص ملکہ ہو گیا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ ان کی آمدنی اور زندگی کا دارومدار ہی مسافروں پر ہے جو دنیا کے ہر حصہ سے یہاں کے قدرتی مناظر اور صحت بخش آب و ہوا کی خاطر کثرت سے آتے رہتے ہیں ۔ اپنے ملک کو مقبول بنانے کے لئے ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسافر کو ہر طرح کی آسائش پہنچائی جائے ۔ ہوٹل میں دو ایک ملازم انگریزی جاننے والے تھے ۔ اس لئے بات چیت میں دقت نہیں ہوئی ۔

اس ملک میں جرمن - فرانسیسی - اور اطالوی - زبانیں بولی جاتی ہیں کیونکہ ان ممالک کی سرحد ملحق ہے - جو حصہ جس ملک سے ملا ہوا ہے وہاں اس ملک کی زبان رائج ہے - یہی حال مذہب کا ہے - کچھ لوگ پروٹسٹنٹ اور کچھ رومن کیتھلک - سارا ملک پچیس صوبوں میں منقسم ہے - ہر صوبہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہے - مگر بحیثیت مجموعی سب ایک قوت کے ماتحت ہیں - کسی زمانہ میں یہ ملک آسٹریا کے زیر اثر تھا - لیکن چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں وہ تعلق باقی نہ رہا اور ۱۶۴۸ء میں سوئیٹزرلینڈ ایک خود مختار سلطنت تسلیم کر لی گئی - موجودہ طرز حکومت کی بنیاد ۱۸۴۸ء میں پڑی - اس ملک کے باشندے مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں - علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے - اس لئے زراعت زیادہ نہیں ہو سکتی - جو کچھ تمول ہے وہ محض غیر ملک کے سیاحوں کی وجہ سے ہے - تھوڑی بہت دستکاری بھی ہے - کوئلہ اور دھات چونکہ اس ملک میں کمیاب ہے - اس لئے صنعت و حرفت میں ترقی نہیں ہو سکتی - لکڑی پر نقش و نگار یہ لوگ خوب کرتے ہیں - گھڑیاں بھی یہاں کی مشہور ہیں - چنانچہ دکانوں میں انواع و اقسام کی گھڑیاں بکثرت دیکھنے میں آتی ہیں - پنیر اور مکھن یہاں اچھا بنتا ہے - یہ دونوں چیزیں بیرونی ممالک کو کثرت سے بھیجی جاتی ہیں اور بہت مقبول ہیں - کچھ عرصہ سے سوئیٹزرلینڈ بین الاقوامی کارروائیوں کا مرکز ہو گیا ہے چنانچہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں صلح کی بڑی بڑی مجالس اسی ملک میں منعقد ہوئیں جنیوا میں تو مستقل دفتر لیگ آف نیشنس کا قائم ہو گیا ہے - آب و ہوا بڑی صحت بخش اور مناظر قدرت بے نظیر ہیں - خواہ گرمی ہو یا سردی ہر موسم میں ہزاروں سیاح اس ملک میں آتے رہتے ہیں - سرما میں جھیلوں کا پانی سردی کی شدت سے منجمد ہو جاتا ہے - اس یخ بستہ سطح پر لوگ اسکیٹنگ کرتے ہیں جو تفریح کا ایک

نہایت مقبول طریقہ ہے۔ قدرت نے اس ملک کو جو خوبصورتی عطا کی ہے اس میں انسانی کارگزاری نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ حقیقت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کارکنان قدرت نے سوئیٹزرلینڈ کو خاص اپنے ہاتھوں سے بہشت کے نمونہ پر بنایا ہے۔ اونچے اونچے سرسبز پہاڑوں کے دامن میں جھیلیں اور ان کے کناروں پر خوبصورت آبادیاں۔ بحیثیت مجموعی عجیب دلکش نظارہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو انسان اپنے کو عالم خواب میں خیال کرے۔

برن

برن اگرچہ اس ملک کا دارالسلطنت ہے لیکن وسعت آبادی کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ شہر ایک بے ہنگم پہاڑی پر آباد ہے۔ جس کے تین جانب دریائے آر بہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ برن کا نام لفظ بیر سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "ریچھ" کے ہوتے ہیں۔ یہ روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ شہر میں ایک محصور مقام پر قدیم زمانہ سے ریچھ پالے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے حوض بنے ہوئے ہیں جن میں ریچھ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب علامت ہے قدیم عمارتوں میں ٹاون ہال اور گھنٹہ گھر دیکھنے کے لائق ہیں۔ گھنٹہ گھر بیچ شہر میں ہے۔ عمارت تو معمولی ہے لیکن گھنٹے میں ایک خاص صنعت رکھی گئی ہے جس وقت وہ بجتا ہے تو لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جوق جوق جمع ہو جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ گھنٹے کی ہر باج پر مرغ کی بانگ نکلتی ہے اور ایک جانب ریچھوں کی قطار نمایاں ہو جاتی ہے۔ گھنٹہ گھر کی عمارت قدیم وضع کی ہے۔ زمانہ حال کی عمارتوں میں ایوان پارلیمنٹ۔ عجائب خانہ اور لائبریری تعریف کے لائق ہیں۔ بازاروں کی وضع بھی خاص ہے۔ دکانوں کے سامنے ورانڈے ہیں۔ اگرچہ موسم کی سختی سے حفاظت کے لئے یہ تدبیر اچھی ہے۔ مگر چھت نیچی ہونے کی وجہ سے دکانوں میں اندھیرا رہتا ہے۔ سڑکیں اچھی اور جدید وضع کی ہیں۔ ٹریم بھی چلتی ہے۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی اور

رونق رہتی ہے ۔اسٹیشن پر بھی دن رات مسافروں کا ہجوم ہوتا ہے مختلف ہوٹلوں کے ملازم اپنا اپنا نشان لگائے ہوئے اسٹیشن پر ایک مقررہ جگہ قطار باندھے کھڑے ہوتے ہیں ۔لیکن کیا مجال ہے کہ کوئی مسافر سے کچھ کہے یا پریشان کرے ۔ان ملازمین کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ اپنے ہوٹل کے مسافروں کا اسباب ہوٹل پہنچا دیں ۔برن جس پہاڑی پر آباد ہے اس کے کنارہ ایک طرف باغ ہے ۔ وہاں سے اطراف کا منظر بڑا دلکش ہے ۔ اس ملک میں ایک بات اچھی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ غیر ملک کی چیزیں اصلی داموں پر ملتی ہیں ۔کیونکہ ان پر محصول زیادہ نہیں لیا جاتا ۔ مثلاً فرانس اور اٹلی وغیرہ میں انگریزی سگریٹ بہت گراں بکتا ہے ۔سوئیٹزرلینڈ میں یہ کیفیت نہیں ہے بات یہ ہے کہ اس ملک میں چونکہ صنعت وحرفت زیادہ نہیں ہے ۔اس لئے مسافروں کی خاطر باہر سے ہر چیز منگوانی پڑتی ہے ۔ اشیا پر محصول اگر بڑھا دیا جائے تو لازماً ہر چیز مہنگی ہو جائے گی ۔ اور مسافر اس کو محسوس کریں گے ۔چھوٹا ملک اور چھوٹے چھوٹے شہر لیکن بازاروں کی رونق بڑے بڑے شہروں کو مات کرتی ہے ۔

لوزان تین روز یہاں قیام کرنے کے بعد میں اپنے ٹکٹ کے لحاظ سے لوزان گیا ۔ یہ وہی شہر ہے جہاں جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلح کی مجلس منعقد ہوئی تھی ۔جھیل جنیوا کے شمالی کنارے ایک پہاڑ کے ڈھلاؤ پر یہ شہر آباد ہے ۔سارے ملک کی اعلیٰ عدالت اور یونیورسٹی اسی شہر میں ہے ۔یہاں کا گرجا سوئیٹزرلینڈ میں سب سے خوب صورت ہے ۔ اسٹیشن کے قریب یوراسیپلان ہوٹل میں قیام ہوا وہ ایک ملازم انگریزی جانتے ہیں ۔جھیل کا کنارہ بڑی تفریح کا مقام ہے ۔اطراف کے منظر کی دلربائی کو تحریر میں لانا میرے امکان سے خارج ہے ۔سوئیٹزرلینڈ میں فرانس کی طرح فرنیک اور سانتیمن کا رواج ہے لیکن یہاں کے فرنیک کی قیمت نو دس آنہ کے برابر ہوتی ہے ۔موسم گرما میں مقیاس الحرارت پچاس اور ساٹھ ڈگری کے

درمیان رہتا ہے۔

میلان

لوزان دیکھنے کے بعد میرا قیام میلان میں ہوا جو اٹلی کے علاقہ میں ایک بڑا شہر ہے۔ راستہ میں ایک مشہور درہ پڑتا ہے جس کے اندر سے ریل گزرتی ہے۔ یہ درہ سمپلان ٹنل کے نام سے مشہور ہے۔ یورپ میں اس سے لمبا کوئی ٹنل نہیں ہے۔ بارہ میل سے کچھ زائد اس کا طول ہے۔ یہ ٹنل ۱۹۰۶ء میں تیار ہوا راستہ میں کوہ الپس کے دل آویز مناظر دیکھنے میں آئے۔ ہمارے درجہ میں ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی اس قدر گھنی اور بڑی تھی کہ میں نے اب تک کبھی نہیں دیکھی۔ تعجب ہے کہ اتنی زبردست داڑھی سے اس شخص کا دم نہیں گھبراتا اور تکلیف نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس کو اپنی داڑھی پر فخر بھی ہو کیونکہ بلا مبالغہ یہ ایک غیر معمولی چیز تھی۔ رات کے وقت اگر کچھ اس شخص کو دیکھ لیں تو ڈر کر دوسرے دن تک بدخوابی ہوتی رہے۔ انگریزی سے ناواقف تھا ورنہ میں ضرور اس کو خوش کرنے کے لئے اس نادرالوجود چیز کے مالک ہونے پر مبارکباد دیتا۔ اور اس کو ایک ایرانی شاعر کا یہ شعر سناتا ؎

ریش باید دو سہ موئے کہ زنخداں پوشی
نہ کہ در سایہ او بچہ دہر خرس گوشی

رات کو آٹھ بجے کے قریب ریل میلان پہنچی۔ سنٹرل اسٹیشن کے قریب اشمد نامی ہوٹل میں ٹھیرنا ہوا۔ آبادی کے حساب سے یہ شہر اٹلی میں درجہ دوم پر ہے۔ لیکن کاروبار اور تمول کے لحاظ سے سب سے اول ہے۔ مردم شماری چھ لاکھ کے قریب بتلائی جاتی ہے ریشمی اُونی اور سوتی کپڑا یہاں اچھا بنتا ہے۔ دو عمارتیں خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک گرجا اور دوسرا تھیٹر۔ گرجا شان و شوکت اور فن تعمیر کے لحاظ سے دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگرچہ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تھی لیکن سینکڑوں برس تک مکمل نہ ہو سکا۔ جرمن اور فرانس کے مشہور ماہرین فن

مشورے کے لئے بلائے گئے۔ کمیٹیاں ہوتی رہیں۔ غیر ملکیوں سے ملکی ماہرین فن کا جھگڑا ہوگیا۔ جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک تعمیر ملتوی رہی بالآخر نپولین بونا پارٹ نے اس کو مکمل کیا۔ تمام عمارت سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے لیکن امتداد زمانہ کی وجہ سے پتھر میلا ہوگیا۔ باہر سے عمارت کی دلفریبی انسان کو محو حیرت رکھتی ہے۔ دو ہزار کے قریب سنگ مرمر کی خوبصورت مورتیں اور متعدد خوشنما بُرجیاں عمارت کی شان کو دوبالا کر رہی ہیں۔ سنا ہے کہ چاندنی رات میں اس کا منظر خاص کیفیت رکھتا ہے۔ یہ گرجا ایک سو باسٹھ گز طویل اور تہتر گز چوڑا ہے۔ سیر کرانے کے لئے ایک رہبر مقرر ہے۔ بالائی حصہ پر سے شہر کا منظر خاص طور پر دیکھنے کے لایق ہے۔ گرجا کے اندر ایک قدیم پتیلی شمعدان درخت کی وضع کا دیکھنے میں آیا۔ جس میں سات شاخیں ہیں۔ گرجا کی چھت باون ستونوں پر قایم ہے اور ہر ستون کی گولائی سولہ قدم کے قریب ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ عمارت دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں مذہب کی کچھ عظمت باقی ہے۔ عورتوں کو دیکھا کہ گرجا سے واپس ہوتے وقت داخلہ کے دروازہ کے قریب ٹھیر کر تعظیماً جھکجاتی ہیں

دوسری عمارت ایک تھیٹر اسکالا نامی ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت میں یکتائے زمانہ ہے یہ ۱۷۷۸ء میں تیار ہوا۔ اس میں تین ہزار چھ سو آدمیوں کی نشست کا بندوبست ہے اس شہر میں چھوٹے چھوٹے اور کچھ بڑے گرجا بکثرت ہیں۔ ایک قبرستان بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ملک کے مشہور افراد اور قومی خدمت کرنے والوں کی قبریں ہیں قبروں کو بہت آراستہ رکھا گیا ہے۔ شہر اگرچہ بڑا ہے۔ لیکن عمارتیں عام طور پر ایسی شاندار نہیں ہیں۔ جو یورپ کے دیگر ممالک میں دیکھی گئیں۔ قدیم مکانوں کی چھت سفال پوش ہے۔ کویلو اسی وضع کا استعمال کرتے ہیں جیسے ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ صفائی اور ستھرائی میں یہاں کے لوگ شمالی یورپ سے بہت پیچھے ہیں۔ ایمانداری بھی ویسی نہیں ہے۔ لیکن خوش مزاج اور حسین ہوتے ہیں۔ یورپ میں ایسی خوبصورتی دیکھنے

میں نہیں آتی - فرانسیسیوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں -
کاش کہ ہم کو ان کی زبان آتی اور ہم ان سے باتیں کرتے - اطالوی زبان فرانسیسی
کی طرح بہت میٹھی معلوم ہوتی ہے - کھانا پکانے میں یہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں
نپولین بوناپارٹ نے اس شہر کو اپنی حکومت کے زمانہ میں اٹلی کا دارالسلطنت قرار
دیا تھا -

بلونیا

میلان کی سیر کرنے کے بعد میرا قیام بلونیا میں ہوا جو میلان سے (۱۳۵) میل کے فاصلہ پر جنوب و مشرق میں واقع ہے - یہاں صرف چند گھنٹے
ٹھیرنا ہوا کیونکہ وینس کے واسطے ریل تبدیل کرنی ضروری تھی - اس شہر کی سڑکیں وسیع
اور لمبی ہیں - متعدد گرجا گھر اور قدیم عالیشان عمارتیں یہاں دیکھنے میں آئیں - دو مینار خاص
طور پر دیکھنے کے لایق ہیں - ان کی صفت یہ ہے کہ درمیان میں خمیدہ ہیں - ایک مینار
جو بارھویں صدی عیسوی میں بنا تھا (۳۱۸) فٹ بلند ہے اور اس کا خم خط مستقیم سے
چار فٹ تک ہٹا ہوا ہے - دوسرا مینار بھی اسی زمانہ میں تعمیر ہوا تھا - اس کی بلندی
(۱۵۴) فٹ ہے لیکن سات فٹ کے قریب خمیدہ ہے - یہ دونوں مینار اینٹ کے
بنے ہوئے ہیں - کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں دشمن کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے
اور مدافعانہ اغراض کے پیش نظر یہ بنائے گئے تھے - شہر کے بیچ میں دو چوراہے
بڑے خوبصورت ہیں - بلونیا ایک قدیم شہر ہے - جس کی موجودہ آبادی ڈیڑھ لاکھ
کے قریب ہوگی - سب سے بڑا گرجا سان پیٹرونیو کے نام سے مشہور ہے - چودھویں
صدی عیسوی میں اس کی تعمیر شروع ہوئی - لیکن غیر مکمل رہ گیا - بنانے والوں کے
خیالات بہت اونچے تھے - وہ چاہتے تھے کہ یہ گرجا اس قدر عالیشان ہو کہ دنیا میں
اس کی نظیر نہ ملے مگر کار دنیا کسے تمام نہ کرد" کی مثل صادق آئی اور سنہ ۱۶۵۹ ع
میں اس کو نامکمل چھوڑنا پڑا -

وینس

بلونیا سے وینس زیادہ دور نہیں ہے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب ہماری ریل یہاں پہونچی۔ اب تک تو ہر جگہ موٹر میں سوار ہوتے رہے۔ لیکن یہاں سواری مفقود ہے۔ اسٹیشن پر امریکن اکسپریس کا ملازم موجود تھا اس نے ایک کشتی میں مجھ کو سوار کرا کے کہا لیجئے آپ وینس کی موٹر میں سوار ہو گئے گرینڈ کینال یعنی نہر کلاں کے کنارے ایک ہوٹل میں قیام ہوا۔ باہر سے عمارت بہت معمولی ہے۔ لیکن اندر سے خوب آراستہ ہے۔

یہ شہر اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا میں عجیب وغریب ہے۔ بحر اڈریاٹک میں ایک جھیل تھی جس کا پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ یہ جھیل تقریباً پچیس میل لمبی اور نو میل چوڑی تھی اور اس میں ایک سو سترہ چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں نے ان ہی جزیروں میں اس شہر کی بنیاد رکھی۔ صفت یہ ہے کہ سڑک کا نام نشان نہیں۔ ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر نہریں ہیں۔ یہی سڑک کا کام دیتی ہیں۔ نہروں کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے ہیں۔ کشتیوں کے ذریعہ آمد و رفت رہتی ہے۔ ان کشتیوں کو یہاں کے لوگ گنڈولہ کہتے ہیں۔ سہولت کے مد نظر جا بجا پل بھی بنے ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد چار سو کے قریب تبلائی جاتی ہے۔ ایک نہر کسی قدر چوڑی اور دو میل لمبی ہے۔ جس کو گرینڈ کینال یعنی نہر کلاں کہتے ہیں۔ اس نہر کی اوسط چوڑائی ستتر گز اور گہرائی سولہ فٹ ہے۔ یہ گویا یہاں کی سب سے بڑی شاہ راہ ہے دوسری نہریں بہت تنگ ہیں۔ کشتیاں ہر وقت کرایہ پر چلتی رہتی ہیں۔ اب نہر کلاں میں چھوٹے چھوٹے اسٹیمر بھی چلنے لگے ہیں۔ گاڑی۔ گھوڑا۔ اور موٹر بالکل مفقود ہے۔ لوگ یا تو پیدل چلتے ہیں۔ یا کشتیوں میں پھرتے ہیں۔

وینس بہت قدیم شہر ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں ایک بادشاہ اٹیلا نامی تھا۔ خونریزی اور جنگ وجدل میں اس نے بڑی

شہرت حاصل کی۔ یورپ کے جنوبی حصہ میں اس کے مظالم نے اس قدر بدامنی پیدا کردی کہ کچھ لوگ اپنی جان بچا کر سمندر کے کنارے آگئے۔ اس زمانہ میں وہاں دَل دَل کے سوا کچھ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان ہی لوگوں نے وینس کو آباد کیا اور ایسی ترقی کی کہ ایک عرصہ تک یہاں آزاد حکومت قایم رہی۔ اسی بندرگاہ سے بلاد شرقیہ کو جہاز جایا کرتے تھے۔ یہی مقام تجارت کا مرکز تھا۔ عرصہ تک قسطنطنیہ اس حکومت کے زیر اثر رہا۔ لیکن قدرت کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ چنانچہ وینس کی حکومت بھی کمزور ہوتی گئی۔ قسطنطنیہ کو ترکوں نے فتح کرلیا۔ اور سلطنت روما کی بنیادیں ڈھیلی پڑگئیں۔ اس اثنا میں ممالک شرقیہ کو جانے کے لیے سمندر کے دوسرے راستے بھی دریافت ہوگئے وینس کی تجارت گھٹتی چلی گئی۔ آئے دن کی جنگ اور خونریزیوں نے اور بھی تباہ کردیا۔ بالآخر ۱۷۹۷ء میں نپولین بونا پارٹ نے اس شہر کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد آسٹریا کا قبضہ رہا۔ اب ۱۸۶۶ء سے مستقل طور پر یہ شہر اٹلی کے علاقہ میں شامل ہے۔ قدیم وینس کے حاکم کا لقب ڈوجے ہوا کرتا تھا۔ ہر حاکم اسی لقب سے مخاطب کیا جاتا۔ چنانچہ ایک عالیشان محل ابھی تک موجود ہے جسے ڈوجے کا محل کہتے ہیں۔

یہاں کی تمام عمارتیں قدیم ہیں۔ کیونکہ جدید عمارت کے واسطے جگہ نہیں ملتی یہی کیفیت ہوٹلوں کی ہے۔ باہر سے دیکھو تو بوسیدہ اور معمولی مکان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اندر سے آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں۔ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت اٹلی میں ہوٹل گراں ہیں، اور چوری چکاری کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے چنانچہ رفیق بیگ نے چیمبر میڈ پر اعتماد کرکے کوٹ کھونٹی پر ٹنگا چھوڑ دیا اس کوٹ کی جیب میں کچھ نوٹ تھے جو سرقہ گئے۔ ہوٹل میں قیام کرنے کے

بعد سب سے پہلے فکر رفیق بیگ کو تلاش کرنے کی ہوئی - یاد ہوگا کہ یہ مجھ سے پیرس میں الگ ہوگئے تھے - ان کے ہوٹل کا پتہ بھی معلوم نہ تھا - حسن اتفاق دیکھو کہ میں امریکن اکسپرس کے دفتر جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر پیچھے سے آواز آئی السلام علیکم - پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب بیک بینی و دو گوش موجود ہیں - معلوم ہوا کہ کسی دوسرے ہوٹل میں مقیم ہیں - میں نے مزاج پرسی کی بہت ناراض تھے - فرمانے لگے میں تین روز سے تمہارے انتظار میں یہاں پڑا ہوا ہوں خدا معلوم کہاں غائب ہوگئے تھے - اس تنہائی اور پریشانی میں کئی دفعہ میری ناف ٹل چکی ہے - اور اب پھر ٹلنے کو ہو رہی ہے - میں نے کہا گھبراؤ نہیں - یہ فال نیک ہے - یاد ہوگا کہ سفر کے شروع ہونے پر بھی تمہاری ناف ٹلی تھی - اسے سفر کا خاتمہ سمجھو - خدا کا شکر ہے کہ سفر بہت کامیاب رہا - اب ہم ساحل یورپ کو خیرباد کہنے والے ہیں - تمہاری ناف بہت موقعہ سے ٹلی ہے اس کے ٹلنے کو تم نہ ٹالو -

وینس کی گلیاں عام طور پر تنگ اور غلیظ ہیں - بعض گلیاں تو بالکل بھول بھلیاں ہیں - اجنبی آدمی ان گلیوں میں گھبرا جاتا ہے - دو ایک دفعہ میں راستہ بھول کر ایک بھول بھلیاں میں پڑ گیا - وہ پریشانی بھی ہمیشہ یاد رہے گی - گھنٹوں گلیوں میں چکر لگاتا رہا ان کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا اور ختم بھی ہوتا تو اس طرح کہ آگے راستہ بند - مجھ کو بنارس کی تنگ و تاریک گلیاں یاد آئیں - صرف ایک مقام اس شہر میں کسی قدر کشادہ ہے - وہیں رونق بھی رہتی ہے اگر انسان تمام دن یہاں بیٹھا رہے تو شاید دم نہ گھبرائیگا - اس جگہ قدیم شاہی عمارتیں بھی ہیں - اس مقام کا نام سینٹ مارک اسکویر ہے - وینس کے کسی دوسرے حصہ میں اس قدر خوبصورت اور عالیشان عمارتیں جیسی اس

محدود حصہ میں ہی پائی نہیں جاتیں - جانب مشرق سینٹ مارک کا گرجا ہے شمال وجنوب میں قدیم عمارتیں ہیں جن میں عماید سلطنت رہا کرتے تھے - اب ان میں دکانیں ہیں - مغرب میں بھی قدیم عمارتیں ہیں - ان تمام عمارتوں کے سامنے سائبان اور وسط میں صحن ہے - ہزارہا کبوتر اس صحن میں دانہ چگتے رہتے ہیں - شاہی زمانہ میں ان کبوتروں کو منجانب سرکار دانہ ملا کرتا تھا - اب عوام ان کی خبرگیری کرتے رہتے ہیں ہفتہ میں چار روز شام کے وقت یہاں بینڈ نوازی ہوتی ہے پہلوؤں میں رسٹوران ہیں - گرمی کے موسم میں میز کرسیاں صحن میں ڈال دی جاتی ہیں - لوگ یہاں بیٹھکر تفریح میں مصروف رہتے ہیں - البتہ اس وقت رسٹوراں والے قیمت دوگنی وصول کرتے ہیں - صحن کے ایک جانب چبوترے سے سمندر کی لہریں ٹکراتی رہتی ہیں - چاندنی راتمیں یہ منظر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے - شمالی گوشہ میں ایک پھاٹک ہے اور اس پر ایک عالیشان وعجیب وغریب گھنٹہ گھر بنا ہوا ہے - جس کے بالائی حصہ پر دو پیتیل کی مورتیں ہیں - ان کے درمیان ایک گھنٹہ ہے - یہ پیتل کی مورتیں اس پر دونوں طرف سے موگری کی زد لگاتی ہیں - یہ آواز چاروں طرف دور تک پھیلتی ہے - سینٹ مارک کا گرجا مشرقی وضع کی ایک قدیم اور خوبصورت عمارت ہے جسکی لمبان (۸۳) گز اور چوڑان (۵۶) گز ہے - اس پر پانچ خوشنما گنبد ہیں اور پانچ سو کے قریب سنگ مرمر کے ستون عمارت کی زیبائش میں ترقی دیتے ہیں - جابجا سنہری رنگ آمیزی عجیب لطف پیدا کرتی ہے - الغرض بڑی شان وشوکت کی عمارت ہے گرجا کے اندر کی سیر بھی ضرور کرنی چاہیئے - اس عمارت کے سامنے پیتل کے تین ستون ہیں جن پر قدیم صنعت کے نقش ونگار ہیں - ستونوں پر جھنڈے اڑتے رہتے ہیں - داخلہ کے دروازہ پر چار پیتلی گھوڑے ہیں یہ تحقیق نہیں ہے کہ کہاں سے لائے گئے صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۲۰۴ء میں ایک بادشاہ ان کو لایا تھا - بعض کا خیال ہے کہ

قسطنطنیہ سے بطور مال غنیمت حاصل ہوئے۔ ہر گھوڑے کی اونچائی پانچ فٹ ہے۔ یہ گھوڑے نپولین بوناپارٹ کو اس قدر پسند آئے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ پیرس لے گیا بعد میں جب نپولین کا ستارہ زوال میں آیا تو حق بہ حقدار رسید یعنے گھوڑے وینس کو واپس مل گئے۔ جنگ عظیم میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ مبادا نپولین کی طرح قیصر جرمنی کو بھی یہ بیش بہا چیز پسند آجائے اور دوبارہ ہاتھ سے جاتی رہے۔ اس لئے اس زمانہ میں گھوڑے اپنی جگہ سے ہٹائے گئے۔ اور کسی غیر معلوم مقام پر ان کو محفوظ کر دیا گیا۔ لڑائی جب ختم ہوئی تو جان میں جان آئی اور گھوڑے اپنی اصلی جگہ واپس آ گئے اس سے اندازہ کرلو کہ اس قدیم یادگار کی کیسی قدر و منزلت یہ لوگ کرتے ہیں سینٹ مارک کے جنوب مشرقی گوشہ میں جو حصہ ہے اس کو پیازیٹا یعنے چوک کہتے ہیں۔ جس کے مشرق میں ڈوجے کا محل ہے اور مغرب میں کتب خانہ کی عمارت ہے۔ بالمقابل سمندر کا حصہ ہے۔ پیازیٹا میں پتھر کے دو مینار ہیں ایک پر شیر ببر کی مورت ہے جس کے دو پر بھی ہیں۔ یہ پروں والا شیر ببر حکومت وینس کا قومی نشان تھا۔ دوسرے مینار پر ایک مذہبی پیشوا سینٹ تھیوڈر کی مورت ہے۔

ڈوجے کا محل قدیم فن تعمیر اور تہذیب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ عمارت نہ صرف محل کے طور پر استعمال ہوتی تھی بلکہ اس میں انتظام مملکت سے متعلق امور بھی انجام پایا کرتے تھے۔ ایک شاندار جھروکا سمندر کی جانب ہے۔ اس کے بالمقابل صحن میں مجرمین کھڑے کئے جاتے تھے۔ اور ان کی قسمت کا فیصلہ جھروکے سے سنایا جاتا تھا آرایشی کام محل کے اندر قابل دید ہے۔ اگرچہ گوتھک وضع کی عمارت ہے لیکن مشرقی مذاق کی جھلک جا بجا پائی جاتی ہے۔ سنگ مرمر کی کثرت پچی کاری کی نزاکت اور نقش و نگار وغیرہ دیکھکر آدمی حیران رہجاتا ہے۔ سنگ مرمر کے ستون بالکل مشرقی وضع کے بنے ہوئے ہیں۔

بڑی نہر۔ وینس

Chandrakanth Press Hyd.

وینس کے اطراف واکناف میں قدیم زمانہ کے گرجا متعدد ہیں۔ دو ایک عجائب خانے بھی دیکھنے کے لایق ہیں۔ کانچ کا سامان کثرت سے اور اچھا بنتا ہے۔ شہر کے اندر متعدد کارخانے ہیں۔ بازار ہیں ان کے ملازمین مسافروں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور بہت اصرار کے ساتھ کارخانے کی سیر کرانے لیجاتے ہیں۔ سیر کا تو نام ہوتا ہے لیکن مسافر وہاں جانے کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتا ہے۔ وینس کے قریب جنوب مشرق میں ایک جزیرہ لیڈو ہے۔ یہ بڑی رونق کی جگہ ہے۔ اٹلی میں غالباً اس سے بہتر اور مقبول کوئی مقام نہانے کا نہیں ہے۔

یہاں بھی وہی تماشہ دیکھنے میں آیا جو اب تک تمام یورپ میں دیکھتے آئے تھے عورت مرد ایک ہی جگہ نہانے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک انگریزی داں سیاح بھی یہاں موجود تھا۔ اس سے کچھ دیر تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ہندوستان کی سیر بھی کر چکا ہوں۔ تم کیوں اس طریقہ پر اظہار تعجب کرتے ہو۔ میں نے بنارس کے گھاٹ پر یہی تماشہ دیکھا ہے۔ تمہارے ہاں عورتیں مہین کپڑے کی ساڑھی پہنکر نہاتی ہیں۔ اندر سے جسم دکھائی دیتا رہتا ہے۔ مرد بھی اسی مقام پر نہاتے ہیں۔ یورپ والے اگر ایسا کریں تو کونسا گناہ ہوا۔ میں نے کہا تم نے جو کیفیت بنارس کے گھاٹ پر دیکھی ہے اس کو اس طریقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اہل ہنود مذہبی احکام کے تحت علی الصبح دریا پر نہاتے ہیں۔ تفریح کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ ان کا قدیم رواج ہے۔ یورپ میں یہ طریقہ پہلے معدوم تھا۔ اب یہ جدت محض تفریح کے خیال سے ہوئی ہے اس میں تصور عیش پرستی کا پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق پر اس کا اثر ہونا لازمی ہے۔ آخر کار برہنہ کلب قایم ہونے لگے ہیں۔ اس نے کہا برہنہ ہونا بھی عورت کی پاکدامنی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ تمہارے ملک میں بعض اقوام ایسی ہیں جن کی عورتیں اپنا سینہ کھلا رکھتی ہیں۔ سماٹرا کی طرف ایک قوم ایسی ہے کہ سب برہنہ رہتے ہیں۔

باوجود اس کے عورتیں پاکدامن ہوتی ہیں۔معلوم ہوا کہ عصمت وہ چیز ہے جس کا دار ومدار لباس پر نہیں ہے بلکہ شخصی جذبات اور خیالات پر ہے۔میں نے کہا یہ سب کچھ صحیح لیکن خیالات میں کایا پلٹ سوسائٹی کے لحاظ سے ہوتی رہتی ہے۔یورپ کا موجودہ طرز معاشرت عیش پرستی کی طرف زیادہ لے جارہا ہے۔

وطن کی واپسی

۲۴ ستمبر کو وینس سے ہمارا جہاز۔یس ہیں گینجے بمبئی کو روانہ ہوا۔راستہ میں برنڈزی پر کچھ گھنٹے ٹھہرنا ہوا ایک کرایہ کی گاڑی میں سیر کے لئے روانہ ہوئے۔چھوٹا مقام ہے۔کسی زمانہ میں بہت اہم بندرگاہ تھا۔ہندوستان کو جہاز یہیں سے جایا کرتے تھے۔لیکن چالیس سال سے کچھ اوپر ہوئے کہ پی۔اینڈ او کمپنی نے مارسیلز کو صدر مقام بنا لیا۔کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق یہاں نہیں ہے۔میوہ بہت ستا ہے۔بالخصوص انجیر یہاں کا بہت لذیذ ہوتا ہے انگور اور آڑو وغیرہ بھی سستے تھے۔

گینجے۔جہاز بہت مقبول ہوتا جاتا ہے۔یہ سولہ ہزار ٹن کا ہے۔چھ مہینے پہلے سے اس میں جگہ رکجاتی ہے۔اول دوم اور سوم تین درجہ اس میں ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ ایک درجہ اور ہے جس کو ڈک یا درجہ چہارم کہتے ہیں۔تیسرا درجہ متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے اچھا ہے۔ہر قسم کی کافی آسایش ہے۔کیبن میں دو دو برقی پنکھے اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے ضروری بندوبست ہے۔ایک خادمہ اطالوی قوم کی خدمت کے واسطے مقرر ہے۔اس کے علاوہ دو آدمی اور ہیں۔ہمارا کیبن چار آدمیوں کا تھا۔تیسرے درجہ کا کرایہ بمبئی تک چوبیس پونڈ ہوتا ہے۔درجہ دوم کا کرایہ دوگنے سے زاید ہے۔تیسرے درجہ کے واسطے کھانے کا کمرہ بھی اچھا ہے۔اطالوی جہازوں میں کھانا ہندوستانی مذاق سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ترکاری کھانے والوں کے لئے میز الگ ہوتی ہے۔ہم کو اس جہاز پر خاطر خواہ کھانا ملا۔

ہر مسافر کی جگہ مقرر تھی ۔ کھانے کے کمرے میں بھی متعدد برقی پنکھے لگے ہوئے ہیں ۔ ملازمین سب اطالوی قوم کے لوگ ہیں ۔ لیکن تعجب ہے کہ انگریزی جہازوں کی تقلید میں یہ لوگ بھی ہندوستانیوں کے کھانے کی میز یوروپین لوگوں سے الگ رکھتے ہیں ۔ ڈائننگ ہال میں ایک جانب اٹھنے بیٹھنے کے لئے میز کرسیاں لگی ہیں ۔ خط لکھنے کے لئے ۔ جہاز کے مونوگرام کا کاغذ مفت تقسیم ہوتا ہے ۔ ایک طرف پیانو رکھا ہوا ہے ۔ جس کسی کو ضرورت ہو اپنے شوق کو پورا کر سکتا ہے ۔ چنانچہ ایک شوقین مزاج خاتون اکثر اپنے کمال سے سامعین کو محظوظ کرتی رہتی تھیں ۔

ہندوستانی مسافروں کی اس جہاز پر اچھی تعداد تھی ۔ ان میں اکثر طالب علم تھے ۔ اور فارغ التحصیل ہو کر واپس جا رہے تھے ۔ کوئی ڈاکٹر تھا ۔ کوئی انجینیر اور کوئی بیرسٹر ۔ بقیہ مسافر یوروپین تھے ۔ دو جرمن عورتیں بھی تھیں ۔ جنھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ نکاح کر لیا ہے ۔ یہ دونوں ہندوستانیوں کے ساتھ اچھی طرح ملتی جلتی تھیں ۔ اس جہاز پر اطالوی سکہ چلتا ہے ۔ لیکن انگریزی سکہ بھی لے لیتے ہیں اطالوی لیرا ڈھائی آنہ کے قریب ہوتا ہے اور ایک لیرا کے سو پیسے ہوتے ہیں جن کو سینٹ کہتے ہیں ۔

گورے اور کالے کا فرق

یوروپین مسافر حسب عادت ہندوستانیوں سے الگ الگ رہتے تھے ۔ ڈک تو سب کے لئے ایک تھا لیکن ایک علیحدہ گوشہ میں اس برگزیدہ قوم نے اپنا اڈا جما لیا تھا ۔ ہم لوگوں سے بات چیت کرنا بھی شان کے خلاف سمجھتے تھے ۔ مانا کہ سیاسی پہلو سے ان کو ہم پر فوقیت حاصل ہے لیکن حکمران قوم کے واسطے پسندیدہ طریقہ تو یہ ہو گا کہ محکوم قوم کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کر کے اپنی ہر دلعزیزی کو بڑھائیں ۔ بالخصوص آج کل کے سیاسی حالات کے پیش نظر اس قسم کے میل جول کی ضرورت اور بھی زیادہ

ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ بعض مغرور اور تنگ خیال یورپین نشہ حکومت میں ایسے چور ہو رہے ہیں کہ مصلحت وقت کو بالکل نہیں دیکھتے۔ جو انگریز شریف الخیال ہیں وہ کالے گورے کا فرق نہیں کرتے۔ بہت اخلاق کے ساتھ ملتے جلتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کی تعداد کم ہے۔ تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر بھی ڈالو تو معلوم ہو جائے گا کہ تہذیب۔ تمدن اور علمی معلومات کا ظہور سب سے پہلے ایشیا میں ہوا اور یورپ ہمارے خزائن کا خوشہ چین ہے۔ فنون لطیفہ اور علم ہندسہ میں مشرق نے کیسا عروج حاصل کیا۔ البتہ یوروپین اقوام نے سائنس کو خوب ترقی دی ہے۔ اور یہی چیز ان کے لئے آج سرمایہ ناز ہے۔ مگر جاپان کی ترقی اس امر کا ثبوت دیتی ہے کہ ایشیائی اقوام بھی برابری کے ساتھ اس ترقی کی شاہراہ میں گامزن ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اکثر باتوں میں یورپین اقوام پر فوقیت رکھتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ جنگ روس و جاپان نے یہ بتلا دیا کہ میدان جنگ میں کالے لوگ گوروں سے بھاگنے والے نہیں ہیں۔ اور حال ہی میں جنگ عظیم کے سلسلہ میں ہندوستانی فوج نے بہادری کا کیسا کیسا ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد ہی یونانیوں نے جو شکست فاش ترکوں کی ٹوٹی پھوٹی فوج کے مقابلہ میں اٹھائی اس سے بہت کچھ نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔

جہاز کے سفر میں ہم کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ بین الاقوامی ترازو میں ہمارا وزن کتنا ہے۔ پہلے ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ کوئی زمانہ تھا کہ ہم بھی صاحب حکومت تھے۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ حاکم تھے محکوم نہ تھے۔ حکومت اور ثروت کے ساتھ علم کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ہم کو ترچھی نظروں سے دیکھے۔ ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کھو دیا مولانا نذیر احمد نے (خدا ان کو مغفرت نصیب کرے) قوم کا مرثیہ خوب لکھا ہے۔ اس موقع پر مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں۔

کیا خوب کہہ گیا کوئی شخص خوش خصال ۔ لفظ عرب میں سخن رجال کے وہم رجا ل

اب اے عزیزو تم سے ہمارا ہی یہ سوال ۔ کیوں آگیا ہے قوم کی حالت میں اختلال

اقوام روزگار میں ہیٹے ہو کس لیے

بے وقعتی کی خاک پہ لیٹے ہو کس لیے

کثرت سے تم میں صاحب مقدور کیوں نہیں ۔ لو ہا تمہارا مانتے جمہور کیوں نہیں

منہ پر تمہارے حسن نہ ہو نور کیوں نہیں ۔ دل قوم کے شگفتہ و مسرور کیوں نہیں

آخر تمہاری قوم پہ یہ کیا وبال ہے

جس شخص پر خیال کرو خستہ حال ہے

جب تک ہماری قوم میں تاج و نگیں رہا ۔ ہم میں کسی کو فکر معیشت نہیں رہا

کس کس کا نام لیں کہ جناں اور جنیں رہا ۔ ہر فرد عافیت سے غنا سے قریں رہا

ہم مالک خزائن روئے زمین تھے

اہل زمانہ قاطبتاً خوشہ چین تھے

پُسر و فراغ و دولت و حشمت ہزار حیف ۔ وہ شوکت اور لوازم شوکت ہزار حیف

عزت ہزار حیف حکومت ہزار حیف ۔ صد حیف قابلیت نعمت ہزار حیف

جہاز پر روز آنہ کھانے کے بعد سینما ہوتا ہے ـ ایک رات کو فینسی ڈریس کا ناچ ہوا لوگ عجیب عجیب لباس پہنکر آئے ـ بعض کو انعام بھی ملا ـ ہمارے درجہ میں ایک انگریز ہے ـ جو لندن سے بمبئی جارہا ہے ـ یہ اپنے کو متعدد اخباروں کا نامہ نگار کہتا ہے ـ ہندوستان کے ہنگاموں کی خبر سنکر بہت پریشان ہے ـ بار بار مجھ سے پوچھتا تھا کہ وہاں مجھ کو کوئی مارے گا تو نہیں ـ حفاظت جان کے لئے عجیب عجیب ترکیبیں سوچتا رہتا تھا ـ چنانچہ کہتا تھا کہ میں اپنے کو امریکن ظاہر کرونگا ـ یا جرمنی کہوں گا ـ اس کے سفر کا مقصد یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے عام حالات پر

مشاہدہ کرنے کے بعد اخباروں میں مضامین بھجوائے۔ حضرت کے معلومات کا یہ حال ہے کہ حیدرآباد کو پشاور کے قریب بتلاتے ہیں۔ اس کو شطرنج کا شوق تھا کبھی کبھی اس کے ساتھ دو ایک بازیاں کھیلنے کا اتفاق ہوا۔ جہاز پر حیدرآباد کے دو مسافروں سے ملاقات ہوئی۔ ایک طالب علم ہیں دوسرے صاحب سید محمود رضوی ہیں۔ جو سررشتہ جنگلات میں مددگار ہیں۔ صاحب موصوف بھی سیر و تفریح کی خاطر رخصت لیکر نکلے تھے۔ افسوس ہے کہ وطن سے چلتے وقت ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ورنہ پورے سفر میں سنگت رہتی۔ بڑے یار باش۔ خوش مزاج اور سیدھی سادھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ بیچارے برنڈسی میں بہت پریشان رہے سیر کرنے کے لئے ہماری پارٹی میں شریک تھے۔ گاڑی میں سوار ہونے سے قبل ہجوم کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ہم نے ہر چند تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا۔ جہاز کے روانہ ہونے سے کوئی دس منٹ قبل تھکے ماندے اور پریشان حال آپ واپس آئے بڑی لمبی چوڑی داستان سناتے تھے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہم سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے ہم کو بہت تلاش کیا۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو تنہا سیر کو نکلے۔ رات کا وقت اور زبان کی اجنبیت راستہ بھول کر کہیں سے کہیں نکل گئے۔ بالاخر ایک مقامی رہبر سے سابقہ پڑا یہ جہاز پر واپس آنا چاہتے تھے اور وہ ان کو مغالطہ دیکر ایسے مقامات پر لیجاتا تھا۔ جہاں اس کی ذاتی منفعت مقصود ہوتی۔ الغرض مردہ بدست زندہ بنے رہے۔ اس نے بہت کچھ رقم ان سے گھسیٹ لی۔ خدا اجنبی مسافر کو ان رہبروں کے ہتکنڈوں سے محفوظ رکھے۔ ایک روز جہاز کا کوئی پرزہ خراب ہوگیا اور وہ جوں کی طرح چلنے لگا۔ دو روز تک تشویش رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ بعد کو درست ہوگیا۔ غور کرنے کی جگہ ہے کہ اس جہاز کی تیاری میں کس قدر روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ کیسے ماہرین فن کی نگرانی رہی ہوگی۔ اور اس کے انجن میں

چھوٹے بڑے کئی ہزار پرزے ہوں گے۔ ان پرزوں کی صفائی اور جانچ پڑتال کے لئے کتنے آدمی ملازم ہیں۔ باوجود ان سب باتوں کے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ذرا کارخانہ قدرت کی کاریگری کا نمونہ دیکھو۔ کیسے زبردست اجرام فلکی بنائے ہیں۔ ان کی تنظیم پر خیال کرو۔ ابتدائے آفرینش سے چاند۔ سورج اور زمین وغیرہ اپنی اپنی جگہ مقررہ رفتار کے ساتھ برابر گردش میں ہیں۔ کبھی نہ سنا ہوگا کہ ایک سکنڈ کے لئے بھی ان کی رفتار میں فرق پڑا ہو۔ وہی چوبیس گھنٹوں کے دن رات صحت اور تیقن کا یہ حال ہے کہ برسوں پہلے سے حساب ڈالکر جنتری بنا لو۔ ان باتوں کو دیکھکر۔ انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ اور اس کو اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سائنس کے ماہرین فن ہزار بلند پروازی سے کام لیں۔ مگر بعض اسرار الٰہی ایسے ہیں کہ ان کی اصلیت کو معلوم کرنا عقل انسانی سے بالاتر ہے۔ اب تک کوئی شخص اس معمہ کو حل نہ کر سکا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈا۔ بلکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جن کو چشم بصیرت حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ یہیں سے مذہب کی سرحد شروع ہوتی ہے اور انسان کو سکوت اختیار کرنا پڑتا ہے۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

سخن از مطرب دمئی گو زراز دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمہ را

پورٹ سعید پر جہاز کئی گھنٹے ٹھیرا۔ جہاز سے بندرگاہ تک لکڑی کا پل لگا دیتے ہیں۔ کشتی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اکثر مسافر سیر کے واسطے یہاں اترے۔ قاہرہ میں جو سوٹ کیس امریکن اکسپریس کے حوالہ کر دیا تھا۔ وہ ہم کو یہاں مل گیا۔ بندرگاہ کے دروازہ پر چنگی والوں نے ہماری جیب میں ہاتھ ڈالکر اطمینان کر لیا کہ کوئی محصول طلب چیز تو نہیں ہے۔ یہ طریقہ نہایت درجہ مذموم ہے۔ شہر میں جانے کے بعد

وہی مصیبت شروع ہوگئی جس کا ذکر سوئیز اور قاہرہ کے حالات میں ہو چکا ہے بازاری لوگوں نے ستانا شروع کر دیا۔ کوئی کہتا تھا ہم تم کو سیر کرا دیتے ہیں کوئی گاڑی لئے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ کوئی ٹیکسی کو بلاتا تھا غرض یہ کہ دو قدم چلنا مشکل ہوگیا۔ اس شہر میں کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ آبادی اس کی پچاس ہزار کے قریب ہوگی۔ اپنے موقع کے لحاظ سے یہ ایک اہم بندرگاہ ہوگیا ہے۔ نہر سوئیز کے ایک سرے پر واقع ہے۔ جہازوں کی آمد و رفت یہاں کثرت سے ہے۔ شہر کے ایک حصہ میں گدھوں کی ٹریم چلتی ہے۔ ہم اس ٹریم کی ایک تصویر لیکر جب جانے لگے تو ٹریم والا اور کچھ مسافر ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ معاوضہ دیتے جاؤ۔ بڑی مشکل سے یہ قصہ طے ہوا۔

جہاز پر دلبستگی کا سامان

پورٹ سعید سے روانہ ہونے کے بعد ہمارا جہاز عدن پر ٹھیرا۔ یہ بھی ایک چھوٹا مقام ہے۔ نہ سبزہ ہے نہ درخت۔ عجیب وحشت برستی ہے ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس سے قبل ترکوں کا قبضہ تھا۔ جہاز ساحل سے فاصلہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب سوداگر متفرق اشیاء فروخت کرنے کو لاتے ہیں۔

دنیوی اور روحانی سفر کا فرق

عدن ہمارے سفر کی آخری منزل تھی۔ اس کے بعد جہاز بمبئی پر ٹھیرتا ہے۔ عدن سے روانہ ہوتے ہی سرزمین وطن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی بال بچے۔ عزیز اقارب اور دوست احباب یاد آنے لگے۔ دل میں ان خیالات کا پیدا ہونا تھا کہ اب تک جو کچھ دیکھتے چلے آئے وہ ایک خواب معلوم ہونے لگا سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں ہماری زندگی خود ایک خواب سے زیادہ نہیں ہے۔

یہاں جو کچھ سیر و سیاحت ہم کرتے ہیں اسے خواب در خواب سمجھو۔ اصلی سفر تو آخرت کا ہی جو بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔ نہ تو اسٹیشن پر جانا پڑے گا۔ نہ ٹکٹ خریدنے کی زحمت ہوگی۔ نہ کک کمپنی کی امداد کی ضرورت۔ جب وقت آئیگا۔ آنکھیں بند کرتے ہی ادھر سے ادھر پہنچ جائیں گے۔ بقول ایک شاعر کے۔

ای کہ از دشواری راہ فنا ترسی مترس

بس کہ آسان است ایں رہ می تواں خوابید و رفت

مگر یہ ایک شاعرانہ خیال ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنا یا کاربند ہونا داخل حماقت ہے اگر غور سے کام لو تو معلوم ہو جائیگا کہ اس سفر کے لئے بڑی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت ہے دنیوی سفر میں تو ہم نے یہ دیکھا کہ جس قدر روپیہ خرچ کرو اسی قدر آرام ملتا ہے۔ عزت بڑھتی ہے۔ اور ہر قسم کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ یہاں سارا کھیل روپیہ کا ہے کسی شاعر نے روپیہ کی چیستان خوب لکھی ہے۔

چیست آں مہ رخی و محبوبے

ہمہ عالم فدائے دیدارش

ہر کرا وصل او نصیب شدہ

گشت آمادہ مقصد و کارش

مگر مشکل تو یہ ہے کہ روحانی سفر میں روپیہ پیسہ بھی کام نہ آئے گا۔ صرف ایمان و عمل کا پاسپورٹ درکار ہے جو ٹکٹ لگا کر درخواست دینے سے نہیں ملتا مدت العمر ہم اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں اور براہ راست پر چلتے رہیں تو یہی ہمارا پاسپورٹ ہے۔ اسی کا حاصل کرنا انسان کے لئے سب سے مشکل کام ہے

قدسی ندانم چوں شود سودائے بازار جزا

نقد آمرزش بکف جنس عصیاں در بغل

ایمان کیا چیز ہے اور عمل صالح کس کو کہتے ہیں یہ ایک ایسا معمہ ہے کہ عقل انسانی اس پر اب تک متفق نہ ہو سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں سیکڑوں مذہب پیدا ہوئے اور ہر مذہب ایک نئے راستہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ انسان حیران ہے کہ کس راستہ کو اختیار کرے۔ ہم کو تو سب سے اچھی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس مذہب میں پیدا ہوئے اس کی پابندی کرتے رہیں۔ ورنہ چھان بین کرنے میں اکثر لوگوں کو دیکھا کہ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنے مذہب میں اندازہ کر کے صحیح راستہ معلوم کرنے کے لئے بھی اکثر اوقات کسی رہبر کامل کی ضرورت پڑتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان جملہ علوم وفنون کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک دوسرے کی امداد کا محتاج ہے۔ مثلاً ہم بیمار پڑتے ہیں تو طبیب حاذق سے رجوع ہوتے ہیں۔ اگر اپنا علاج آپ ہی کرنا شروع کر دیں تو اندیشہ ہے کہ الٹی سلٹی دوا کھا کر اپنے مرض کو بڑھا لیں۔ یہی کیفیت روحانی امراض کی ہے۔ بعض خدا کے بندے اپنی عمر کا بڑا حصہ احکام مذہب کو معلوم کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ پس اگر روحانی مریض ایسے مذہبی پیشوا سے رجوع ہو تو کیا ہرج ہے بلکہ میرے نزدیک تو ناگزیر ہے۔ البتہ ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ مرشد کے توسط بغیر انسان کو نجات حاصل نہیں ہوتی۔ بارگاہ خداوندی میں ہر بندہ براہ راست فریاد پیش کر سکتا ہے ؎

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندہ مارا ز ما کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

الغرض دنیوی اور روحانی سفر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس آخری سفر کے لئے ہر وقت زاد راہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ اب رہے بد قسمت تو ان کو کون ٹھکانے لگا سکتا ہے ؎

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

ایک روز کا لطیفہ لائق تذکرہ ہے۔ دو تین روز گرمی شدت کی ہوئی۔ رات کو کیبن میں سونا مشکل ہو گیا۔ میرا برتھ نیچے کا تھا۔ پنکھے کی ہوا وہاں تک کافی نہیں آتی تھی۔ اکثر مسافر رات کو اپنا بستر ڈک پر لے جاتے تھے۔ میں نے بھی یہی عمل کیا۔ لیکن ڈک پر آرام کی جگہ مجھ کو نہ ملی۔ کیبن سے ڈک پر جانے کے لئے ایک زینہ بنا ہوا ہے۔ یہ زینہ ڈک پر جہاں ختم ہوتا ہے وہاں اس کے اطراف ایک چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا ہے۔ اس میں دو جانب آمد و رفت کے لئے دروازے بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف بستر لگا کر میں سو گیا۔ رات کو کسی وقت ایک صاحب ڈریسنگ گون پہنکر میرے پہلو میں سو گئے۔ داڑھی کے ساتھ یہ مونچھوں کا بھی صفایا کرتے تھے۔ میری جو آنکھ کھلی تو خیال ہوا کہ کوئی عورت سو رہی ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے شکل پوری طرح دکھائی نہ دیتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد یہ اطمینان ہوا کہ کوئی صاحب سو رہے ہیں۔ مگر بعض لوگ جو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آمد و رفت کرتے رہتے تھے اس معمہ کو حل نہ کر سکے۔ ڈریسنگ گون کی وجہ سے یہی شبہ ہوتا تھا کہ عورت سو رہی ہے۔ چنانچہ دو آدمیوں کو نیچی آواز میں یہ گفتگو کرتے میں نے سنا۔ ایک صاحب کہتے تھے۔ "اُدھر سے مت جاؤ۔ مسٹر بیگ کسی لیڈی کے ساتھ سو رہے ہیں۔" دوسرے نے جواب میں کہا۔ "آخر یہ کون لیڈی ہے جو ان کے ساتھ سو رہی ہے۔" پہلے صاحب نے کہا "ہمارے درجہ کی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سکنڈ کلاس سے کوئی آ گئی ہے۔" اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔ یہ دونو مقابل کے دروازہ سے چلے گئے۔ غالباً انہی نے دوسروں کو بھی اطلاع دیدی۔ اس کے بعد آنے جانے والوں کا سلسلہ بند ہو گیا دو تین سیڑھیاں اتر کر یہ لوگ

جھانکنے کی کوشش کرتے ۔ ایک صاحب کو یہ کہتے سنا کہ مسٹر بیگ بھی چھپے رستم نکلے بظاہر یہ کیسے مہذب بنے رہتے ہیں ۔ پتہ چلانا چاہیئے ۔ کہ یہ لیڈی کون ہے ۔ دوسرے نے کہا "میاں جو کچھ بھی ہو ہم سے تو خوش قسمت ہیں" مجھے کبھی تو ہنسی آتی اور کبھی غصہ ۔ رات بھر اسی کیفیت میں نیند نہ آئی ۔ صبح کو ناشتہ کے وقت کھانے کے کمرہ میں جب مجمع ہوا تو بعض بے تکلف حضرات نے مذاقیہ طور پر یہی تذکرہ چھیڑ دیا اس وقت راز سربستہ ان پر ظاہر کیا گیا ۔ بڑی دیر تک ہنسی ہوتی رہی ۔ جو صاحب پہلو میں سو گئے تھے وہ بری طرح بنائے گئے ۔

پورٹ سعید سے اور عدن سے ایک خاصی تعداد چوتھے درجہ کے مسافروں کی سوار ہوئی ۔ چوتھا درجہ کسی قدر تکلیف دہ ہے ۔ اس میں کیبن نہیں ہوتا ۔ سب مسافر ایک فرش پر لوٹ مارتے ہیں ۔ ان کے کھانے کا انتظام بھی باقاعدہ نہیں ہے چوتھے درجہ میں بعض مسافر گانے بجانے کے شوقین تھے ۔ ان کے پاس ہارمونیم اور طبلہ بھی تھا ۔ ہمارے درجہ میں بھی بعض حضرات علم موسیقی کی دولت سے بہرہ مند تھے ۔ شام کے وقت محفل گرم ہوتی تھی ۔ بمبئی کی طرف کے ایک سیٹھ صاحب معہ اپنی بیوی کے ہمارے درجہ میں تھے ۔ بائی جی کو گانے میں خاصا دخل تھا ۔ راگ راگنیاں خوب گاتی تھیں ۔ اظہار تحسین کے لیئے جب سامعین تالیاں بجاتے تو بائی جی ناراض ہوتیں اور منع کرتیں کہ تالیاں نہ بجاؤ ۔ پورٹ سعید سے ایک پنجابی مولوی صاحب سوار ہوئے ۔ کبھی کبھی سمندر کی سیر کرنے کے لیئے ہمارے ڈک پر آجایا کرتے تھے ۔ ان کے ساتھ بڑا لطف رہا ۔ علوم مشرقیہ میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ یوں تو کوئی انسان کمزوریوں سے خالی نہیں ہے ۔ لیکن بعض لوگوں میں یہ اس قدر نمایاں ہوتی ہیں کہ دوسروں کی نگاہوں میں وہ تماشا بنجاتے ہیں ۔ یہی کیفیت ان مولوی صاحب کی تھی ۔ تنگ خیالی ۔ کج بحثی اور خود ستائی بات بات میں تھی ۔ کفر کا فتویٰ

دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بعض من چلے نوعمر طالب علم جو تہذیب یورپ کے نشہ میں سرشار تھے۔ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ بڑی معرکہ آرائیاں رہیں۔ نئی روشنی کے خوشہ چینوں کی بعض زیادتیوں سے ناراض ہو کر مولوی صاحب نیچے درجہ میں چلے جایا کرتے تھے۔ طالب علموں کو تو وقت کاٹنے کا شغلہ چاہیئے تھا۔ بھلا ایسا موقع کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ نیچے جا کر مولوی صاحب کو منا لاتے اور پھر وہی ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ کوئی شراب کی نسبت فتویٰ لیتا۔ کوئی داڑھی کے متعلق سوال کرتا۔ غرض سینکڑوں مسائل حل ہو گئے۔ طالب علموں کی جماعت نے تو ایک کمیٹی مستقل طور پر مقرر کر دی تھی جس کا کام یہ تھا کہ روزانہ ایک فہرست سوالات کی مرتب کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر سوالات خلاف تہذیب ہوتے تھے۔ لیکن طالب علموں کو سنجیدگی سے کیا تعلق۔ ایک روز محفل گرم تھی اور مولوی صاحب گرم جوشی کے ساتھ نازک مسائل پر روشنی ڈال رہے تھے۔ بسبیل تذکرہ میں نے برلن کے برہنہ کلب کی تفصیل بیان کی۔ مولوی صاحب کی حیرانی دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک شریر طالب علم نے پوچھا حضرت یہ تو بتلائیے کہ اگر خدانخواستہ جناب کی سواری بادبہاری اس کلب میں رونق افروز ہو تو جناب کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی مولانا نے برہم ہو کر اپنے زہد و تقویٰ کی تعریف میں پل باندھ دئے۔ ایک صاحب نے کسی شاعر کا یہ مشہور و معروف قطعہ پڑھا ؎

سبزہ ہو کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش ۔۔۔ اور دامن مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب ۔۔۔ دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو سیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو ۔۔۔ گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام ۔۔۔ قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

یہ قطعہ سنکر مولانا کے غصہ کا تھرما میٹر حسب عادت بلند و بالا ہو گیا۔ محفل سے بھاگنے کی فکر کرنے لگے۔ دو ایک حضرات نے پیچھے سے دامن پکڑا۔ جہاز کا فرش پھسلواں تو ہوا ہی کرتا ہے مولانا کا پاؤں رپٹ گیا۔ نیچے مولانا اور اوپر ان کا پیچھا کرنے والے۔ عجیب شورش برپا ہوئی۔ ضرر شدید تو نہیں لیکن مولانا کو ضرر خفیف کی شکایت ضرور تھی۔ ایک صاحب جو ڈاکٹر تھے معالج بنے۔ اس واقعہ کے بعد سے مولانا کے ساتھ کسی قدر ہمدردی بھی ہو گئی تھی۔ اصل تو یہ ہے کہ بمبئی قریب آ گیا تھا ورنہ مولوی صاحب کی جان کیا چھوٹنے والی تھی۔

ایک روز مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے سفر کی علت غائی کیا ہے۔ میں نے کہا محض سیر و سیاحت۔ فرمانے لگے آپ نے ناحق اپنا روپیہ برباد کیا۔ اور عاقبت بھی خراب کی میں نے پوچھا حضرت یہ کیسے۔ جواب میں مولانا نے مرزا بیدل کا یہ شعر نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو چمن در آ　　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن در آ

خوش صوتی بھی کیسی نعمت خداداد ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس دولت سے مالامال ہیں۔ شعر کی نزاکت اور مولانا کی خوش الحانی نے عجیب اثر پیدا کیا۔ میں نے کہا حضرت والا مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ مانا کہ روحانیت کا گلشن بے خار ہوتا ہے لیکن جب تک انسان دنیا کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہو جائے وہ چمن دل سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کہنے لگے ایسی دنیا کو دیکھنے سے کیا حاصل جو تم کو روحانیت سے کوسوں دور پھینک دے۔ میں نے عرض کیا یہ تو دیکھنے والے پر منحصر ہے۔ اگر چشم بینا رکھتا ہو تو دنیا کے یہی خرافات اس کو روحانیت کی طرف مائل کر دیں گے۔ دوزخ کا جب تک تجربہ نہ ہو بہشت کا لطف کیا خاک آئے گا۔ مولانا نے فرمایا بھلا اس زمانہ میں چشم بینا کہاں۔ اسی چیز کا تو کال ہے۔ آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ اور اگر دیکھتے بھی ہیں تو الٹا ؎

یہ جو چشم پُر آب ہیں۔ دونوں　　　ایک خانہ خراب ہیں۔ دونوں

میں نے کہا خیر آپ ہی دعا فرمائے کہ یورپ کا سفر مجھ کو خانہ خرابی سے محفوظ رکھے۔

خدا مولانا کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے فوراً دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھادیے۔

خدا کا شکر ہے کہ جہاز کا یہ سفر خیر و خوبی کے ساتھ گزر گیا۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ سمندر میں بالکل سکون رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک صاف شفاف سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ لیکن ذرا تخیل کو کام میں لاؤ تو اسی پُرسکون فرش کے نیچے ایک رنگ برنگی کائینات دکھائی دیگی۔ خدائے عزوجل کی شان کبریائی دیکھو کہ پانی کے اندر بھی ایک دنیا قایم ہے۔

تعریف اس خدا کو جس نے جہاں بنایا کیسی زمین بنائی کیا آسماں بنایا
آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

جن حضرات نے عجائب خانوں میں "اکویریم" کا معائینہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سطح آب کے نیچے کیسی کیسی خوبصورت۔ خوش رنگ۔ بدصورت و بدرنگ چھوٹی اور بڑی کائینات موجود ہے۔ کچھ جانور تو ایسے ہیں جو کنجال وغیرہ جیسی نباتات پر قناعت کرتے ہیں لیکن ان میں جو بڑے جانور ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔ زبردست کمزور کو اپنی غذا بناتا ہے۔ اسی کو زندگی کی کشمکش کہتے ہیں۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ مکڑی کس قدر صنعت اور حکمت کے ساتھ جالا تیار کرتی ہے۔ اور کمزور کیڑے اس جالے میں پھنس کر مکڑی کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اسی پھیر میں پڑا رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آدم خواری کی صفت اس میں تقریباً معدوم ہے لیکن اپنی دوسری سینکڑوں اغراض کو پورا کرنے کے لئے ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں جنگ عظیم ایک نمونہ ہے انسان کی خودغرضی کا۔ جانور بیچارے تو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں مگر ہم اس حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اکثر اوقات محض تفریح کی خاطر ہم سیر و شکار میں مصروف رہتے ہیں بے زبان جانوروں کو اس کے چمڑے کی خاطر اور کسی کو اس کے دانت ویروں کی خاطر بے دھڑک ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ خیال تک نہیں گذرتا کہ جانور کو بھی اپنی جان عزیز ہوتی ہے۔ بلاوجہ اسے کیوں ضایع کیا جاے۔

میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جاندار دو جان شیرین خوش است

ہندوستان کے ان حضرات کی خدمت میں جو اپنے بچوں کو بغرض تعلیم یورپ بھجوانا چاہتے ہیں - میری گزارش یہ ہے کہ درجہ اول اور درجہ دوم کے بیجا مصارف میں نہ پڑیں - درجہ سوم میں گھر سے زیادہ آسایش ہوتی ہے - بالخصوص طالب علموں کے لئے یہ درجہ بہت موزوں ہے - حال ہی میں پی اینڈ او کمپنی نے بھی اپنے دو ایک جہازوں میں یہ درجہ اضافہ کردیا ہے - ۶ر اکٹوبر ۱۹۳۰ء کو سر مغرب ہمارا جہاز بمبئی پہنچا - جونہی جہاز سے اترے ابر کرم نے گویا خیر خوبی کے ساتھ وطن واپس ہونے کی مبارک باد دی - ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ باید و شاید - دو گھنٹے کے قریب محصول خانہ میں اٹر ارہنا پڑا - مسافروں کے ہجوم کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا تھا - سامان کا معائنہ کسی قدر سختی کے ساتھ ہوتا ہے اور کچھ مراتب دفتری ایسے طے کرنے پڑتے ہیں - جو اس سارے سفر میں نہیں دیکھے گئے - بالآخر ہمارے اسباب کے معائنہ کی بھی باری آئی - جہاز سے اترتے وقت ہر مسافر کو ایک فارم دیدیا گیا تھا - جس میں سامان وغیرہ کی تفصیل تھی - اس میں میرے نام کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی لکھا ہوا تھا - محصول خانہ کے ملازم نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں - میں نے کہا ہاں - اس پر اس نے کہا افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر تک بلا وجہ یہاں ٹھیرنا پڑا - آپ سے تو زبانی دریافت کرلینا کافی ہے - آپ اپنا سامان نہ کھولئے اور تشریف لیجائے - بمبئی میں رفیق بیگ کو ایک کام کے لئے ٹھیرنا تھا - اس سے فارغ ہوکر ۹ر اکٹوبر کو شام کے وقت بذریعہ میل ٹرین ہم حیدرآباد کے اسی اسٹیشن پر پہنچ گئے - جہاں سے روانہ ہوئے تھے جملہ احباب اور کرم فرما اسٹیشن پر موجود تھے - سب سے ملکر اور سب کو تندرست دیکھکر بڑی مسرت ہوئی -

خدا اس ریاست ابد مدت کو جملہ آفات و حوادثات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ

رکھے اور ہمارے موجودہ فرماں روا۔ وشہزادگان والا تبار کے اقبال وعمر میں روز افزوں ترقی عنایت فرمائے۔ چین چین۔ امن۔ وآسایش کے ساتھ ہم اس ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی نظیر دیگر ممالک میں نہیں ملتی۔ **خسرو دکن** کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کے آثار چاروں طرف نمایاں ہیں۔ شہر حیدرآباد کو دیکھو کیسی ترقی کر رہا ہے۔ عنقریب اس کا شمار دنیا کے بہترین شہروں میں ہونے لگیگا۔ انشاءاللہ۔

للّٰہ الحمد کہ بچھڑوں سے ملے پھر آکر
پھر ہم آغوش وطن ہیں کہ ہوا ختم سفر
کھینچ ہی لائی کشش خاک وطن کی آخر
حق تو یہ ہے کہ بشر کے لئے جنت ہی تو گھر

تمت

دوسروں کا سفر اور میرا قلم

یں کیا سب ہی اردو بولنے والے کہتے ہیں کہ "چلا ہے تو چلا چل" مگر اس چلا چلی کا مزا یا تو یورپ جا کر آتا ہے۔ یا شاید مرنے کے بعد آئے۔ خیر مرنے کے بعد تو بن کوڑی پیسے کا تماشہ ہے۔ ہاں .. یورپ کے سفر میں روپیہ اٹھاتے ہیں۔ بال بچوں کے لئے روتے ہیں بیمار پڑ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ مگر چلنے کا جو سلسلہ ہے۔ وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا اور جب تک وہاں لٹ لٹا کر کھکہ نہیں ہو جاتے اس وقت تک واپس آنے کا نام نہیں لیتے

اب ہم ہی کو دیکھ لو۔ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ لیکن یورپ دیکھنے کا شوق ایسا چرایا کہ خود تو خود دو اور بھائیوں کو اس مصیبت میں اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ سفر میں تین باتوں کی دقّت ہوتی ہے۔ ایک روپیہ پیسہ کی ضرورت۔ دوسرے عزیز اور رشتہ داروں کی یاد الفت۔ اور تیسرے تنہائی کی مصیبت۔ ان بیچاروں کے ساتھ ہونے نے یہ تینوں دقتیں رفع کر دیں۔ ایک بھائی سے یہ توقع تھی کہ تنگی ترشی میں روپئے کا منھ نہ کریں گے۔ دوسرے کی شفقت عزیزوں کی بہبودی کا نمونہ تھی۔ اب رہی تنہائی تو ایک چھوڑ دو دو بھائیوں کی موجودگی "میرے دونوں میٹھے" کی مصداق تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ادھر ادھر سے کچھ تھوڑے بہت سکہ رائج الوقت جمع کئے لکھ لکھا کر ریل اور جہاز کا انتظام کیا۔ پھر پھرا کر سستے سے سستے سوٹ اور اچھے سے اچھے سوٹ کیس خریدے۔ دبا دبا کر دونوں میں کپڑے ٹھو لسنے۔ دیسی لباس چیڑے کے صندوقوں میں بند کر کے دیمک کے حوالہ کئے۔ اور یورپ چلنے کو لیس ہو گئے۔

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر ایک سوال کا جواب میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور نہ واپسی کے بعد تک سمجھ میں آیا۔ جس کسی سے ملتا وہ یہی پوچھتا تھا کہ "حضرت یہ بیٹھے بٹھائے کچھ

سودا ہوا ہے جو یوں خواہ مخواہ آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ آپ کی بیوی ہیں بچے ہیں۔ کچھ بچ رہا تو انہی کے کام آئے گا۔ بیٹے کو تعلیم دلانی ہے۔ بیٹی آج چھوٹی کل جوان ہے۔ اس کا کاج سامنے آرہا ہے۔ آخر ہم بھی تو سنیں کہ آپ یورپ جا کیوں رہے ہیں۔" میرے ساتھ جانے والے ایک بھائی ذرا روپے پیسے والے آدمی ہیں۔ ان کا جواب تو بہت معقول تھا کہ "میرا معدہ خراب ہے۔ جرمنی علاج کرانے جا رہا ہوں"۔ دوسرے بھائی تاجر تھے ان کے جانے کی بھی خواہ غلط ہی کیوں نہ سہی وجہ موجود تھی۔ مگر میرا نہ کوئی جواب جب تھا اور نہ اب ہے۔ سوائے اس کے کہ بھئی تم کون ہو۔ کہ ہم خواہ مخواہ۔[1]

بہر حال ہوتے ہوتے ہماری روانگی کا دن آ ہی گیا۔ یار دوستوں کے ہجوم نے بیوی بچوں سے اچھی طرح ملنے بھی نہیں دیا۔ اور ہم "جانا ہمارا یاد رکھنا" کہنے کے لئے گھر میں گئے۔ بیوی سے ہنسی خوشی اور بچوں سے آنسو بہا کر رخصت ہوئے۔ گھر والوں۔ باہر والوں عزیزوں۔ رشتہ داروں۔ نوکروں۔ جان پہچان والوں غرض ہما شما سب نے امام ضامن باندھے۔ پھولوں کے ہار پہنائے۔ اسباب موٹروں میں لادا۔ اسباب پر خود بیٹھے۔ موٹریں چلیں اور بیوی نے آہ بھر کر کہا کہ "بڑے لمبے سفر کو سیاں چلو رے"۔

اسٹیشن پر پہلے سے یار لوگوں کا مجمع تھا۔ سب سے ملے۔ مگر دل ٹھکانے نہیں تھا کہ کہیں بیوی صاحبہ کا حکم واپسی یہ مہینوں کی پکی پکائی ہنڈیا کھٹ سے توڑ تو نہیں دیتا ظلم دیکھو کہ میل کو آج ہی دیر کرنی تھی۔ ایک دو منٹ لیٹ ہوتی تو کچھ ہرج نہ تھا اکٹھی دس منٹ لیٹ ہو گئی۔ پہلے تو گھبرا کر پلیٹ فارم پر ادھر ادھر ٹہلا۔ پھر باہر نکل کر لمبے لمبے سانس کھینچے۔ ٹوپی اتار کر سر کو ہوا دی۔ جب کہیں جا کر ذرا تسکین ہوئی۔

۱۔ یہ اردو کا ایک بڑا مشہور فقرہ ہے۔ اور در اصل ایک قصہ کا خلاصہ ہے۔ اردو کی لغت لکھی جا رہی ہے۔ دس برس میں تیار ہو جائے گی۔ اس میں یہ فقرہ ضرور ہوگا۔ اگر اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تو اس لغت میں دیکھ کر سمجھ لیجئے گا۔

اس خیال سے ابھی نجات نہ ہوئی تھی کہ دوسرا خیال اس کی جگہ آجما۔ کہ بھئی اگر کہیں جہاز میں مرگئے تو ٹانگ پکڑ کر لوگ سمندر میں پھینک دیں گے۔ اور وہاں مچھلیاں ذرا سی دیر میں تکا بوٹی کر ڈالیں گی۔ یہ خیال آنا تھا کہ نئی نئی شکل کی مچھلیاں آنکھوں کے سامنے ہوا میں تیرنے لگیں۔ ان سب کے پیچھے پیچھے ایک بہت بڑی مچھلی ایسے پھنکارے مارتی آرہی تھی کہ خدا کی پناہ قریب آکر اس نے اس زور سے سیٹی دی کہ میں اچھل پڑا معلوم ہوا کہ ریل آگئی۔ اب کیا تھا۔ اسٹیشن پر گڑبڑ شروع ہوگئی۔ قلیوں کی چیخوں۔ مسافروں کے دھکوں اور سودے والوں کے شور وغل نے سب دماغ سے نکال دیا۔ دوسرے یہ بھی اطمینان ہوگیا۔ کہ اب گھر سے طلبی ہوئی بھی تو حکمنامہ گرفتاری پہنچتے پہنچتے ریل چھوٹ جائے گی۔ اس لئے دلجمعی سے اپنا اور بھائیوں کا سامان درجہ میں جمایا۔ وہیں کھڑے کھڑے سب سے ہاتھ ملائے۔ کچھ روتیلی[1] آواز میں رخصتی جملے بھی کہے۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے ایک بڑی لمبی آہ کھینچی۔ پہیوں نے گردش کی اور تین عدد اشخاص دیسی سے ولایتی بننا شروع ہوگئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دماغ پر زور ڈالکر یہ شعر موزوں کیا ؎

کوئی جاکر بتا ان مغربی کو یہ خبر کردے ۔۔۔ چلے ہیں تین مجنوں گھر سے اب لہا میاں ہوکر

اس شعر میں "اب" کا لفظ بھرتی کا ہے۔ مگر ہم خود اس دنیا میں آخور کی بھرتی ہیں اس لئے یقیناً جائز ہے۔ خیر میں نے بہت لہک کر یہ شعر پڑھا۔ ایک بھائی صاحب نے بسور کر کہا ؎

چلا ہے اے دل راحت طلب کیا شادماں ہوکر ۔۔۔ زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہوکر

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مطلع کس کا ہے۔ کیونکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ کسی شخص نے ایسے وقت کہا ہے۔ جب وہ یورپ جانے کے لئے ریل میں سوار ہونے والا

---

[1] یہ لفظ کسی لغت میں نہیں ملسکتا۔ ہاں دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سنا اور سمجھا جاتا ہے۔

ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ایسے شاعروں کی تو کمی نہیں ہے۔ جو گھر میں بیٹھے بیٹھے ساری دُنیا کی سیر کرتے ہیں۔ لیکن دروازہ سے باہر قدم رکھنا ذوق شاعری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور مشکل ہی سے ایسے شاعر ملیں گے جنہوں نے دلی سے نکلکر لکھنو یا لکھنو سے نکلکر کبھی دہلی دیکھی ہو۔ اس لئے میری یہ رائے ہوئی کہ یقیناً یہ مطلع اقبال کا ہے کیونکہ ان کو کسی قدر اردو شاعری کا مذاق بھی ہے اور انھوں نے یورپ بھی دیکھا ہے لیکن میری رائے سے دوسرے بھائی نے اختلاف کیا۔ اور ان کی یہ رائے ہوئی کہ یہ مطلع سوائے غالب کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو اس کی اضافتیں اس مطلع کو ان کا نہ ہونے کی صورت میں بھی انہی کا کر دیتی ہیں۔ دوسرے اس میں ان واقعات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جو حضرت غالب کو لکھنو اور کلکتہ میں پیش آئے تھے۔ اور گمان غالب یہی ہے کہ اس میں "کو" سے مراد ویسرائے کا دفتر۔ اور "جاناں" سے مراد سر جان ملکم ہے۔ کیونکہ انہی کے ضربِ قلم نے بیچارے غالب کی امیدوں کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن یہاں یہ بحث پیش آئی کہ اگر یہ صورت ہے تو پھر "کو" اور "جاناں" میں اضافت کیسی ہے۔ بہت کچھ رد و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ چونکہ سر جان ملکم کا یہ خط ویسرائے کے دفتر میں آیا تھا۔ اس لئے اضافت سے ان دونوں واقعات کو ملایا جا سکتا ہے بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ مطلع غالب کا ہے۔ لیکن بے موقع ضرور ہے کیونکہ یہ ولایت جاتے وقت کہنا چاہیئے تھا نہ کہ صرف کلکتہ جاتے تک۔ غرض اسی بحث مباحث میں کوئی رات کے دس بج گئے اور اب سونے کی سوجھی۔ بستر ساتھ نہ تھے کیونکہ ولایت جانے والوں کو بستر لے جانا گویا اس سفر کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے شب خوابی کے کپڑے پہن کر کھری سیٹوں پر لوٹ ماری۔ تھوڑی دیر تک تو اس نئے لباس کی گھنڈیاں سینہ میں بہت کچھ چبھیں۔ لیکن کہاں تک۔ مثل ہے سولی پر بھی نیند آتی ہے۔ آخر آنکھ بند ہوتے ہوتے بند ہو ہی گئی۔ ہماری گاڑی ہندوستان میں تھی مگر آنکھ لگتے ہی

ہم ولایت پہنچ گئے۔

صبح اٹھے تو ایک اور مصیبت پیش آئی۔ یعنی نہ ساتھ لوٹا تھا اور نہ صراحی۔ سوچتے سوچتے آخر ایک ترکیب نکال ہی لی۔ برف والے سے سوڈے کی بوتل منگوائی۔ سوڈا پینے کے کام آیا اور خالی بوتل کسی اور کام آئی۔ غرض شام کو مدراس پہنچ ہی گئے۔ یہاں سے گاڑی بدلنی پڑی۔ ہماری گاڑی دیر سے پہنچی تھی۔ دوسری ریل کا اسٹیشن کوئی دو میل پر تھا۔ دھاپوش کرتے وہاں گئے۔ الٹا سیدھا سامان درجہ میں بھرا۔ اور روانہ ہو گئے۔ یہاں کی گاڑیاں کچھ دوسری وضع کی ہیں۔ اس سرے سے اس سرے تک برآمدہ ہے۔ اور اس میں سے سونے کے لئے کمرے کٹے ہوئے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں ہم سب ایسے گھبرا گئے تھے کہ یہ بھی دریافت نہیں کیا کہ غسل خانہ گاڑی میں کہاں ہے۔ بہرحال سلیپنگ سوٹ پہن بچھونوں پر لوٹ ماری۔ رات کو ایک بھائی صاحب شانہ کے دباؤ سے بے چین ہو کر اٹھے۔ برآمدہ میں آئے۔ گاڑی کی بناوٹ پر غور کیا۔ آہستہ سے ایک دروازہ کھولا۔ اندر گھسے۔ اور ساتھ ہی ایک چیخ کی آواز آئی اس درجہ میں ایک میم صاحب سو رہی تھیں۔ ہمارے بھائی صاحب نے اس کو غسل خانہ سمجھا۔ میم صاحب ان کو چور سمجھیں۔ انھوں نے چیخ ماری۔ انھوں نے معافی مانگی خیریہ سین ختم ہوا۔ یہ بیچارے پھر اپنے درجہ میں آئے۔ ہم دونوں کو جگایا۔ ہم خود اس معمہ کو حل کرنے کے قابل نہ تھے۔ آخر قرار یہ پایا کہ ہو نہ ہو کونہ کا کمرہ غسل خانہ ہے۔ یہ غریب پھر اٹھے۔ دبے پاؤں اس کمرہ تک گئے۔ ہم دونوں بھی برآمدہ میں نکل آئے تاکہ ایک کا تجربہ دوسرے کے کارآمد ہو سکے۔ انھوں نے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا گھپ تھا۔ یہ سمجھے کہ ضرور غسل خانہ یہی ہے۔ بجلی کا بٹن ٹٹولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بدقسمتی سے ایک میم صاحب کے کسی خاص حصہ جسم پر جا پڑا۔ ایک دم غل مچا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی دیکھتے کیا ہیں کہ اس کمرے میں صاحب۔ میم صاحب کا ایک جوڑا براج رہا ہے صاحب نے

بڑھ کر ہمارے بھائی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ وہ انگریزی کے الفاظ استعمال کئے کہ مزا آگیا۔ یہ کہتے تھے میں غسل خانہ کے دھوکے میں یہاں آگیا۔ وہ کہتا تھا کہ تم یا تو چور ہو یا کسی بدنیتی سے اس کمرے میں آئے ہو۔ خیر جب وہ گلفشانی کرتے کرتے اور یہ معافی مانگتے مانگتے تھک گئے۔ اس وقت یہ تماشہ ختم ہوا۔ یہ پھر اپنے کمرے میں آئے اور پھر مشورے ہوئے کہ آخر اس مشکل کو کیونکر آسان کیا جائے۔ میری یہ رائے تھی کہ کھڑکی سے غسل خانہ کا کام لیا جائے۔ لیکن اس میں یہ ڈر تھا کہ گاڑی کی رفتار سے باہر جانے والی چیز کہیں اندر آکر اپنے ابر کرم سے ہم تینوں کو سیراب نہ کر دے غرض کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن خدا کی کارسازی کے صدقے جائیے کہ جس مصیبت میں ہمارے بھائی صاحب مبتلا تھے وہی ضرورت گاڑی میں ایک اور صاحب کو لاحق ہوئی۔ برآمدہ میں کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ ہم تینوں کو ایک دم خیال آیا کہ ان کی پیروی ضرور غسل خانہ تک پہنچا دیگی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہمارے دروازہ سے ملا ہوا جو کمرہ تھا۔ وہی غسل خانہ نکلا۔ اب کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرے نے اس تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور بے ضرورت بھی غسل خانہ کا چکر لگایا۔ تاکہ یہ تو معلوم ہو جائے کہ جو چیز اتنی محنت سے ملی ہے۔ وہ ہے کیسی۔ اندر جا کر دیکھا تو معمولی غسل خانہ تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس کو ہمارے درجہ کے پاس بنانے کی کیا وجہ تھی اور اگر یہاں بنایا تھا تو اب تک ہم کو اس کے معلوم نہ ہونے کا کیا باعث تھا۔ بہرحال ایک رات اور ایک دن اس ریل میں گزر کر تیسرے روز ہندوستان کے نکڑ یعنی دھنسکوڑی پہنچ گئے (باقی[لہ] پھر کبھی)

مرزا فرحت اللہ بیگ

لہ اس فقرہ سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس سفرنامہ کو پورا کرنے کا وعدہ کر رہا ہوں جتنے نوٹ مجھے ملے تھے۔ وہ میں نے اپنے الفاظ میں لکھدئے۔ اس کے بعد اگر اور نوٹ دئے گئے تو وہ بھی لکھدونگا۔ ورنہ اس مضمون کے تکملہ کا انتظار نہ فرمائیے۔ اور میں اڈیٹر صاحب سے بھی کہے دیتا ہوں کہ اگر انھوں نے اسکے متعلق تقاضے کئے تو میں انکے ایک خط کا بھی جواب نہ دونگا کیونکہ جب واقعات ہی معلوم نہوں تو آخر لکھا کیا جائے۔ (فرحت)

تقریظ

حسب فرمایش ملا رمزی عراقی - ثم الہندی - ثم الحیدرآبادی ثم اورنگلی - یہ تقریظ پیش ناظرین کرتا ہوں
ملا رمزی صاحب - صاحب تصنیف کے قدیم دوست اور ذوات کے علیگڈھی بھیا ہیں - کتاب کا مسودہ ملا صاحب
نے ملاحظہ فرمالیا ہے - ان کی رائے انہیں کے الفاظ میں لکھی جاتی ہے

ہاں بھائی - یہ مرزا جس کو ہم نرا بدھو ہی سمجھتے تھے ولایت جاکر بڑھا نکلا - ارے میاں - کیا کیا لکھ مارا ہے
عقل دنگ ہوتی ہے - ہوش ٹھکانے نہیں رہتے - ملا صاحب کے نزدیک ولایت جانے والے کا دین
وایمان درست نہیں رہتا - مگر مرزا نے ولایت کی سیر کی - مزے اڑائے اور پھر پکا مسلمان رہا - کہتا ہے کہ
صبح ناشتہ میں ٹوسٹ یا انڈے کے ساتھ جو گوشت کا ٹکڑا آئے سمجھ لو کہ لحم الخنزیر ہے اس سے بچو - راستہ میں
ہوش ربا حسین مادائیں اگر ملیں اور سگریٹ مانگیں تو سمجھ لو کہ یہ مادائیں اپنے عارضی زر کی تلاش میں ہیں
طہارت کے لئے اگر لوٹا نہ ملے تو گلاس استعمال کرو اور سنئے - لندن میں ٹیلیفون اس طرح
دو بیت الخلا کو یوں تلاش کرو - پلیٹ فارم کا ٹکٹ ایسے لو - چک بک - اور پاسپورٹ
ہمیشہ جیب میں رکھو - ارے میاں - کتاب کیا ہے - ریلوے گائیڈ بھی ہے - کریما
مامقیماں بھی ہے - ظالم نے اس کو کچھ ایسے پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ
کتاب اٹھالو تو پھر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا -

امیر خاندان کے نوجوانوں کے لئے بھی چارہ موجود ہے - مگر خدا ان کو ایسی چارہ جوئی
سے محفوظ رکھے مولوی قسم کے لوگوں کے لئے یہ کتاب جائز سینما کا کام دیگی یعنے سب کچھ
آنکھوں سے دیکھ لیا - اور پھر تصویریں ندارد - ناول تو ناول فسانہ عجائب کا مزہ دیگی
اشعار برمحل اور برجستہ استعمال کئے گئے ہیں - ایک مضمون کے بعد برمحل شعر ویسے ہی
مزہ دیتا ہے - جیسے مزیدار کھانے کے بعد ملغوبہ (مرغوبہ) یا بے نشان آم -

حال قال کی مجلسوں میں ملا صاحب اکثر وجد میں آجاتے ہیں - یہی وجدان پر

اُس وقت طاری ہوا کہ جب کہ ننگے کلب کا حال ملاحظہ فرمایا۔ آدمی تو اس کو پڑھ کر خاصا استغفراللہ بن جاتا ہے واہ کیا ترقی ہے۔ گاندھی جی محض ایک دُھوتی پر اکتفا کرتے ہیں۔ غالباً عریانی اور ترقی دونوں کا تعلق قریبی ہے۔ اگر گاندھی جی کی طرح اکثر اور بیشتر ہندی ننگے ہو جائیں تو غالباً پُورنا سُوراج ملجائے اور بار بار پورنا سُوراج کے معنی پہنانے کی ضرورت واقع نہ ہو۔

مرزا صاحب نے تو کئی سو صفحے کی کتاب لکھ ماری تب جا کر مصنف بنے۔ ملّا صاحب نے تو یہ چند سطریں لکھیں اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گئے۔ زیادہ آپ کو معلوم کرنا ہو تو کتاب پڑھیے

ملّا رمزی

گواہ شد | گواہ شد

حکیم خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح مصنف اشعار کثیرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ مصنف مضامین کثیرہ — بقلم عبدالرشید صدیقی مہتمم تعلیمات

نشان ابہام

عبداللطیف وکیل مصنف مقدمات صغیرہ

قطعۂ تاریخ از مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب عصمتؔ

کیا خوب لکھیں آپ نے پردیس کی باتیں
شیریں وہ زباں اور وہ لطافت ہی سخن کی
اس نثر میں اک کیفیت نظم جہاں ہے
گھر بیٹھے ہوئے پیرس و لندن کی کرو سیر
اٹھ جائیں گے نظروں سے ہر اک راز کے پردے
کھل جائیگا ہر اک ملک کا تہذیب و تمدن
سیاح کا ہر نقش قدم رہبر کامل
عصمتؔ ہوا جب طبع سفرنامۂ یورپ
ہنس ہنس کے ہر اک بات پہ ہو جاؤ گے بیدم
۴۴

دلچسپ عبارت تو ، ظرافت ہے بیاں میں
جی چاہتا ہے گھول کے ہر صفحہ کو پی لیں
اس نثر میں پاؤ گے ہر اک بحر کی موجیں
لیٹے ہوئے پڑھتے رہو، پردیس کی باتیں
دیکھو گے وہ جلوہ کہ جھپک جائیں گی آنکھیں
عُریاں نظر آئینگی ہر ایک قوم کی رسمیں
رہرو کے لئے خضر طریقت ہے جہاں میں
تاریخ کہی ہم نے بھی ایک عیسوی سن میں
اکبار پڑھو غور سے "پردیس کی باتیں"
(۱۲۰۶ + ۷۶۹)
= ۱۹۳۱ء

قطعۂ تاریخ طبع

از

خیر مجسم مولانا ابوالخیر محمد خیر اللہ خیر بی۔ ڈی۔ ایچ وکیل درجہ اول ورنگل

گھر کے باہر کا جو نقشہ ہے عجیب اور غریب | واں کے دن کیسے ہیں اور کیسی ہیں راتیں سنئے
زحمتیں ساری مسافر کو مبارک" اے خیر | آپ بیٹھے ہوئے پردیس کی باتیں سنئے

۱۳۶۰ ف

قطعۂ تاریخ

از محب دلنواز حکیم خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح

ممکن ہے کہ ہو آن میں گنجینۂ زر ختم | ہوتے نہیں پر تجربہ کے لعل و گہر ختم
گو قرن گزر جائیں مسافر کے سفر کو | لیکن کہیں ہوتے ہیں افادات سفر ختم
پردیس کی باتیں ہیں کہ ہیں وہ دُرِ شہوار | پُر دامن مقصد کریں جو ہوں نہ مگر ختم
تاریخ نکلنا ہے ذبیح آپ سے مشکل | ہو جائیں گے کیا آپ پہ دنیا کے ہنر ختم

دل کہہ اُٹھا ہاں میم کے اعداد نکلکر
پردیس کی باتوں کی ہے تاریخ سفر ختم

۱۳۶۰ ف

تازیانۂ عبرت

ماخوذ از حالات مندرجہ "پردیس کی باتیں"

نتیجۂ فکر حکیم حاذق شاعر خوش خیال مولوی خواجہ **محمد اسمٰعیل** صاحب ذبیحؔ لکھنوی (نبیرۂ علامہ عبد العزیز محدث لکھنوی) مدرس مدرسہ فوقانیہ مٹھوار ضلع ورنگل

دیکھ او غافل ذرا دنیا کو آنکھیں کھول کر | اک نیا عالم ہر اک ذرہ میں آتا ہے نظر
ذرہ ذرہ میں نہاں اک کائنات راز ہے | گر حقیقت آشنا دل آنکھ ہو عبرت نگر
سیر کر روئے زمیں کی پردۂ غفلت اٹھا | امتیاز حق و باطل سے بھی ہو کچھ بہرہ ور
جستجو انجام ہستی کی اگر منظور ہے | پہلے ہستی کی حقیقت کو سمجھ او بے خبر
کام لے راہ طلب میں ہمتِ مردانہ سے | خود بخود آسان ہو جائیگا ہر دشوار تر
نت نئی نیرنگیاں اس عالم اسباب کی | خود ہیں شاہد ہو گی دنیا ایک دن زیر و زبر
تو بھی مٹ جائیگا اپنا فرض پورا کر کے مٹ | تیری مٹنے میں بھی ہے تازہ حیات اک مستتر
صاف ہے فرمان ربِ ذو المنن سیروا فی الارض | امتثال امر حق میں کر ذرا سیر و سفر
تجھ پہ رازِ عالم فانی عیاں ہو جائیگا | شرط یہ ہے نیک و بد کو جانچتی جائے نظر
بنکے زندہ قوم دنیا میں جو رہنا ہے تجھے | دیکھ رفتار زمانہ کا ہے رخ آخر کدھر
زندگی خود موت ہے اور موت تازہ زندگی | شوق ہے دلمیں حیاتِ جاودانی کا اگر
عالم فانی کا ہر ذرہ سبق آموز ہے | آکے میدانِ عمل میں تو بھی اپنا کام کر

تو وہ کر سکتا ہے عقل نکتہ رس سے آج بھی
دین و دنیا بھی ہوں حاصل جس سے تخت و تاج بھی

طاقت پرواز رکھکر پست کیوں ہے اسقدر | رفعتیں مغرب کی ہیں تیرے لئے خود راہبر
علم و حکمت کے خزانے لٹ رہے ہیں بیدریغ | ہر طرف ہے گرم واں بازار ایجاد و ہنر

شش جہت میں یوں رواں ہے عقل کا سکہ وہاں | عقل خود حیراں ہے اپنی یہ حکومت دیکھکر
ریل ہے زیرِ زمیں طیارے اوپر صرف طیر | اور موجودات نامحسوس ہیں پیغامبر
بچہ بچہ صرفِ تحقیقات رازِ کائنات | نوجواں کیسی جواں ہمت ہیں بوڑھے بیشتر
صنعت و حرفت تجارت میں ہے سب پر انکا فروغ | جس سے انکے تابع فرماں ہے سارا بحر و بر
ملک و قوم انکو ہیں اپنی جان سے زائد عزیز | طاق تدبیر و سیاست میں ہے ہر فرد بشر
ناخنِ تدبیر سے کرتے ہیں عقدے یوں وہ حل | بے لڑے اُڑتا ہے ان کا پرچم فتح و ظفر
عقل خیرہ کن ہے ہر تنظیم اُن کی بیگماں | جس سے استحکام ہے مضبوط سے مضبوط تر
خود بنایا ہے جو قانون انکو وہ پابند ہیں | فرض کی تکمیل پر ہر لحظہ رہتی ہے نظر
رشک کے قابل ہیں انکی باہمی ہمدردیاں | سارے عالم پر تفوق جسکا ہے شیریں ثمر
تو بھی طے کر ارتقاء زندگی کی منزلیں | کون کہتا ہے کہ مغرب سے نہ ہو تو بہرہ ور

رنگ و روغن ہیں مگر یہ ایک رُخ تحریر کے
ہیں حقیقی خال و خد کچھ اور ہی تصویر کے

تجھکو دنیا میں جو رہنا ہے تو اپنی فکر کر | مغرب گم کردہ رہ ہے تیرے حق میں راہبر
آہ وہ تہذیب مغرب جاذبِ نورِ بصر | درپئے تخریب عالم ہے اس کا شور و شر
مٹ گیا مغرب کے ہاتھوں امن عالم مٹ گیا | چڑیا نوچن میں پھنسا ہے شرق بے بال و پر
نام لیکر امن کا چلتا ہے وہ وہ چال یہ | دم بخود ہے شاطر دوراں بھی جسکو دیکھکر
صفحۂ ہستی کہیں ہے بزمگاہ نائے و نوش | گہ بساطِ سیلِ خون و رزمگاہ پرخطر
فطرتِ آزاد ہے قیدِ ہوس میں جاں بلب | ٹھوکریں کھاتی پھرا کرتی ہے غیرت دربدر
سیرتِ زیبا کے رخ پر زلفِ شبگوں کی طرح | معصیت کی تیرگی چھائی ہوئی ہے سربسر
دامنِ عصمت پہ ہیں لاکھوں حیاسوزی کے داغ | بیحسی ان کو گل و نسرین سمجھتی ہے مگر
ذوقِ عریانی کا دامن دامنِ تہذیب سے | رل گیا اور رل کے ہے وسعت پذیر بحر و بر

مجلسیں ننگوں کی قائم ہو رہی ہیں جا بجا — مرد و زن میں ہے مساوات عمل یکدگر

یہ کرشمے نور حق سے دلکی عریانی کے ہیں — ایسے ننگوں سے حذر یار و حذر یار و حذر

دیکھ او آزادی نسواں کے حامی دیکھ تو — دل میں غیرت آنکھ میں شرم و حیا ہے کچھ اگر

کیا اسی آزادی نسواں کا دلدادہ ہے تو — فطرت معصوم شرماتی ہے جس کو دیکھ کر

یہ بتان سیمتن ننگ مس معیوب ہیں — یہ وہ جنت میں بھری ہے آگ جس میں سربسر

دین و مذہب سے تعلق کچھ نہ عقبیٰ سے غرض — مغربی تہذیب کا مفہوم یہ ہے مختصر

سوز ہے دلمیں نہ جسکے نے پتہ ہے ساز کا
واہ کیا کہنا ہے مغرب کے بت طناز کا

مشرق و مغرب پہ پہلے ڈال جا غائر نظر — غور کر او ابن آدم دلمیں پھر خود غور کر

حسرت آگیں گو کہ ہیں مشرق کے آثار قدیم — راز تیری عظمتوں کا ہے انہی میں مستتر

خاصکر عبرت سے دیکھیے مسلم خستہ نصیب — تابع فرمان تھا کل تک جسکی سارا بحر و بر

ہے یہی مشرق جو مرکز تھا کبھی تہذیب کا — تھا یہی مشرق کبھی گہوارۂ علم و ہنر

مطلع مہر تمدن تھا افق مشرق ہی کا — جسکی کرنوں سے تھا روشن سارا عالم سربسر

صنعت و حرفت تجارت جدت و ندرت تمام — ہیں اسی مشرق کے تہذیب و تمدن کے ثمر

غیرت و عزت شجاعت اتحاد ملک و قوم — کھیلتے تھے گود میں مشرق کی ہر شام و سحر

آج تک زندہ مثالیں اس رواداری کی ہیں — مٹ نہیں سکتا دلوں سے جسکا سکہ عمر بھر

ایک مغرب ہے کہ خلق انگشت حیرت در دہاں — ایک مشرق ہے کہ اپنے عاشق شوریدہ سر

عرش سے اونچا ہے جسکا پایۂ فضل و کمال — تجھ کو وہ روحانیت مشرق میں آئیگی نظر

جلوۂ نور الٰہی سرزمین قدس میں — برق آسا آج بھی کرتا ہے دل پر وہ اثر

ز عرفاں کی تجلی سے ہر اک پر شوق دل — کھا کے غش گرنے کو بیہم دوڑتا ہے تیز تر

سیکڑوں آثار عبرت اپنے دامن میں لئے — گوشہ گوشہ شرق کا ہے آج لیکن نوحہ گر

آہ وہ تہذیب مشرق کا درخشاں آفتاب ڈوبتا ہی جائے مغرب میں الٰہی خیر کر

جو بیاں بھی ہیں کچھ اس میں اسلئے آباد ہی
ورنہ مغرب درحقیقت جنت شداد ہی

او بشر او مشرقی او مسلم تفتہ جگر — یعنی او ہر فرد انسان نوح و آدم کے پسر
آ ادھر آ گر سکون و امن کی ہے جستجو — تجھ کو مل جائیگا وہ سب کچھ جو ہی پیش نظر
مطلع انوار ایمان منبع صدق و صفا — دین حق اسلام یعنی مامن نوع بشر
ذرہ ذرہ میں عیاں ہی کائنات دہر کے — جسکے علم و فضل و تہذیب و تمدن کا اثر
جسکے [illegible] سے [illegible] یا ز رنگ [illegible] — اک [illegible] لم سے کیا عالم کو جس نے باخبر
امن عالم اپنے دامن میں لئے [illegible] ہوئے — سایۂ رحمت میں لینے کیلئے رحمت کے پر
پھ[illegible] ماہی تجھے اپنی طرف لبیک کہہ — سو صدائیں ہیں طلب کی تیری اک لبیک پر
ہی ازل سے فطرت اسلام گہوارہ ترا — ظلم اپنی ذات پر کرتا ہی کیوں بیداد گر
کئے کیسی لباس فقر میں شاہنشہی — دل کے معمورہ میں تھی توحید جنکے جلوہ گر
خوشہ چیں ہی سارا مغرب خود اسی تعلیم کا — پر زمین شور میں پھل ہوگیا ہے تلخ تر
حکمتیں چن چن کے لیلے مادیت چھوڑ دے — ہے یہی بس نسخۂ خذ ما صفا دع ما کدر
جس سے دنیا آخرت دونوں سنور جائیں تری — او بشر او آدمی وہ کام کر وہ کام کر
آسماں تک کر ترقی اپنے خالق کو نہ بھول — راز رفعت عبدیت ہی میں ہی مضمر بیخبر
کیا کہے تجھسے ذبیح حق پرست اسکے سوا — دونوں عالم تیرے ہیں اتنا ہو گر پیش نظر

کب ہی دنیا اب ہی کیا اور کیا سی کیا ہو جائیگی
مختصر یہ ہے کہ یہ اک دن فنا ہو جائیگی